تاریخ اور فلسفۂ تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

نام کتاب	تاریخ اور فلسفہ تاریخ
پبلشرز	فکشن ہاؤس
	18 مزنگ روڈ لاہور فون 237430
پرنٹرز	زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
کمپیوٹر کمپوزنگ	ا۔ لیکو گرافکس، شادمان لاہور۔ 481819
سرورق	ریاظ
اشاعت اول	1993ء
قیمت	150 روپے

انتساب

جناب پروفیسر تفصل داؤد صاحب
(سٹی کالج حیدر آباد سندھ)

اور

جناب پروفیسر احمد بشیر صاحب
(سندھ یونیورسٹی)

میں یہ کتاب بصد احترام اپنے ان دو اساتذہ کے
نام انتساب کرتا ہوں کہ جنہوں نے مجھ میں
تاریخ کا شوق پیدا کیا۔

فہرست

پیش لفظ 7

تعارف 9

تاریخ کیا ہے؟

1- تاریخ اور ماضی 13
2- تاریخی واقعات 17
3- تاریخ کیا ہے 19
4- فلسفہ تاریخ 21
5- فرد اور عوام 26
6- تاریخ اور فطرت 30
7- ماحول اور آب و ہوا 33
8- تاریخ کے دو پہلو 35
9- ہم تاریخ سے کیا سیکھتے ہیں 39
10- کیا تاریخ حقیقت تک پہنچاتی ہے 41
1- تاریخ اور مورخ 44
12- تاثرات 48
13- اختتامیہ 54
14- حوالہ جات 55

تاریخ اور فلسفہ تاریخ

1- تاریخ اور فلسفہ تاریخ 57
2- تاریخ میں گردش کا نظریہ 67
3- تاریخ کا مذہبی نظریہ 75
4- تاریخ میں ترقی کا نظریہ 79

-5	تاریخ کا مادی نظریہ	83
-6	تاریخ میں تبدیلی اور ترقی	87
-7	تاریخ میں فرد کا کردار	92
-8	تاریخ اور ادوار	97
-9	تحریری اور زبانی تاریخ	99
-10	تاریخ کے نقصان اور فائدے	101
-11	تاریخ اور عوام	104

تاریخ کے نظریات

-1	ابن خلدون	110
-2	ویچو	120
-3	کانٹ	126
-4	ہرڈر	133
-5	ہیگل	139
-6	مارکس	145
-7	بورک ہارڈٹ	151
-8	وینی لوسکی	168
-9	اشپینگلر	172
-10	کولنگ وڈ	183
-11	رینائر	196
-12	ای ایچ ڈانس	203
-13	کروچے	211
-14	ٹائن بی	216
-15	ول ڈیورانٹ	223
-16	برٹنڈرسل	239
-17	سوروئے کن	246
-18	اشپینگلر اور ٹائن بی	254

پیش لفظ

تاریخ اور فلسفہ تاریخ پر میرے یہ مضامین تین کتابوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ یعنی تاریخ کیا ہے؟ تاریخ اور روشنی' اور تاریخ کے نظریات' ان مضامین کو اس لیے یکجا کیا کہ یہ ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔ اور ایک جگہ پڑھنے سے (اگرچہ بعض جگہ کچھ باتیں دہرائی ہوئی ملیں گی) تاریخ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ایک چیز کا ذکر میں خاص طور سے کرنا چاہتا ہوں' کہ میری اولین کتاب تاریخ کیا ہے؟ تھی۔ اس وقت تک میرا یہ خیال تھا کہ انسان تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتا ہے' کیونکہ جن غلطیوں کو وہ بار بار دہراتا ہے وہ اس بات کی تصدیق ہے' مگر جب تاریخ کا اور مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان تاریخ سے ضرور سیکھتا ہے اور اس میں تاریخ کے ذریعہ آگہی و شعور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اس کو اپنی زندگی میں استعمال بھی کرتا ہے' یہ بات ضرور صحیح ہے کہ جو تاریخ سے ناواقف ہوتے ہیں' وہ غلطیوں کو بار بار دہراتے ہیں۔

اس لیے ضروری یہ ہے کہ تاریخ کو سچائی کے ساتھ پڑھا جائے' کیونکہ اگر اس کو مسخ کرکے اور اپنی مرضی کے مطابق پڑھا جائے گا' تو وہ غلط راستہ پر ہی لے جائے گی' اور اس کے نتیجہ میں انھیں غلطیوں کو دہرایا جائے گا۔ تنقیدی و تجزیاتی تاریخ' جو کمزوریوں سے پردہ اٹھائے' وہ صحیح راستہ متعین کرنے میں مدد دے گی۔ اس لیے یہ کہنا کہ تاریخ سے انسان کچھ نہیں سیکھتا' غلط ہے۔ انسان جب ہی تاریخ سے سیکھتا ہے کہ جب تاریخ کو سچائی کے ساتھ لکھا جائے۔

اس کی مثال ہماری تاریخ سے دی جاسکتی ہے کہ جسے یک طرفہ ہاتھ سے' ایک ہی نظریہ کے تحت لکھا جارہا ہے اور اس میں کوئی تنقیدی اور تجزیاتی عنصر نہیں ہے' ہمارے تمام راہنما غلطیوں سے پاک و مبرا تھے' ظاہر ہے کہ تاریخ تو لوگوں کو سکھانے کے بجائے گمراہ کرے گی۔

یہ کتاب طالب علموں کے لیے بھی ہے' اور عام قارئین کے لیے بھی' یہ دانشوروں کے لیے نہیں کہ وہ پہلے سے سب کچھ جانتے ہیں اور میری کوئی خواہش نہیں کہ ان کے علم میں اضافہ کروں۔ میں اپنے دوستوں اور پڑھنے والوں کا مشکور ہوں کہ وہ مجھے اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔

آخر میں، میں "فکشن ہاؤس" کے ظہور احمد خان صاحب اور رانا عبدالرحمان صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ کتاب شائع کرنے کی ذمہ داری لی۔

ڈاکٹر مبارک علی

اکتوبر 1992ء لاہور

تعارف

تاریخ کیا ہے؟ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ ماضی میں انسان کی سرگرمیوں کی داستان' لیکن یہ داستان بکھری ہوئی اور بے ترتیب ہے اور مورخ اس داستان کو سلسلہ وار بنا کر اور واقعات کو ایک دوسرے سے ملا کر اس میں مفہوم پیدا کرتا ہے۔ اس مرحلہ پر ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماضی میں انسان نے جو کچھ کیا' کیا اس کا یہ عمل کسی منصوبہ کا پابند تھا۔ وہ کسی نظام اور قانون کے تحت تھا یا اس کا عمل محض بے ترتیبی' انتشار اور کسی مقصد کے بغیر تھا؟

اس سوال پر آکر مفکرین اختلاف رائے کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان میں سے ایک جماعت کا استدلال ہے کہ انسانی عمل کے پس منظر میں ایک منصوبہ اور مقصد پنہاں رہا ہے اور اس کے عمل کو قوانین کے ذریعہ متحرک رکھا گیا ہے۔ ہیگل نے اس بات کی وضاحت اس طرح کی تاریخی عمل کے پیچھے ایک منصوبہ ہوتا ہے اور اس عمل کو کرنے والے بھی اس سے ناواقف ہوتے ہیں' فطرت محض ان سے اپنے مقاصد کی تکمیل کراتی ہے اور جب اس کے مقاصد پورے ہوجاتے ہیں تو اس کے یہ ایجنٹ بھی اپنی توانائی و قوت کھو کر ختم ہوجاتے ہیں۔ ویچو کے نزدیک یہ خدایا کوئی پراسرار طاقت نہیں جو تاریخی عمل کو جاری رکھے ہوئے ہے بلکہ اس کا خالق خود انسان ہے جو اپنی تاریخ کو خود بناتا ہے۔

ان مفکرین نے جو کہ تاریخ میں کسی منصوبہ اور مقصد کا تعین کرتے ہیں انہوں نے تاریخ کو وسیع تناظر میں دیکھا ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کی وسعت بہت زیادہ ہے اس لیے صرف کسی ایک عہد اور زمانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد تاریخی عمل اور اس کے قوانین کو متعین نہیں کیا جاسکتا ہے اس لیے مکمل انسانی تاریخ کا مطالعہ اس کی وضاحت کرے گا کہ انسان کون سے قوانین کے تابع ہے اور وہ کسی منصوبہ کی تکمیل کے لیے جدوجہد کررہا ہے۔ لہٰذا جن مفکرین نے تاریخ کو ان معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی ان میں ویچو' ہرڈر' ہیگل' کومے' مارکس' بکل' اشپینگلر اور ٹائن بی اور سوروکن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

تاریخ میں ان مفکرین نے پانچ قسم کے نظاموں کی نشان دہی کی ہے' جن میں ایک گردش (CYCLE) کا نظریہ ہے کہ انسانی تاریخ ایک دائرہ میں محو گردش رہتی ہے۔ اس سے انسان کی مجبوری اور لاچاری ظاہر ہوتی ہے کہ وہ جبر کی حالت میں ایک نپے تلے راستہ

پر چلتا رہتا ہے۔ اس لیے اس کے رد عمل میں ترقی کا نظریہ پیدا ہوا کہ انسانی کسی ایک چکر میں محو گردش نہیں بلکہ وہ برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے اور اس کی یہ ترقی بغیر کسی رکاوٹ اور دشواری کے ہے اور تاریخ کا ہر دور اس کی ترقی کا دور ہوتا ہے اور انسان مسلسل آگے کی جانب جارہا ہے۔ تیسرے نظریہ میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ انسان نے ماضی میں کائنات کی تکمیل کرلی ہے اور اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہورہا ہے۔ وہ اس تکمیل میں اضافہ نہیں۔ اس نظریہ کو خصوصیت سے بڑے مذہبوں کے پیروکاروں کی حمایت حاصل ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے مذہب نے اپنے ابتدائی دور میں جو مثالی معاشرہ قائم کیا تھا اس نے انسانی تاریخ کو مکمل کردیا اور اب اس میں مزید کسی اضافے کی گنجائش نہیں۔ اس وجہ سے احیاء کی تحریکیں ان مذاہب کی تاریخ کا ایک اہم پہلو ہیں۔ جو تاریخ میں واپسی کے نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں اور ماضی میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ چوتھے نظریہ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ چونکہ انسانی فطرت نہ بدلنے والی اور غیر تغیر پذیر اور ہمیشہ ایک سی رہنے والی ہے۔ لٰہذا انسانی عمل ہر زمانہ اور عہد میں یکساں ہوتا ہے اور تاریخ میں ایک جیسے واقعات برابر دہرائے جاتے رہتے ہیں۔ پانچویں نظریہ کے مطابق یہ دنیا روبزوال ہے۔ زوال کو مذہبی اور مادی دونوں اعتبار سے دیکھا جاتا ہے۔ مذہبی عقائد کی رو سے دنیا کے ختم ہونے اور قیامت کا ایک دن معین ہے اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اس کا معین وقت بھی قریب آرہا ہے اس طرح وہ برابر اپنے خاتمہ کی جانب بڑھ رہی ہے۔ مادی اعتبار سے زوال کی تشریح اس طرح سے کی جاتی ہے کہ انسان فطرت کے ذرائع کو بری طرح استعمال کررہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں فطرت کی توانائی ختم ہورہی ہے اور ماحولیات میں تبدیلی آرہی ہے لٰہذا ایک وقت وہ آئے گا کہ جب فطرت کے پاس انسان کو دینے کے لیے کچھ نہیں رہ جائے گا اور یہ دنیا تباہ ہوجائے گی۔

اس کے برعکس مفکرین کی ایک جماعت اس سے اختلاف کرتی ہے کہ تاریخ کا عمل کسی منصوبہ' نظام اور مقصد کے تحت ہوتا ہے یا اس عمل کے پس منظر میں کوئی قوانین ہوتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ مورخ کا کام یہ ہے کہ یہ بتائے کہ ماضی میں کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ کیونکہ جب تاریخی حقائق و واقعات کو قوانین بنا دیا جائے گا تو تاریخ ختم ہوجائے گی۔ کارل پوپر کہتا ہے کہ تاریخی عمل میں انسانی رجحانات کا ضرور پتہ چلتا ہے مگر ان رجحانات کو قانون کہنا صحیح نہیں اس طرح دوسرے مفکرین کے نزدیک تاریخ میں چانس

اور حادثہ کے جو عناصر ہیں۔ اس سے اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ تاریخ میں کوئی قانون ہے اور تاریخ کسی ایک مخصوص راستہ پر نہیں جارہی ہے۔ اس نقطہ نظر کو ڈل تھے، جارج سی من، ہائن رش ریکرٹ اور کروشے نے پیش کیا۔

جو مفکرین تاریخ میں قوانین اور منصوبوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس ذریعہ سے تاریخ عمل اور اس کی راہ متعین کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں حال اور مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک تاریخ کی افادیت ہے کہ جس کا مطالعہ اور جس کا شعور انسان کو مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مگر جو مفکرین تاریخ میں قوانین کے منکر ہیں وہ اس سے انکاری ہیں کہ تاریخ کے ذریعہ مستقبل کی پیشن گوئی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں تاریخ کی افادیت نہیں۔

اول الذکر مفکرین یہ کہتے ہیں کہ انسان ماضی کے تجربات کی روشنی میں سیکھتا ہے۔ کیونکہ تاریخ ماضی کو معروضی طور پر پیش کرتی ہے۔ جب کہ دوسری جماعت کے مفکرین اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسانی تجربات بڑے مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان کی بنیاد پر کوئی قوانین نہیں بنائے جاسکتے ہیں۔

کچھ مفکرین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ تاریخ میں مختلف تجربات کی روشنی میں انفرادی عمل اور کردار کو دیکھا جائے اور عمومی رجحانات کو نظر انداز کردیا جائے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر تاریخ سے عمومی رجحانات کو خارج کردیا جائے تو پھر تاریخ کے مطالعہ سے کوئی نتائج نہیں نکالے جاسکیں گے اور اس صورت میں تاریخ کی افادیت ختم ہوجائے گی اور اس کی حیثیت محض اس قدر رہ جائے گی کہ یہ واقعات کے جاننے کا ایک ذریعہ ہوگی۔ تاریخ کا یہ نقطہ نظر مورخ کو لوگوں سے دور کردے گا اور وہ محض کتابوں اور دستاویزات کی مدد سے واقعات کو تو جمع کردیں گے مگر انسان کے جذبات و احساسات سے ناواقف رہیں گے اسی طرح جو لوگ وجدان کے ذریعہ تاریخی عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی تاریخ کی سماجی، معاشی اور سیاسی قوتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔

تاریخ کے عمل کو سمجھنے کے لیے انیسویں صدی کے آخر میں تاریخیت کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ابتداء میں اس بات پر زور دیا گیا کہ انسانی تاریخ اور انسان کے عمل کو قانون اور معیشت کے ذریعہ سے بہتر طریقہ پر سمجھا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی میں اس کے ذریعہ انسانی افکار و نظریات اور انسانی اداروں کی تبدیلی کا مطالعہ کیا گیا، مگر تاریخ کے اس

تجزیہ میں عمومی رجحانات کو نظرانداز کرکے انفرادی پہلوؤں پر زور دیا۔

جرمنی کے دو مشہور مورخ ٹروئل ٹش اور مائی نیک کے مطابق انسان کے تاریخی عمل کو دنیا کے وسیع تناظر میں سمجھا جائے۔ لیکن وہ تاریخ میں کسی منضبط نظام کے قائل نہیں' ان کا استدلال یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اسے بطور مظاہر کے تسلیم کیا جائے کہ جس کے ذریعہ انسانی خواہشات و جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ تاریخ میں ان کے نزدیک کوئی قوانین نہیں تاریخ کا کام محض یہ ہے کہ اس کی مدد سے انسانی ذہن اور ماضی کے واقعات کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ ماضی اور حال دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ماضی کو حال کے پیمانہ سے نہیں ناپا جاسکتا ہے۔ ہر نظریہ اور ادارہ اپنی جگہ آزاد اور خود مختار ہوتا ہے اس لیے اسے کسی دوسرے سے ملانا نہیں چاہیے۔

پہلی جنگ کے بعد تھیوڈر لے سنگ نے تاریخ کو بے مقصد ثابت کیا اور کہا کہ تاریخی تحریروں کے ذریعہ محض فرضی واقعات کی تشکیل کی جاتی ہے۔ کارل بے کر' چارلس بیرڈ اور کارل پوپر نے بھی تاریخ کو موضوعی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ محض انسانی عمل کا مشاہدہ کرتی ہے اس لیے تاریخ کبھی علم سائنس کا درجہ حاصل نہیں کرسکتی۔

وہ مفکرین جو تاریخ کے عمل میں بے ترتیبی اور لامقصدیت کے قائل ہیں وہ اپنے نظریات کے ذریعہ موجودہ استحصالی نظام کو قوت بخش رہے ہیں کیونکہ اس صورت میں جو کچھ ہورہا ہے وہ ٹھیک ہے اور تاریخ کے بے مقصد ہونے کے بعد اس نظام کو تبدیل کرنے یا اس کے خلاف احتجاج کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس میں انسان مجبور محض ہے اور حالات کے آگے لاچار۔

لیکن جب تاریخ میں کوئی مقصد پیدا ہوجائے اور تاریخی عمل کے قوانین متعین ہوجائیں تو ان کے ذریعے انسان دنیا کو تبدیل کرسکتا ہے کیونکہ تاریخ کے مطالعہ کے بعد ان میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ محض واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ ان واقعات کی گہرائی میں ایک منصوبہ ہے اور ان کے پس منظر میں قوانین ہیں جو دنیا کو برابر تبدیل کررہے ہیں۔

تاریخ اور ماضی

انسان کے لیے تاریخ کا مطالعہ ہمیشہ سے دلچسپی کا باعث رہا ہے کیونکہ یہ نہ صرف اس کے ذہن کو آسودگی بخشتا ہے بلکہ اسے تخیل کی مدد سے ماضی کے دور دراز علاقوں میں لے جا کر ان انسانی معاشروں اور تہذیبوں کی سیر بھی کراتا ہے جو مرور ایام سے کب کے ناپید ہو چکے ہیں۔

انسان کو اپنا ماضی جاننے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے' جس طرح ہم اپنے خاندان کے بارے میں معلومات فراہم کر کے خوشی و تسکین محسوس کرتے ہیں اسی طرح اجتماعی طور پر قدیم معاشروں اور تہذیبوں کی کہانیاں ہمیں ذہنی مسرت عطا کرتی ہیں جب ہم اپنے خاندان کے بارے میں معلومات کرتے ہیں تو اس کی ابتداء حال سے ماضی کی طرف ہوتی ہے یعنی پہلے ہم اپنے باپ' پھر دادا اور پھر جد امجد اور اسی طرح زینہ بہ زینہ وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ہماری تحقیق لے جاتی ہے لیکن معاشروں کی تاریخ میں ہم ماضی سے حال کی جانب آتے ہیں اس لیے انسان اپنی تاریخ معاشروں کی تاریخ کی تعمیر میں ماضی سے اپنا رشتہ قائم کرتا ہے اور اس پوائنٹ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جہاں سے اس کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

ہر دور کے انسان کو ماضی سے دلچسپی رہی ہے اور اس کا ذہن بار بار اسے ماضی کی سنہری اور خوبصورت یادوں کی جانب لے جاتا ہے۔ ماضی کا تصور حال کے لیے بڑا خوبصورت' رنگین' دل آویز اور خوش کن ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انسان حال کے مسائل سے گھبرا کر' ماضی کے انجانے میں پناہ لینا چاہتا ہو۔ جہاں ناواقفیت اور تاریکی نے ہر شے کو چھپا رکھا ہے اور اسی لیے ماضی کی برائیاں اور اس کے مسائل ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہی ناواقفیت بار بار انسان کو ماضی کی آغوش میں پناہ لینے پر اکساتی ہے۔ وہ بار بار حال کے مسائل سے گھبرا کر قدامت پسندی' قدیم نظریات روایات اور نظام زندگی کے احیاء کی کوشش کرتا ہے' احیا کی تحریکوں کی ناکامی کے باوجود اس کے ذہن سے ماضی کی خوشگوار یادیں نہیں مٹتی ہیں۔ ماضی کی طرف واپسی کا نعرہ ہمیشہ رومان پرور اور حسین رہا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیوں بار بار پیچھے کی جانب لوٹنا چاہتا ہے؟ کیوں وہ عمر رفتہ کو آواز دینا چاہتا ہے؟ اور کیوں لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام کی تکرار کرتا

ہے؟

شاید اس لیے کہ اجتماعی طور پر انسان کو اپنے ماضی سے اسی طرح دلچسپی ہوتی ہے جیسے ایک بوڑھے کو اپنے بچپن اور جوانی سے' جس طرح بار بار وہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی ابتدائی زندگی کے خوش گوار یا اداس ایام کی یادوں میں کھو جاتا ہے وہی حال انسان کا بحیثیت مجموعی ہے کہ وہ اپنے عہد اور زمانے سے مطمئن نہیں ہوتا ہے وہ کبھی مستقبل کے یوٹو پیائی تصور میں پناہ لے کر اپنے مسائل کا حل ڈھونڈتا ہے تو کبھی ماضی کی پناہ گاہوں میں روپوش ہوکر اپنے عہد کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔ ہر نسل اپنے عہد سے پریشان اور فکر زدہ ہوتی ہے اور یہی پریشانی و فکر اسے ماضی میں سکون و راحت دیتی ہے۔ کیونکہ ہر جانے والی نسل ماضی کی خوشگوار یادیں وراثت میں چھوڑ کر جاتی ہے اور ہم اپنے عہد کی کمی کو ماضی کی ان یادوں سے پورا کرتے ہیں۔ لیکن کیا ماضی پر یہ اعتقاد و بھروسہ معاشرے کے لیے سود مند ہے یا نقصان دہ؟ گوئٹے نے ایک جگہ کہا ہے کہ ہم سب ماضی کے سہارے زندہ رہتے ہیں اور اسی ماضی کی وجہ سے تباہ ہوتے ہیں۔

خصوصیت کے ساتھ وہ معاشرے جو زوال کی حالت میں ہوں ان کا ماضی سے تعلق بہت بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے زوال' پسماندگی اور غربت افلاس کو ماضی کی شان و شوکت میں فراموش کرنا چاہتے ہیں۔ ان معاشروں میں ماضی کی عظمت کی پوجا کی جاتی ہے۔ وہ ماضی کی یادوں میں ایسے گم ہوتے ہیں کہ حال کے مسائل اور مستقبل کے خوف سے بالکل بیگانہ ہوجاتے ہیں یہ ایسا زہر ہے کہ جو ذہن و دماغ کو بالکل ماؤف کردیتا ہے اور ان کی تنقیدی د تجزیاتی فکر کو ختم کرکے انہیں مزید تحت الثریٰ میں دھکیل دیتا ہے۔

انسان کو ماضی کی شان و شوکت میں الجھانے کی ذمہ داری مورخوں پر بھی آتی ہے جو ماضی کی دولت' طاقت اور بڑائی کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً" جب ہم مغل تاریخ کو پڑھتے ہیں تو اس میں مغل بادشاہوں کی زندگی' اور ان کے دربار کے متعلق جو کچھ بتایا جاتا ہے اس میں دولت کی فراوانی' شہروں کی ہما ہمی تجارتی سرگرمیاں' موسیقی د راگ و رنگ کی محفلیں' لباس و طعام کی تفصیلات اور زندگی کی آسائش کے وہ واقعات ہوتے ہیں جو ہمارے ذہن کو مرعوب کردیتے ہیں لیکن مورخ اس موقع پر تاریخ کا صرف ایک رخ پیش کرتا ہے وہ کسانوں کی غربت اور عوام کے افلاس سے چشم پوشی کرتا ہے۔ قحط اور فاقہ زدگی سے اپنی تاریخ کے صفحات کو غم آلود نہیں کرنا چاہتا اس لیے ہماری تاریخ میں عہد

مغلیہ' بڑائی و عظمت اور خوش حالی کی علامت ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان' معاشی و سماجی لحاظ سے اس عہد میں جس بلندی پر تھا وہاں ہم آج نہیں ہیں۔

ماضی کے بارے میں ہماری یہ ادھوری اور یک رخی معلومات ہیں جو ہمیں برابر ماضی کی عظمت کی یاد دلاتی رہتی ہیں اور ہمارے اپنے عہد سے ہمیں متنفر کرتی رہتی ہیں اور یہی ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتی ہیں کہ ہمارا ماضی ہمارے حال سے زیادہ شاندار اور پر مسرت تھا یہ تصور محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ماضی کے بارے میں ہماری معلومات مکمل اور پوری نہیں ہیں۔ ہم ماضی کے آثار دیکھ کر زمین میں مدفون قدیم اشیاء کو دریافت کر کے قدیم آبادیوں کے عظیم کھنڈروں کو دیکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ شاید ماضی کا انسان ہم سے زیادہ پر مسرت زندگی گزارتا تھا لیکن کیا حقیقت میں ایسا تھا؟ اس سوال کا جواب جب ہم تاریخ کی مدد سے تلاش کرتے ہیں تو تاریخ ہمیں کوئی مثبت جواب دینے میں کامیاب نہیں ہوتی' ہمارے پاس کوئی ایسے دلائل و شواہد نہیں کہ جن کی بنیاد پر ہم یہ فیصلہ صادر کر سکیں کہ ماضی کا انسان ہم سے زیادہ خوش قسمت اور مطمئن تھا۔

اگرچہ ہم نے تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو ایک دوسرے سے ملا لیا ہے۔ بہت سی خالی جگہوں کو تحقیق کے ذریعے پر کر لیا ہے' بہت سی انسانی تہذیبوں کے آثاروں کو دریافت کر لیا ہے لیکن اس کے باوجود ماضی کے بارے میں ہماری معلومات تشنہ ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کتنے آثار اب تک زمین میں مدفون ہیں اور ہم ان کو پانے میں ناکام رہے ہیں اور کتنے آثار زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو چکے ہیں کہ جن تک رسائی اب ناممکن ہو چکی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کا یہ سرمایہ جس پر ہماری ماضی کی معلومات کا انحصار ہے انتہائی قلیل اور ناکافی ہیں اور اس لیے یہ ہمیں ماضی کے بارے میں پوری معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری تاریخی معلومات' اور تاریخی مفروضے نئے آثاروں کی دریافت اور نئے مسودوں کی اشاعت سے بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے جدید عہد کے بھرپور وسائل کے باوجود انسانی تاریخ مکمل نہیں' اس کی تعمیر و ترتیب ابھی تک جاری ہے اور کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مکمل ہو سکے گی یا نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ماضی ہمارے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھتی ہے اس لیے ماضی کی یادداشتیں' آثار و عمارتیں' نوادرات' اشیا اور نظریات و افکار تمدن کے تسلسل کے ضروری ہیں۔ اس لیے انسان تاریخی عمارتوں کو محفوظ رکھتا ہے اور قدیم نوادرات کو میوزیم میں سجا

کر رکھتا ہے کہ ان کو دیکھ کر اسے انسانی تمدن کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تاریخ گم ہوجائے تو خود کو بے سہارا اور تنہا محسوس کرتی ہے اس لیے ہر قوم کی کوشش ہوتی ہے کہ ماضی میں پیچھے سے پیچھے جاکر اپنی جڑیں تلاش کرے جس قوم کی جتنی قدیم تاریخ ہوتی ہے اتنا ہی وہ اس کے لیے فخر و مباہات کا موجب ہوتی ہے اگر انسان ماضی سے کٹ جائے تو وہ جاہل ہوجائے گا کیونکہ ہر علم کی اپنی تاریخ ہے۔ طب' حیاتیات اور کیمیا وغیرہ۔ اس لیے انسان کے لیے ماضی ضروری ہے۔ اور یہ تاریخ کا کام ہے کہ وہ اس ماضی کو محفوظ رکھتی ہے لیکن یہ ماضی سچا' حقیقی اور مبالغہ سے پاک ہونا چاہئے کہ جس میں ہم اپنی صحیح تصویر دیکھ سکیں اور جس کی روشنی میں ہم اپنی راہوں کو صحیح خطوط پر متعین کرسکیں۔

تاریخی واقعات

ہمارا تاریخی سرمایہ اپنی کم مائیگی کی شکایت کرتا نظر آتا ہے کیونکہ اس میں ماضی کا ہونے والا ہر واقعہ نہیں' کونسے واقعات اہم اور تاریخ ساز ہیں؟ اس کا انحصار مورخ کی مرضی پر ہوتا ہے۔ ہم تاریخ میں ان ہی واقعات کو پڑھنے کے عادی ہیں جو سنسنی خیز اور ڈرامہ پیدا کرتے ہیں ان میں خونریز جنگیں شجاعت و بہادری کے کارنامے' جرائم ایذائیں اور عیاشی کی تفصیلات ہیں دیکھا گیا ہے کہ جنگوں' قحطوں اور سنسنی خیز واقعات کو تاریخ ساز واقعات کہہ کر ان کی اہمیت کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جنگیں' انقلابات' سازشیں اور بغاوتیں جو اثرات پیدا کرتی ہیں اسے ہر شخص محسوس کرتا ہے اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی واقعات تاریخ ساز اور تاریخ کے دھارے کو موڑنے والے ہیں۔ اس لیے مورخ عام طور سے ایسے واقعات اور حقائق سے آنکھیں بند کرلیتا ہے یا ان کی اہمیت کو کم کرکے پیش کرتا ہے جنہوں نے ذہنی طور پر معاشرے کو خاموشی سے متاثر کیا اور خاموشی سے معاشرے اور تہذیب و تمدن میں تبدیلی لائے ہم نظریات و افکار اور خیالات کی خاموش رو کو جو سمندر کی تہہ میں اندر اندر بہتی ہے نظر انداز کرکے صرف طوفانوں کی قیامت خیز تباہی کو دیکھتے ہیں۔ یقیناً" یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ کون سے واقعات تاریخی ہوتے ہیں؟ یقیناً" اس واقعہ کی اہمیت ہوتی ہے جس کے معاشرے پر سیاسی و سماجی' معاشی اثرات مرتب ہوں مثلاً" اگر شاہ جہاں بیمار ہوا اور بیماری کی وجہ سے وہ جھروکہ درشن کے لیے نہیں آسکا تو اس بیماری کی اہمیت ہے ورنہ نہیں' کیونکہ بصورت دیگر بیماری ایک فطری عمل ہے جو بغیر کسی تاریخی نتیجہ کے ہزار ہا انسانوں کو ہوتی رہتی ہے۔"

(1)

تاریخ میں حادثاتی واقعات کی بھی اہمیت رہی ہے۔ ان حادثات کی وجہ سے تاریخ میں جو غیر معمولی تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اور بعض اوقات یہ تبدیلیاں تاریخ ساز اور انقلاب انگیز ہوتی ہیں اور تاریخ کے موڑ میں حیرت ناک حد تک تبدیلی لے آتی ہیں مثلاً" پانی پت کی دوسری جنگ میں ہمو کی فتح ہونے کو تھی کہ اچانک اس کی آنکھ میں تیر لگا جس نے پوری جنگ کا نقشہ بدل دیا اور اکبر کو فتح ہوگئی۔ پانی پت کی یہی فتح' مغل سلطنت کے دوبارہ استحکام کی بنیاد بنی یا واٹرلو کی جنگ میں نپولین کے پیٹ میں درد اٹھا اور اسے ناکامی

ہوئی۔ اس قسم کے واقعات تاریخ کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں اور مورخ اگر ان حادثات کی وجہ معلوم کرتا ہے تو اس کے پاس ایسے کوئی دلائل و شواہد نہیں کہ جس کا وہ جواب دے سکے۔ یہ حادثات ایک شخص کے ساتھ کیوں پیش آتے ہیں؟ دوسرا ان سے کیوں محفوظ رہتا ہے؟ مذہبی نقطہ نظر سے یہ سب قدرت کی جانب سے ہے اور انسان کی عقل سے بعید ہے کہ وہ ان رازوں کی تہہ تک پہنچ سکے۔ عقلی دلائل اور فکر سے ہم یہاں خود کو مجبور پاتے ہیں کہ ان حادثات کی تاویل و تعبیر کرسکیں اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ میں دو قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

1- حادثاتی

2- ارتقائی

حادثاتی تبدیلیاں وقتی اور معمولی بھی ہوتی ہیں اور تاریخ ساز بھی اس کے مقابلہ میں ارتقائی تبدیلیوں کو مورخ بخوبی اور بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس کے پس منظر میں معاشی و سیاسی اور معاشرتی عوامل ہوتے ہیں فرانسیسی و روسی انقلاب یا 1857ء کا انقلاب اچانک وقوع پذیر نہیں ہوئے بلکہ ان کے پس منظر میں جو عوامل کام کررہے تھے وہ بالاخر انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ 1857ء کے انقلاب میں جو اسباب کام کررہے تھے وہ آخر کارتوسوں کی شکل میں اپنی انتہا کو پہنچے' اس لیے بڑے بڑے انقلاب کی وجہ بظاہر معمولی واقعات اور حادثات ہوتے ہیں لیکن جیسا کہ قابل اجمیری نے کہا کہ ۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اس لیے اس قسم کی حادثاتی تبدیلیوں کو دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پس منظر میں کام کرنے والے عوامل کو دیکھا جائے اور اس حقیقت تک پہنچا جائے کہ جن کی وجہ سے یہ حادثہ رونما ہو' اسی وقت اس کی صحیح اہمیت اجاگر ہوگی۔

19

تاریخ کیا ہے؟

تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے یہ سوال انتہائی اہمت کا حامل رہا ہے کہ تاریخ کیا ہے؟ ہیگل کے نزدیک انسانی تاریخ عقل و شعور کی تاریخ ہے اور اس لیے سوائے انسانی تاریخ کے اور کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ میں عقل اس کے عمل کو تیز کرتی ہے اور جو کچھ تاریخ میں ہوتا ہے وہ انسان کے ارادے (WILL) اور عزم کی وجہ سے ہے انسان کا یہ ارادہ اس کے خیال کا خارجی اظہار ہے' جس کے نتیجہ میں عمل پیدا ہوتا ہے اس لیے تمام انسانی تاریخ' فکر و عقل کی تاریخ اور انسانی عمل کی تاریخ ہے اس لیے تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ صرف یہ نہ دیکھا جائے کہ لوگوں کیا کیا؟ بلکہ یہ کہ انہوں نے کیا سوچا؟

(2)

ایک زمانہ تک تاریخ کو صرف ماضی کی سیاست سمجھا جاتا تھا۔ سرجان سیلے (SIR JOHN SEELEY) نے اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے ماضی کی سیاست (PAST POLITICS) کہا تھا۔ ہیگل کے نزدیک بھی تاریخ میں سیاست وہ اہم پہلو ہے کہ جس کے گرد' معاشرت و معاش چکر لگاتی ہیں مگر اب تاریخ سیاست سے نکل کر معاشیات' عمرانیات' ثقافت' فن' آرٹ' بلکہ فنی و سائنسی علوم تک پہنچ گئی ہے۔ کارل مارکس نے تاریخ کے نظریہ میں ایک انقلابی تصور پیش کیا کہ تاریخ میں سیاست مرکزی نقطہ نہیں' بلکہ یہ مرکزی نقطہ معاش ہے' معاشی' سیاسی' مذہبی اور فنی تاریخیں ایک دوسرے کے متوازن نہیں چلتیں بلکہ یہ معاش سے متاثر ہوکر اس کے نتیجہ میں بنتی و بگڑتی ہیں۔

تاریخ کی ہیئت کو اگر دیکھا جائے تو یہ دو عناصر سے بنتی ہے۔

1- ماضی کا ورثہ

2- حال کی تخیل کی قوت۔ جو ماضی کی تعبیر کرتی ہے انسان تاریخ میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا کیونکہ جو واقعات وقوع پذیر ہوچکے ہیں ان میں اب کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا ہے سوائے اس کے کہ مورخ جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لے کر انہیں بدل دے۔

ایک زمانہ تک محدود سیاسی تاریخ کے تصور کی وجہ سے تاریخ کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں عام رہیں۔ انہی میں ایک والٹیر کا یہ مقولہ تھا کہ "تاریخ جرائم اور حماقتوں کا

مرقع ہے" والٹیر نے جس وقت یہ بات کہی اس وقت بادشاہوں اور امراء کی تاریخ ہوتی تھی۔ جس میں جنگوں سازشوں اور عیاشیوں کی تفصیلات ہوتی تھیں لیکن آج تاریخ نے اپنا دائرہ وسیع کرلیا ہے اور اس میں مفکرین و فلسفیوں اور سائنسدانوں کے نظریات و افکار' اور خیالات بھی شامل ہوگئے ہیں اس میں عقل و دانش کا بھی اضافہ ہوگیا ہے تو یہی تاریخ کا وہ روشن پہلو ہے جو ہمارے لئے زیادہ دلکش اور جاذب نظر ہے۔

فلسفہ تاریخ

محض تاریخی واقعات کے بیان کرنے سے تاریخی معلومات میں تو اضافہ ہوسکتا ہے لیکن جب تک ان واقعات کے پس منظر میں عوام کا جائزہ نہیں لیا جائے اس وقت تک ذہنی و فکری ارتقاء کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب مورخین نے تاریخی واقعات لکھنا شروع کیے تو ان کی توضیح و تشریح کے ساتھ ساتھ ان واقعات کا مختلف نقطہ ہائے نظر سے تجزیہ بھی کیا مثلاً"

1- عبرت کا احساس پیدا کرنا۔
2- انسان کی کامیابی و ترقی کا تصور۔
3- تہذیبوں و قوموں کے عروج و زوال کا تذکرہ۔
4- خدائی منصوبہ اور مشیت الٰہی کا ذکر۔
5- تقدیر و حالات کی قوت و طاقت جو انسان کو مجبور محض بنائے ہوئے ہے۔
6- افراد کی عظمت جو معاشروں کی تعمیر و تخریب کرتے ہیں۔
7- خیر و شر کی کشمکش وغیرہ وغیرہ۔

فلسفہ تاریخ کا تصور سب سے پہلے والٹیر نے دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ مورخ محض واقعات کو بیان کرنے کے بجائے ان پر غور و فکر بھی کرے اور ان کا تجزیہ کرکے ان سے کوئی نتیجہ نکالے' بعد میں ہیگل نے فلسفہ تاریخ کو آفاقی و عالمی معنوں میں استعمال کیا۔ انیسویں صدی میں ثبوتیت پسندوں (POSITIVISTS) نے تاریخ کو ایک نیا نظریہ دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ واقعات کی تہہ میں کچھ قوانین کام کررہے ہیں اور تاریخ کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کی دریافت کرے والٹیر' ہیگل اور ثبوتیت پسندوں کے فلسفہ تاریخ میں یہ فرق ہے کہ ثبوتیت پسند تاریخ کو فلسفہ نہیں بلکہ تجرباتی سائنس مانتے ہیں۔ والٹیر تاریخ کے ذریعے آزادی اور فکر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے جبکہ ثبوتیت پسند اس میں یکساں قسم کے قوانین (UNIFORM LAWS) دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ (3)

فلسفہ تاریخ میں یہ بحث بھی بڑی اہم ہے کہ تاریخ کا راستہ کیا ہے؟ کیا تاریخ دائرہ (CYCLE) میں گردش کرتی ہے یا اوپر کی جانب سیدھی چلی جاتی ہے یا یہ کہ اس کا کوئی راستہ متعین نہیں۔ کوئی زاویہ نہیں کہ جس پر اس کا چلنا مقرر ہو بلکہ یہ بغیر کسی نظم و

ضبط، ترتیب اور قاعدے اور بغیر کسی منصوبہ کے بے ہنگم چلی جارہی ہے۔

تاریخ میں دورہ (CYCLE) کا نظریہ سب سے پہلے رواقی فلسفیوں نے پیش کیا تھا۔ انہوں نے انسان کے پیدا ہونے، پروان چڑھنے، بڑھاپے اور موت سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فطرت بھی اس طرح ایک دورہ پورا کرتی ہے اور جب ایک دورہ پورا ہوجاتا ہے تو نئے سرے سے دوسرا دورہ اور اس کی گردش شروع ہوجاتی ہے اس نظریہ کے تحت قوموں، تمدنوں اور سلطنتوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا گیا۔ تحریک نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں میکاولی نے پھر سے اس نظریہ کو تقویت دی کہ انسانیت کی تاریخ دائرے میں گردش کرتی ہے اٹھارویں صدی میں یہ نظریہ کمزور پڑا کیونکہ اس میں امید کا عنصر کم تھا۔ اور اس سے ترقی کے نظریہ کو نقصان پہنچا تھا۔ لیکن ویچو نے دورہ کے نظریہ کو پھر سے زندہ کیا کہ تاریخ کی گردش تین دوروں میں ختم ہوتی ہے جب ایک ختم ہوتا ہے تو کسی دوسرے نقطہ سے، دوسرا شروع ہوتا ہے اور ایک تمدن کے خاتمہ پر تمدن دوسرے معاشرے میں پیدا ہوجاتا ہے۔

تاریخ میں دورہ کے نظریہ نے اس خیال کو پیدا کیا کہ "تاریخ خود کو دہراتی ہے" ہیگل نے اس نظریہ کی مخالفت کی کہ تاریخ خود کو کبھی نہیں دہراتی اور نہ ہی یہ کسی دورہ میں گردش کرتی ہے بلکہ یہ خمدار شکل میں اوپر کی جانب جاتی ہے اس لیے اگرچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعات پھر سے دہرائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن ان کے نتائج ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں مثلاً" جنگیں ہوتی رہتی ہیں مگر ہر جنگ کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔" (4)

تاریخ کا مطالعہ دراصل نظریات کا مطالعہ ہے تاریخ میں نظریات کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر نظریہ اپنی جگہ ایک ایجاد کی مانند ہوتا ہے جو دنیا کے تمدن میں اضافہ کرتا ہے۔ تاریخ خود کو کبھی نہیں دہراتی کیونکہ ہر تاریخی واقعہ کے پس منظر میں جداگانہ نظریہ ہوتا ہے جو دوسروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ (5)

تاریخ تبدیلی و تغیر کا نام ہے اس کا واقعہ اپنے اندر ایک علیحدہ انفرادیت رکھتا ہے اس لیے وہ خود کو دوسرے کسی واقعہ میں نہیں دہراتا۔ تہذیبیں علیحدہ علیحدہ پروان چڑھتی ہیں ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بہت سی تہذیبیں ترقی نہیں کرسکیں اور ایک جگہ رک گئیں، کچھ کو فاتح اقوام نے مٹایا اور کچھ فطرت کے ہاتھوں تباہ ہوئیں۔ اس لیے تہذیبوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، یہ زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ہر تہذیب کی اپنی علیحدہ روح اور جسم ہے اس لیے سطحی مماثلت سے یہ نتیجہ نکالا

جاسکتا ہے کہ کوئی یکساں قوانین ہیں جو تاریخ کو ایک راستہ پر لیے جا رہے ہیں۔ مثلاً" عیسائی بربریت کا عہد۔ ہومر کے عہد بربریت سے بالکل مختلف ہے۔ تاریخ ہمیشہ جدتیں پیدا کرتی ہے اس میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے اور اسی لیے یہ ہر زمانہ اور ہر دور میں جاذب نظر اور دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ فلپ گیوڈلا (PHILIP GUEDALLA) نے کہا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہراتی بلکہ یہ مورخ ہیں جو ایک دوسرے کو دہراتے رہتے ہیں۔" یا مشہور فلسفی سنتیانا (SANTAYANA) کے نزدیک جن کی اپنی کوئی تاریخ نہیں ہوتی ان کا مقدر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کو دہراتے رہیں۔

"تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" کی غلط فہمی اس وجہ سے بھی پیدا ہوئی کہ انسانی فطرت کو ناقابل تغیر سمجھ لیا گیا اگر انسانی فطرت ایک جیسی تھی' ایک جیسی ہے اور رہے گی تو اس صورت میں ایک ہی جیسے واقعات و حالات میں اس کا رد عمل بھی ایک جیسا ہونا چاہئے۔ چاہے کوئی زمانہ ہو' کوئی عہد ہو اور کوئی دور ہو۔ پلیخانوف نے اس مسئلہ پر بڑی فکر انگیز بات کہی کہ اگر انسانی فطرت مستقل چیز ہے تو وہ تاریخ کی انتہائی تغیرپذیر رفتار کی توجیہ نہیں کرسکتی لیکن اگر انسانی فطرت تغیرپذیر اور تبدیل ہونے والی ہے تو اس کی اپنی یہ تبدیلی تاریخی ترقی سے متعین ہوتی ہے۔ (6)

تاریخ میں کسی ایک نمونہ (PATTERN) یا منصوبہ کی تلاش مختلف نقطہ ہائے نظر سے کی جاتی رہی ہے۔ ابتدا میں مذہبی علما نے اس نقطہ نظر کو تقویت دی کہ دنیا کی تاریخ خدا کے منصوبے کی تکمیل کر رہی ہے اس سے ان کا یہ مقصد تھا کہ تاریخ کے لیے ایک قابل فہم تغیر کا بندوبست کریں جو انسانیت کے آغاز کے راز سے پردہ بھی اٹھائے اور اس کا مقصد و نصب العین بھی متعین کرے۔ انہوں نے اس نظریہ کے تحت اس بات پر زور دیا کہ انسانی اعمال کسی مافوق الفطرت طاقت کے ذریعے عمل میں لائے جاتے ہیں اور انسان محض اس کی خواہشات کی تکمیل کررہا ہے۔ تاریخ میں جو کچھ ہوا یا ہو گا یہ انسان کی مرضی یا ضرورت کے مطابق نہیں بلکہ مشیت الٰہی کی مرضی کے مطابق ہے۔ کولنگ وڈ اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جن لوگوں نے تاریخ میں خدا کے منصوبے کو پانے کی کوشش کی انہوں نے ساری تحقیق اس بات پر صرف کردی کہ تاریخ کس طرح خدا کے منصوبہ پر چلتی ہے اس کوشش میں انہوں نے انسانی عمل اور جدوجہد کو غیراہم سمجھ کر چھوڑ دیا اس طرح مورخ اپنے اہم فرائض سے بہت دور ہٹ گیا۔ (7)

تاریخ کو جب مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا گیا تو اس میں خیر و شر اور نیکی و بدی کا تصادم نظر آیا سائنسی نقطہ نظر سے پوری تاریخ انسانی و فطرت کے درمیان ایک جنگ کا نام قرار پائی مارکس نے ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے ہٹ کر تاریخ میں اس تصادم اور کش مکش کو طبقاتی کش مکش کے نام سے موسوم کیا۔ مارکس کے مادی یا معاشی نظریہ تاریخ کے مطابق مذہب' خاندان' ریاست' قانون' اخلاق' سائنس اور آرٹ' حقیقت میں ذرائع پیداوار کے مختلف پہلو ہیں اس کے نزدیک پیداواری قوتوں کے ذریعہ تاریخی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اس لیے مارکس کے نقطہ نظر سے جب انسانی تاریخ کی تعمیر کی جاتی ہے تو یہ دو طبقوں کے درمیان تصادم کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ مثلاً" ابتدا میں دو طبقے وجود میں آئے۔ جانور چرانے والے اور کسان اس کے بعد دست کار اور کسان ان دوطبقوں کی ارتقائی شکل ذہنی و جسمانی محنت کرنے والے علیحدہ علیحدہ دو طبقے پیدا ہوئے ذہنی محنت صاحب اقتدار طبقہ کی ملکیت بن گئی جنہوں نے ذرائع پیداوار پر قبضہ کرلیا۔ ریاست انتظامیہ' مذہب' سائنس' آرٹ اور فلسفہ سمٹ کر اقلیت کی ملکیت بن گئے جب کہ جسمانی محنت کرنے والے اکثریت میں رہے لہٰذا ہم تاریخ کے مختلف ادوار کا مطالعہ ان دو طبقوں کے تصادم میں کرسکتے ہیں۔ مالک و غلام' زمیندار و کسان اور سرمایہ دار و مزدور ان میں سے اول الذکر طبقہ ہمیشہ ذرائع پیداوار پر قابض رہا اور دوسرا ان کا محتاج اس طبقاتی تقسیم کی وجہ سے معاشرے میں ہمیشہ تصادم رہا۔ بعض اوقات یہ طبقاتی جنگ اچانک کسی شعور کے شروع ہوگئی اور بعض اوقات شعور کے ساتھ مظلوم طبقہ نے جدوجہد کی۔

اہل اقتدار نے اپنی مراعات اور نجی ملکیت کی حفاظت کے لیے ریاست کے ادارے کو تخلیق کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذیلی ادارے قانون' انتظامیہ' عدلیہ' اور فوج وجود میں آئے جو اس طبقہ کی حفاظت کا کام کرتے ہیں اس طرح ریاست اس طبقہ کے لیے جو معاشی طور پر طاقت ور تھا ایک سیاسی ادارے کی حیثیت سے ابھری اور یوں ہماری تاریخ جیسا کہ مارکس اور اینگلز کہتے ہیں طبقاتی جنگ اور کشمکش کی تاریخ ہے جس کی انتہاء انقلاب پر ہوتی ہے جو یا تو معاشرے کی نئے سرے سے تشکیل کرتا ہے یا جس کے نتیجہ میں دونوں طبقے تباہ ہوجاتے ہیں۔ (8)

دو طبقوں کی اس کش مکش کو لارڈ ایکٹن ایک دوسرے انداز سے بیان کرتا ہے۔

- تاریخ میں طاقت ور زیادہ طاقت کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور غریب اپنی روزی کے لیے

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آزادی علم و ادب، فن اور آرٹ کو زیادہ توجہ نہیں ملتی اور انسانی ذہانت و محنت اس جنگ اور کش مکش میں ختم ہوجاتی ہیں۔

تاریخ میں جس قدر بھی کسی ایک نمونہ (PATTERN) یا منصوبہ (SCHEME) کو تلاش کرنے کی کوششیں ہوئی وہ جزوی طور پر تو صحیح ہوسکتی ہیں لیکن ہم اسے پوری انسانی تاریخ پر منطق نہیں کرسکتے۔ انسانی تاریخ اس قدر وسیع اور پہلو دار ہے اس میں اس قدر تضادات ہیں کہ ان میں کوئی ایک منصوبہ کام کرتا نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہم تاریخی عمل میں یکساں قوانین دریافت کرسکتے ہیں کہ جن کو پوری عالمی تاریخ پر نافذ کرسکیں۔ اس لیے یہ سوال اہمیت اختیار کرجاتا ہے کہ کیا انسان شعور کے ساتھ تاریخ کی تعمیر کرتا ہے؟ یا تاریخ خود بخود انسانی کوششوں کے بغیر تعمیر ہوتی ہے؟ اور اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں، ہم تاریخی عمل کے محض ایک آلہ کار ہیں اور واقعات خود بخود رونما ہوتے رہتے ہیں جرمنی کے مشہور چانسلر بسمارک نے جو خود ایک تاریخ ساز شخصیت تھا۔ اس "عقیدہ تسلیم و رضا" کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ

> "ہم سب مل کر دنیا کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ہم تاریخ تعمیر نہیں کرسکتے جبکہ تاریخ تعمیر ہورہی ہو تو اس دوران ہمیں انتظار کرنا چاہئے ہم کسی پھل کو چراغ کی گرمی کے ذریعہ زیادہ تیزی سے نہیں پکا سکتے اور اگر ہم پکنے سے پہلے ہی اسے توڑ لیتے ہیں تو اس کی نشو و نما میں مزاحم ہوتے ہیں اور اسے ضائع کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔"

فرد اور عوام

تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے انسان کے ذہن میں یہ سوال بھی بار بار ابھر کر آتا ہے کہ آخر انسان کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ کون سے زاویے' طریقے اور راستے ہیں کہ جن سے وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد و کوشش کرتا ہے؟ مقصد کے حصول کے لیے انسان ان ذرائع کو خود اختیار کرتا ہے یا اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ انہیں اختیار کرے۔ اس بحث سے تاریخ میں افراد کی عظمت کا نظریہ پیدا ہوا کہ فطرت کسی ایک شخص کو مافوق الفطرت طاقت دے دیتی ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے جدوجہد کرے اس جدوجہد میں وہ عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ وہ قانون اور اخلاق سے بالا تر ہوتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے صحیح کرتا ہے تاریخ میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ ان ہی شخصیتوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔ اس لیے تاریخ ان عظیم انسانوں کی سوانح عمری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ گوئٹے تاریخ میں صرف شخصیتوں کی اہمیت کا قائل تھا۔ پیغمبروں' مذہبی راہنماؤں' شاعروں' خطیبوں اور فنکاروں میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ باقی تاریخ سوائے حماقتوں کے اور کچھ نہیں۔ (9)

تاریخ میں افراد کی زندگیوں اور ان کے کارناموں کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ افراد یقیناً" تاریخ ساز ہوتے ہیں ان کے عمل سے تاریخ کا بہاؤ تیز ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ افراد تاریخ کا راستہ متعین کرتے ہیں کیونکہ تاریخ کا ہر واقعہ گذشتہ واقعات اور ارتقاء کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور وہ افراد جو تاریخ کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ محض ایک آلہ کار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں حالات و واقعات کا دھارا اس قدر تیز و تند ہوتا ہے کہ اس کے زور سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے فرد اس کی تبدیلی میں محض ہاتھ بٹاتے ہیں پلیخانوف افراد کے کردار پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

> "بارسوخ افراد اپنے کردار اور اپنے ذہنوں کی مخصوص صفات کی بدولت واقعات کو اور ان کے بعض مخصوص نتائج کو بدل تو سکتے ہیں لیکن وہ واقعات کے عمومی رجحان کو نہیں بدل سکتے جو دوسری قوتوں سے متعین ہوتے ہیں۔" (10)

وہ اس نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب بھی عظیم افراد کے ارتقاء کے لیے ساز گار معاشرتی حالات موجود ہوئے یہ لوگ ہر جگہ نمودار ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو صاحب صلاحیت شخص واقعی نمودار ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی تعلقات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک عظیم انسان اس لیے عظیم نہیں کہ اس کی ذاتی صفات عظیم تاریخی واقعات کو ان کی انفرادی خصوصیت بخشتی ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایسی صفات کا مالک ہے جو اسے زمانہ کی عظیم معاشرتی ضروریات کی خدمت کا اہل بناتی ہیں ایک عظیم انسان دوسروں کے مقابلہ میں واقعات کی رفتار کو سمجھتا ہے یہی اس کی عظمت ہے۔ (11)

تاریخ میں معاشی و سیاسی و معاشرتی اور سماجی قوتیں اس قدر طاقت ور ہوتی ہیں کہ وہ تاریخ کو مسلسل تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ دنیا میں انقلابات ان قوتوں کی وجہ سے آتے ہیں شخصیتیں صرف ان کے عمل کو تیز سے تیز تر کرتی ہیں۔ وہ تاریخ کے اس عمل کو نہ تو روک سکتی ہیں اور نہ ٹھہرا سکتی ہیں جو کام ان کی وجہ سے تیزی سے پورا ہوتا ہے ان کے بغیر وہی کام اپنی تکمیل میں زیادہ دیر لگائے گا۔ تاریخ میں حالات و واقعات' افراد سے زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں اس کی مثال جدید ترکی کی تاریخ میں مصطفیٰ کمال کی شخصیت سے دی جاسکتی ہے۔ مصطفیٰ کمال کی شخصیت سپاہیانہ سیاسی و سماجی اور ثقافتی اہمیت کی حامل تھی اس لیے اس وقت جب ترکی بیرونی افواج کے قبضے میں تھا اپنی سپاہیانہ صلاحیتوں سے اسے آزاد کرایا۔ سیاسی صلاحیتوں کے سہارے ترکی کو دنیا کی اقوام میں باعزت جگہ دی اور قائدانہ صلاحیتوں سے ترکی میں معاشی و سماجی و ثقافتی و تعلیمی اصلاحات کیں اگر اس موقع پر جو کہ ترکی کی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا مصطفیٰ کمال نہ ہوتا تو جدید ترکی کی تعمیر میں ایک طویل عرصہ درکار ہوتا' اور مصطفیٰ کمال کی ایک شخصیت نے جو کام سرانجام دیا اس کو پورا کرنے میں شاید تین یا چار شخصیتوں کی ضرورت ہوتی۔ وقت کی رفتار اور حالات یقیناً" ترکی کو جدید بنا دیتے لیکن اس عمل میں وقت اور زیادہ افراد کی ضرورت ہوتی۔

ابتدا میں ہماری تاریخ نویسی میں حکمران طبقہ اور اہل اقتدار کے افراد کو تاریخ میں نمایاں مقام دینے کی وجہ یہ تھی کہ جس وقت یہ تاریخیں لکھی گئیں اس وقت دنیا میں بادشاہی یا شخصی نظام حکومت کا رواج تھا اس لیے مورخوں کو ان حکمران شخصیتوں میں

جاذبیت نظر آئی اور انہوں نے ان کارناموں اور ان کے عمل سے وقتی طور پر جو سطحی تبدیلیاں آئیں اس پر زیادہ غور و خوض کیا لیکن واقعات کی تہہ میں ہونے والے خاموش سماجی و سیاسی و معاشی عوامل کو نہیں دیکھا۔

ہمارے مورخ اس بات کے عادی تھے کہ وہ حکمرانوں کی تابندہ پرشور' اور چند روزہ مظاہروں اور عظیم واقعات کی طرف توجہ دیں بجائے اس کے کہ اقتصادی حالات اور معاشرتی اداروں کی عظیم لیکن سست رفتار تبدیلیوں کی تصویر کشی کریں جو کہ ارتقاء انسانی کی حقیقی وجہ ہے۔

ہماری تاریخ اس وجہ سے محدود اور سمٹی ہوئی تاریخ ہے اس میں حکمران طبقہ کی تاریخ تو ہے عوام کی نہیں۔ مذہبی علماء کی ہے ان کے پیروکاروں کی نہیں' زمینداروں کی ہے کسانوں کی نہیں ہے' فوجی جنرلوں کی ہے سپاہیوں کی نہیں' صنعت کاروں کی ہے مزدوروں کی نہیں۔

مغرب میں جمہوری طرز حکومت کے بعد تاریخ نویسی میں تبدیلی آئی اور خاص طور سے فرانسیسی انقلاب نے تاریخی نظریات میں بھی انقلابی تبدیلی کی مشہور فرانسیسی مورخ مشلے (MICHELE) نے فرانسیسی انقلاب پر ایک پر اثر کتاب لکھی اور تاریخ کا نظریہ تبدیل کرنے کی طرف قدم اٹھایا کہ تاریخ عظیم انسانوں کے کارناموں کا مرقع نہیں' بلکہ عام انسانوں' عوام اور محکوم لوگوں کی تاریخ ہے۔

> "عوام اکثر راہنماؤں سے بہتر ہوتے ہیں۔ میں جتنی زیادہ گہرائی میں گیا اتنے ہی یقین کے ساتھ اس نتیجے میں پر پہنچا کہ جو کچھ بہتر ہے وہ زمین کے نیچے ہے جو گمنامی میں روپوش ہے راہنما عنصر عوام ہیں"
>
> (12)

اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا کہ مغرب میں پہلی مرتبہ حکمرانوں' بادشاہوں اور عظیم افراد سے قطع نظر کرکے عوام کی تاریخ لکھی گئی جیسے انگلستان کے عوام کی تاریخ' وغیرہ برصغیر میں سب سے پہلے کنور اشرف نے

(LIFE AND CONDITION OF THE PEOPLE OF HIDNUSTAN)

ہندوستان کے عوام کی زندگی اور حالت پر کتاب لکھی جو مروجہ روایت کے خلاف بغاوت

تھی۔

بدقسمتی سے نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد ایشیا و افریقہ اور لاطینی امریکی ممالک میں شخصیت پرستی کا فروغ ہوا' ہر نئے آزاد ملک نے شخصیتوں کے بت تراشے اور ان کے گرد ایسی روایات کا ہالہ تیار ہوا کہ ان کی حیثیت انتہائی مقدس و متبرک ہوگئی نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ اور آزادی کی تحریکوں میں ان کی جدوجہد کو اس قدر مبالغہ سے پیش کیا کہ عوام کی قربانیوں اور ان کے کردار کو یکسر یا تو نظرانداز کردیا گیا یا اس کی اہمیت کم کردی' ان ملکوں میں پھر سے تاریخ میں عظیم افراد ابھر کر آئے اور تاریخ ان افراد تک محدود ہو کر رہ گئی اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تاریخ نویسی طرز حکومت سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ شخصی نظام حکومت میں مورخ شخصیتوں کو اجاگر کرتے ہیں لیکن جمہوری نظام حکومت میں ان کی توجہ عوام اور معاشرہ کی اجتماعی قوتوں پر ہوتی ہے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ شخصی نظام حکومت میں عوام کی سرگرمیوں کو پس پردہ دھکیل دیا جاتا ہے' لیکن جب جمہوری اقدار کا فروغ ہوتا ہے تو عوامی صلاحیتیں بھی پوری طرح ابھر کر آتی ہیں اور ان کا کردار و عمل تاریخ کے کی تعمیر میں واضح ہو کر آتا ہے۔ جو مورخ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے تاریخ کا نقطہ و مرکز شخصیتوں سے ہٹ کر اجتماعی طور پر عوام تک آجاتا ہے۔

تاریخ اور فطرت

تاریخ انسان اور فطرت کے تعلق پر بھی روشنی ڈالتی ہے' کہ انسان نے فطرت سے کیا سیکھا ہے؟ اور اس کا اثر اس کی زندگی پر کیا پڑا؟ اور تاریخی عمل اس اثر سے کس حد تک متاثر ہوا؟ فطرت کے مظاہر نے انسان کے ذہن و دماغ کو بڑی حد تک متاثر کیا' موسموں کا آنا جانا' خزاں و بہار' سرما و گرما کی گردش' دن رات کا تبدیل ہونا' دریا' پہاڑ' درخت' پرندے و جانور ان سب نے اس کی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیا اور اس کے خیالات و نظریات کی تشکیل میں فطرت کے ان مظاہر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

انسان کی تاریخ دراصل زمین کے ارتقاء کی تاریخ ہے انسان فطرت سے علیحدہ نہیں رہ سکتا ہے اس کا دائرہ کار فطرت اور اسی زمین کا ماحول ہے اس لیے فطرت اور انسان کی تاریخ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اس کی ابتدا انسان اور فطرت کی کش مکش سے ہوتی ہے۔ فطرت انسان کے لیے ایک سربستہ راز کی مانند تھی اور انسان کی یہ کوشش تھی کہ ان رازوں سے پردہ اٹھا کر انہیں ان کی حقیقی اور اصل شکل میں سامنے لائے۔ ابتدا میں وہ فطرت کی ہر چیز سے خوفزدہ تھا' یہ چاند سورج' ستارے' بارش' بجلی کی کڑک' درخت و جانور۔ اس کے لیے خدا یا دیوتا کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن اس نے آہستہ آہستہ ان کی اصل حقیقت دریافت کی اور نہ صرف ان کی الوہیت کو توڑا بلکہ انہیں اپنے تابع بھی کرلیا۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو کر آتی ہے کہ انسان فطرت کے اس تصادم میں فاتح بن کر ابھرا اور فطرت کے مظاہر کو قبضہ میں لاکر اس کی دولت سے فائدہ اٹھا کر تہذیب و تمدن کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا فطرت کے ذرائع کو استعمال کرنے میں. انسان کی محنت و مشقت کا دخل ہے۔ اسی لیے ہم معاشرے کی ترقی کا اندازہ ذرائع پیداوار کے اوزاروں سے کرتے ہیں۔

فطرت کی مہربانیاں اور سختیاں انسان کی جسمانی اور ذہنی ترقی یا تنزل میں بڑا حصہ لیتی ہیں۔ انسان نے فطرت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مثلاً" اس نے ابتدا میں جانوروں کو سدھایا بعد میں اسی اصول پر اس نے انسانوں کو غلام بنا کر انہیں اپنا تابع کیا۔ (13) اپنے گھر بنانے کا تصور اس نے ابتداء میں پرندوں کے گھونسلوں سے لیا۔ اس کے کپڑے جانوروں کی کھالیں' اور پرندوں کے پر ہوا کرتے تھے۔ پرندوں کی چونچ کو دیکھ کر اسے تیر

اور نیزہ بنانے کا خیال آیا کشتی بنانے کا طریقہ اسے مچھلی دیکھ کر آیا' سانپ نے اسے ہتھیاروں کو زہر آلود کرنے کا سبق دیا۔ غرض انسانی زندگی پر فطرت نے جو اثر ڈالا ہے اس کی شہادت انسان کا رہن سہن اور تمدن آج بھی دے رہا ہے۔ (14)

ہرڈر نے خصوصیت سے انسان اور فطرت کے رشتہ کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً" جس طرح فطرت کا یہ اصول ہے کہ شیر اور چیتے زیادہ تعداد میں نہیں ہوتے جب کہ بھیڑیں و فاختائیں اور کمزور پرندے اکثریت میں ہوتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں بھی ایسا ہی ہے' بخت نصر' کمبے سس (CAMBYSES) سکندر اٹیلا اور چنگیز خان کم ہوتے ہیں اور اکثریت سیدھے سادے عوام کی ہوتی ہے۔ (15)

لیکن ہرڈر انسان اور فطرت کی اس کش مکش میں امید کے پہلو دیکھتا ہے کہ جس طرح انسان نے فطرت پر قابو پالیا ہے دلدلوں' جنگلوں کو صاف کرکے انہیں رہائش اور کھیتی باڑی کے لیے استعمال کیا ہے وحشی جانوروں کو سدھا کر اپنا تابع بنا لیا ہے اسی طرح اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ معاشرے سے ان تباہ کاریوں کو ختم کردے گا اور ظالموں' آمروں اور فرعونوں کا خاتمہ کرکے دنیا کو پرامن بنا دے گا۔ (16)

انسان اور فطرت کے اس تعلق کے بعد ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا فطرت کے ذریعے تاریخ کو سمجھا جاسکتا ہے؟ گوئٹے نے ایک جگہ کہا ہے کہ تاریخ بھی فطرت کی طرح ہے یہ بھی ہر وقت بناتی اور بگاڑتی رہتی ہے اس کی تعمیر اور شکست سے تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے لیکن ہیگل نے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان تاریخ کو فطرت کے ذریعے نہیں سمجھ سکتا ہے۔ دونوں دو مختلف چیزیں ہیں۔ فطرت کی اپنی کوئی تاریخ نہیں ہوتی یہ ہمیشہ ایک دورہ (CYCLE) میں گردش کرتی ہے لیکن اس عمل سے نہ تو کوئی چیز تعمیر ہوتی ہے اور نہ کوئی انقلاب آتا ہے۔ ہر روز سورج کا طلوع ہونا بہار کا آنا محض ایک عمل کو بار بار دہراتا ہے۔ یہ فطرت کے وہ اٹل قوانین ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوئے ہیں۔ (17) جبکہ انسان کی تاریخ اس سے مختلف ہے یہ مسلسل تبدیلی ہورہی ہے اور آگے کی جانب بڑھ رہی ہے۔

انسان اور فطرت کی کشمکش سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان اور فطرت میں گہرا ربط و ضبط ہے اگر فطرت نہیں ہوتی تو پھر انسان کی تاریخ بھی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس لیے انسان تاریخ انسان اور فطرت کے تصادم کی تاریخ ہے یہاں ہم خود سے یہ سوال کرتے

ہیں کہ کیا انسان فطرت کے مقابلہ میں کامیاب ہوگیا ہے؟ کیا اس نے فطرت کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھا دیا ہے؟ اور کیا اس نے فطرت سے اپنی عظمت کو تسلیم کرالیا ہے؟ نہیں اب تک نہیں۔ اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود انسان اور فطرت کی جنگ جاری ہے انسان نے فطرت پر اپنی فتح کی یادگاریں اور عظیم عمارتیں تعمیر کیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان یہ عظیم عمارتیں تعمیر کرتا ہے اور فطرت ان عمارتوں کو خستہ و بوسیدہ کرتی چلی جاتی ہے۔ انسان رنگین و خوبصورت تصاویر بناتا ہے اور آب و ہوا ان نقش و نگار اور رنگوں کو مدھم کرتی رہتی ہے۔ زلزلے آتے ہیں' سیلاب آتے ہیں' آتش فشاں پہاڑ لاوا اگلتے ہیں' طوفان و ہوا کے جھکڑ آتے ہیں اور انسان کی یادگاروں کو تہس نہس کرتے چلے جاتے ہیں۔

فطرت نے انسان کے آگے ابھی تک سر نہیں جھکایا ہے۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس جنگ میں کون جیتے گا؟ لیکن ہمیں اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اگر یہ کشمکش ختم ہوگئی تو اس کے ساتھ ہی انسانی تاریخ بھی ختم ہوجائے گی۔

ہمیں اس امر کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ انسان کی فطرت سے یہ جنگ دنیا کے ہر مقام پر یکساں نہیں لڑی جارہی ہے۔ ایشیا و افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک اس جنگ میں شکست خوردہ ہیں اور فطرت ان پر حاوی ہے۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ کب اور کس مرحلہ پر تمام دنیا یکساں طور پر فطرت پر غالب آئے گی کیونکہ انسان جب تک متحدہ طور پر فطرت کے خلاف صف آرا نہیں ہوگا اس وقت تک اس کے کوئی امکانات نہیں کہ وہ فطرت پر فتح پاسکے۔

ماحول اور آب و ہوا

جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا کا انسانی ذہن اور حالات پر کیا اثر ہوتا ہے؟ اس پر خصوصیت سے ہرڈر نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ نسلی اعتبار سے کسی قوم کی برتری کا قائل نہیں کیونکہ تمام انسان ایک ہیں ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے نزدیک آب و ہوا ہر قوم کے کردار کی تشکیل کرتی ہے اس لیے وہ کہیں بھی ہوں ان کی نمایاں خصوصیات علیحدہ نظر آئیں گی، مثلاً" اگر ہندوستان میں عرب، چینی، جاپانی، ملائی، ترک اور یورپی آباد ہوجائیں گے تو بھی وہ علیحدہ علیحدہ نظر آئیں گے اس سے اندازہ ہوتا ہے اور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوموں کی جسمانی تشکیل، ان کی عادات، ان کے کھیل اور تفریحات، ان کے خیالات و نظریات سب آب و ہوا پر منحصر ہیں۔ ان کو ان کے ملک سے محروم کر دو تو تم ان کو ہر چیز سے محروم کردو گے۔ اس لیے ملک کیسا بھی ہو آب و ہوا کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو وہاں کے باشندوں کے لیے اس میں خوبصورتی ہوتی ہے چونکہ ہر قوم اپنے خطہ میں اپنی عادات تفریحات اور زندگی کی مشغولیات کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لیے اگر دنیا کی قومیں یہ کوشش کریں کہ جو جہاں رہ رہا ہو اسے وہیں رہنے دیا جائے۔ اس کے حقوق اس سے نہ چھینے جائیں تو اس صورت میں امن برقرار رہ سکتا ہے۔ فطری ریاست وہی ہوسکتی ہے جہاں ایک قوم بستی ہو جو ریاست مختلف اقوام پر مشتمل ہوتی ہے اس میں مختلف قومی تضادات اسے ختم کرکے رکھ دیتے ہیں۔ اگر دنیا کی تمام قومیں جہاں پیدا ہوئی وہیں آباد ہوئی ہوتیں تو یہ دنیا مختلف اقوام کا ایک خوبصورت باغ ہوتا اور ہر قوم اپنی فطرت کے مطابق ترقی کرتی کیونکہ خدا کے منصوبہ میں، اختلاف ہے یکسانیت نہیں۔

فطرت نے قوموں کو پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں، صحراؤں، سمندروں، زبانوں، عادتوں اور کرداروں کے ذریعہ علیحدہ علیحدہ کرکے رکھا ہے اس لیے کسی دوسری قوم کے خطہ پر قبضہ کرنا، انہیں قتل کرنا، انہیں ان کی اولادوں سے محروم کرنا، انسانیت اور فطرت کے خلاف سنگین جرم ہے۔ (18)

ہرڈر نے اس بات کو حقائق و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ فطرت نے اقوام کو دنیا کے مختلف خطوں میں تقسیم کردیا اگر وہ اپنے اپنے خطوں میں رہیں تو دنیا میں امن و امان برقرار رہ سکتا لیکن ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خود فطرت اپنے اس نظام میں شکست و

ریخت کرتی رہتی ہے' آب و ہوا کی تبدیلیاں سیلاب' زلزلے' قحط اور پیداوار کی کمی قوموں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے علاقے چھوڑ کر ہجرت کریں خود انسان فطرت کے اس نظام کو تہس نہس کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ طاقتور اقوام' جنگ و جدل اور طاقت کے زور پر کمزوروں کو غلام بناتی ہیں۔ اس لیے فطرت کا تعمیر کردہ نظام کبھی اپنی اصلی شکل میں برقرار نہیں رہا اسے کبھی سامراجی طاقتوں نے توڑا تو کبھی آفاقی مذہب کے پیروکاروں نے جنہوں نے قوموں کے اپنے عقائد سے منحرف کرکے انہیں اپنے حلقہ میں لے لیا۔ ہرڈر کے نزدیک یہ دونوں اقدام فطرت کے خلاف زبردست جرائم ہیں۔

تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جو قومیں اپنے وطن سے ہجرت کرکے دوسرے ملکوں میں گئیں وہ اپنے ساتھ اپنی فطرت' عادت اور ماحول کو بھی ساتھ لے کر گئیں۔ انہوں نے دیار غیر میں بھی اپنے طرز زندگی' زبان' رہن سہن اور عادت کو برقرار رکھا۔ افریقہ میں ایشائی باشندے امریکہ میں حبشی اور ایشیا و افریقہ میں یورپی یہ صدیوں کے باوجود اپنی ذہنیت کو نہیں بدل سکے سلطنتیں اسی کرب اور اجنبیت کے احساس سے گزر گئیں' نسلی و قومی تصادم نے ہزار ہا افراد کا خون پی لیا لیکن اس کے باوجود اختلاف ہم آہنگی میں تبدیل نہیں ہو سکا۔

تاریخ کے دو پہلو

تاریخ کے مطالعہ کے بعد دو قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ایک امید اور دوسرا ناامیدی کا تاریخ میں انسانی ترقی کی لہر جو درجہ بہ درجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ نظر آتی ہے۔ اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انسان برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ خیر و شر کی کشمکش' انسان و فطرت کی کش مکش اور طبقاتی کش مکش میں انسان کامیابی کی جانب رواں دواں ہے انسانی ذہن و شعور میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ لاینحل عقدے حل ہورہے ہیں۔ الجھے ہوئے مسائل کھل کر سامنے آرہے ہیں اور "نامعلوم دنیا" "معلوم دنیا" میں تبدیل ہورہی ہے۔ فطرت انسان کے تابع ہوتی چلی جارہی ہے۔ جو قومیں بالکل علیحدہ تھیں اب تاریخ کے ذریعہ ان میں اور دوسری قوموں میں رشتے قائم ہورہے ہیں دنیا کی قوموں کی تاریخ اور ثقافت کے مطالعہ نے ذہن انسانی کو وسیع کردیا ہے۔ نسلی فخر اور قومی برتری کے بت ٹوٹ رہے ہیں ظلم و استبداد کے ادارے ایک ایک کرکے ختم ہورہے ہیں انسانوں کی اکثریت غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی کی جانب رواں دواں ہے قدیم روایات و اقدار کہنہ و فرسودہ ہو کر ٹوٹ رہی ہیں اور ہر نئی نسل نئی روشنی میں اپنے ادارے خود تعمیر کررہی ہے۔

تاریخ کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ترقی پسندی و رجعت پسندی کے تصادم میں کامیابی بالاخر ترقی پسند قوتوں کو ہوتی ہے اگر وہ وقتی طور پر ناکام ہو بھی جائیں تو آگے چل کر وہ اپنی کامیابی تسلیم کرالیتی ہیں' کوپر نیکس' برونو' گلیلیو اور نیوٹن اپنے زمانے میں پوری طرح اپنی بات نہیں منوا سکے۔ لیکن آگے چل کر زمانے نے انہیں دنیا کی تاریخ میں اعلیٰ و عظیم مقام دیا۔ مغرب میں عقلیت کا جو عروج ہوا اس نے ماضی کے فیصلوں کو غلط ثابت کرکے ان کے بارے میں دوسرا فیصلہ دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ترقی کا یہ تصور شاید مغرب تک محدود ہو یہ ترقی اسلامی ممالک میں اتنی جاندار نظر نہیں آتی کیونکہ ہماری یہاں ابن المقفع' رازی' ابن رشد اور المعریٰ کل بھی مجرم تھے اور آج بھی مجرم ہیں اس کے باوجود تاریخی قومیں جس قدر تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں اس سے یہ احساس امید ضروری پیدا ہوتا ہے کہ ان قوتوں کے آگے یہ توہمات' تعصبات اور پامال اقدار ضرور دم توڑیں گی۔

ترقی کے اس شعور کے ساتھ ساتھ تاریخ ہمارے سامنے ایک دوسری تصویر بھی پیش کرتی ہے کہ تمام انسانی جدوجہد اور کوشش کے باوجود کیا دنیا سے دکھ اور درد کا خاتمہ ہوگیا؟

کیا مفلسی و عسرت کو مٹا دیا گیا؟ کیا ظلم و ناانصافی سے چھٹکارا مل گیا؟ کیا جنگ و جدل' لوٹ مار قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ سے انسان کو نجات مل گئی ان سوالات کے جواب کے لیے جب ہم اپنے چاروں طرف تاریکی و اندھیرا چھایا ہوا نظر آتا ہے اس وقت خود سے یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ تو کیا ہر انسان کی صدیوں کی محنت کوشش اور جدوجہد بیکار گئی؟ کیا ساری دی جانے والی قربانیاں رائیگاں گئیں؟ کیا ہم جس کو ترقی کہتے ہیں یہ سطحی و بے رنگ چیز ہے؟ جب کہ اس کی تہہ میں وہی دکھ درد غم' ظلم و ستم اور اذیتیں ہیں جب ہم یہ سب کچھ دیکھتے ہیں تو کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ دنیا میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ تعمیر و شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے لیکن ہم نہیں جانتے کہ اس میں تباہ ہونے والا اچھا تھا یا یہ کہ جو نیا پیدا ہوا وہ اچھا ہے۔ قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مرجاتی ہیں لیکن ایک مردہ قوم میں کوئی تازہ پھول نہیں کھلتا راز سربستہ رہتے ہیں۔ ہم کیا کہہ سکتے ہین کہ کون خوش نصیب قوم تھی کس نے اچھا زمانہ گزارا۔ ہمارا ماضی اچھا تھا یا ہمارا حال؟ (19)

انسان کا تاریخ میں کیا کردار ہے؟ وہ کس مقصد کے لیے جدوجہد کررہا ہے؟ یا اس کا کوئی مقصد اور منصوبہ نہیں جو کچھ ہورہا ہے بغیر کسی مقصد اور منصوبہ کے ہے۔

"ہم بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں جس میں ہماری زندگیاں مقید ہیں لہٰذا ہمارے لیے یہ غیر و دلچسپ چیز ہے کہ اس کا کوئی راستہ اندر آنے یا باہر جانے کا ہے یا نہیں۔"
(20)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غم اور دکھ انسان کا مقدر ہے ہم زندہ رہتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی مشقت کا پھل چکھیں یا انسانی جدوجہد سے کوئی سبق سیکھیں۔ اگر قومیں علیحدہ رہتی ہیں تو ان کا کردار کہنہ ہوجاتا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہوتی ہیں تو ان کی مزاحمت ضائع ہوجاتی ہے۔

"اسی طرح ہم برف کے تودے توڑتے ہیں اس طرح ہم سمندر کی لہروں پر لکھتے ہیں' لہریں پھیلتی چلی جاتی ہیں' برف پگھل جاتی ہے ہمارے محلات اور ہمارے خیالات دونوں باقی نہیں رہتے۔" (21)

انسان بھی یہی سوچتا ہے کہ خدا نے کیوں اسے ایسی محنت کے لیے پیدا کیا ہے جس کا کوئی اجر نہیں۔ اس کا کیا مقصد ہے کہ انسان ایک بوجھ تلے دبا ہوا مسلسل چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی قبر کے کنارے پہنچ جاتا ہے جبکہ اس سے بالکل نہیں پوچھا جاتا کہ وہ

کہاں کس جگہ کس دور میں اور کس وقت پیدا ہونا چاہتا بھی ہے یا نہیں؟

جب ہم تاریخ میں ناانصافیوں کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح ظالم' آمر اور جھوٹے کامیاب و کامران رہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کھردری دہشت پسندی اور اس کی کینہ پرور چالاکی اس سرزمین میں ہر جگہ کامیاب رہی ہے۔ (22)

ہم دیکھتے ہیں کہ پوری تاریخ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں خواہشات کا تصادم ہے' ظالم طاقتیں ہیں تباہی کی فن کاریاں ہیں جو نیک مقاصد کو تباہ کررہی ہیں۔ تاریخ مکڑی کے جال کی مانند ہے اور اس کے الجھے ہوئے جالے تباہی و بربادی کی علامت ہیں اور بقول ہرڈر "ستم ظریفی یہ ہے کہ جس مکڑی نے اسے بنایا ہے وہ اپنے مرکز سے غائب ہے۔" (23)

انسان کی پوری تاریخ میں ہم یہی دیکھتے ہیں کہ جو لوگ زیادہ محنتی اور مشقت کرنے والے ہیں ان کے سامنے زیادہ رکاوٹیں ہوتی ہیں تاکہ کم محنتی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔
(24)

تاریخ اور ماضی کے آثار و یادگاریں انسان کے لیے عبرت کے مناظر پیش کرتی ہیں جب تمدن برباد ہوتے ہیں تو قومیں زوال پذیر ہوکر گمنامی میں روپوش ہوجاتی ہیں۔ عالی شان عمارتیں' آباد شہر' خوبصورت یادگاریں ویران و برباد ہوجاتی ہیں۔ جب انسان ان بلند و بالا عمارتوں کے کھنڈر' ان کی بوسیدگی ان کی کہنگی اور ان پر چھائی ہوئی وحشت ناک خاموشی کو دیکھتا ہے تو اس کے دل پر حسرت و مایوسی کے نقوش مرتسم ہوجاتے ہیں اور یہ خیال تقویت پکڑ لیتا ہے کہ تاریخ میں ہر چیز فانی ہے ہمارے سامنے دنیا کے مشہور تمدن' مصر' ایران' ہندوستان' اور یونان و شام ابھرتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں اس طرح تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے قوموں کے کارنامے ان کی جنگیں' فتوحات' شان و شوکت اور تزک و احتشام سب گزرے ہوئے مٹے زمانہ کی یاد دلاتے ہیں اور دل پر فنا و یاس کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

کانٹ' ہیگل' نیٹشے اور شوپنہایر عالمی تاریخ کو مسرت و خوشی سے مبرا دیکھتے ہیں۔ بقول ہیگل اس میں مسرت کے صفحات خالی ہیں انسانی تاریخ ایک المیہ ہے جس میں دہشت گردی اور ظلم و اذیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاریخ کمزور کو مایوسی اور ناامیدی کا سبق دیتی ہے تاکہ وہ اس دنیا پر متنفر ہو جائے یہ طاقتور کے لیے امید کا پیغام لاتی ہے کہ وہ کمزوروں

کے نحیف و نزار جسموں پر اپنے لیے دنیا کو اور خوبصورت بنائے یہاں انصاف کا کوئی تصور نہیں، یہاں نیکی کو بدی پر فتح نہیں ہوتی۔ طاقت و کمزور کو کچلتے اور تیز ہوا کے تھپیڑے لرزتی شمع کو بجھاتے نظر آتے ہیں۔ مظلوم سہمے ہوئے لرزتے ہاتھ اٹھائے پر امید نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھتے اور کسی مسیح و مہدی کے منتظر رہتے ہیں۔

ہم تاریخ سے کیا سیکھتے ہیں؟

تاریخ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان اس کے ذہن' رجحان' عادت اور اس کے عمل و رد عمل کو سمجھا جائے کیونکہ جب تک انسان کو نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک انسانیت کو نہیں سمجھا جائے۔ تاریخ میں انسان ہر روپ اور رنگ میں نظر آتا ہے یہاں حکمران بھی ہیں تو جنرل بھی' مذہبی مبلغین بھی ہیں تو سیدھے سادے کسان اور عوام بھی جو انسان کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاریخ انسان کے مطالعہ کے لیے ایک بہت بڑا کینوس فراہم کرتی ہے اس لیے تاریخ کے ذریعہ مختلف نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا گیا ہے جو مورخ تاریخ کو اخلاقی قدروں کے استحکام کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ تاریخ میں ایسے واقعات تلاش کرکے لاتے ہیں جن میں نیکی کی فتح اور بدی کی شکست' انسانی بداعمالیوں کی سزا' عروج و زوال سے عبرت' اور ظالموں کے برے انجام کے واقعات ہوتے ہیں مذہبی نقطہ نظر لکھنے والے مورخ تاریخ میں ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے مذہب کی برتری' مذہب کے ذریعہ قوموں کے عروج' اور مذہب و اخلاق کا باہمی رشتہ ثابت ہو۔

گوئٹے اور اس کے بعد نیٹشے نے اس بات پر زور دیا کہ تاریخ کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ محض ہماری معلومات میں اضافہ کرے اور ہمیں ماضی کے بارے میں بتائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ یہ زندگی کا مقصد پورا کرے۔ انسان اس سے کچھ حاصل کرے اور اپنی زندگی میں اس سے کچھ سبق سیکھے۔ (25)

کیا تاریخ سے ہم کچھ سبق سیکھتے ہیں؟ اس کا جواب ہمیں منفی صورت میں ملتا ہے ہم تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتے اور نہ عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیکب بک ہارڈٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تاریخ ہمیں ماضی کا شعور تو دیتی ہے مگر اس سے ہم حال کے مسائل حل نہیں کرسکتے ہیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ "تاریخ سے ہم کچھ نہیں سیکھتے" سوائے اس کے کہ "تاریخ سے ہم کچھ نہیں سیکھتے۔"

تاریخ میں قوموں اور تمدنوں کے عروج و زوال اس طرح ہوتے رہتے ہیں۔ سلطنتیں اسی طرح سے پیدا ہوتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں معاشرے اس طرح سے ابھرتے ہیں اور ختم ہوجاتے ہیں اگر اس عمل میں کوئی قوانین ہوتے تو ہم ان سے واقف ہوکر زوال کے اس

عمل کو روک سکتے تھے۔ لیکن عروج و زوال کا یہ چکر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تاریخ کے قوانین انسان کی فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ ہم سطحی طور پر تو ان کی وجوہات ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن اس کی تہہ میں پلنے والی بیماری اور بیماری کی وجہ کو تشخیص نہیں کرسکتے۔ تہذیبوں کے زوال میں ہمیں کوئی نمونہ (PATTERN) نہیں ملتا۔ ہر تہذیب اپنی جداگانہ موت مرتی ہے۔ ہم اس سلسلہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو تہذیبوں کو مارتے ہیں۔

تاریخ کی یہ افادیت تو ہوسکتی ہے کہ اس کا مطالعہ ہمیں ایک مسرت و فرحت بخشتا ہے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے ذہن و شعور میں پختگی آرہی ہے۔ لیکن ہم اس سے عملی زندگی میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور نہ اس کے مطالعہ سے ہمیں کوئی سبق ملتا ہے کیونکہ انسان سے ایک ہی غلطی کا بار بار اعادہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتا ہے۔

کیا تاریخ حقیقت تک پہنچا سکتی ہے؟

جب ہم خود سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا تاریخ ہمیں سچائی اور حقیقت کی تلاش میں مدد کرتی ہے؟ کیا یہ ان راستوں کی نشاندہی کرتی ہے جو ہمیں حقیقت تک پہنچا دیں؟ اور کیا تاریخ جن اشخاص کے تذکرے اور جن واقعات کی تفصیل ہم تک پہنچا سکتی ہے ان میں کسی حد تک صداقت ہوتی ہے؟ تو ہم تاریخ سرمایہ اور اس کی شہادت کو ناقابل یقین حد تک فرومایہ پاتے ہیں کیونکہ تاریخ لکھنے والا نہ صرف واقعات کو اپنے ذہن اور نظریہ کے مطابق دیکھتا ہے بلکہ اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق واقعات کو مسخ کرکے اپنی مرضی کے مطابق تاریخ کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے مثلاً" جب ہم اپنے تاریخی سرمایہ پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مورخین کی بڑی تعداد بادشاہوں' حکمرانوں اور امراء کی ملازم تھی۔ اس لیے انھوں نے جو تاریخیں لکھیں ان کا مقصد اپنے آقا کی تعریف و توصیف اور ان کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ہوا کرتا تھا۔ کیا ہم ان سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ممدوحین کے بارے میں ہم تک صحیح صحیح اطلاعات بہم پہنچائی ہیں؟ مزید برآں ان کی یہ تاریخیں معاشرے کے ایک محدود طبقہ اور اس کی سرگرمیوں کی تاریخ ہے اس میں ہمیں جنگوں' فتوحات' سازشوں اور عیاشیوں کی تفصیلات تو ملتی ہیں لیکن عوام کی زندگی ان کی سرگرمیوں اور ان کی ثقافت کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے کیونکہ ان کی نگاہون میں صرف حکمران طبقہ تاریخ ساز ہوتا تھا۔

تاریخ کی سچائی اور صداقت مورخ کے اپنے نظریات اور تعصبات کی بنا پر بھی متاثر ہوتی ہے وہ واقعات کو اپنے نقطہ نظر سے پرکھ کر اس کی تاویل کرتا ہے اس طرح ایک ہی واقعہ مختلف تعبیرات اور انداز سے پیش کیا جاتا ہے' سیاسی' مذہبی اور قومی نقطہ ہائے نظر سے لکھی جانے والی تاریخوں میں مبالغہ آمیزی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کی جانے کی جو کوششیں کی گئی ہیں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً" جب اسلامی ممالک مغربی استعمار کے ہاتھوں غلام ہوئے تو احساس غلامی و احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے اس قسم کی تاریخ لکھی گئیں جن میں ماضی کو زیادہ سے زیادہ شاندار اور پر شکوہ بنا کر پیش کیا گیا انھوں نے اپنی تحقیق کا دھارا اس موضوع کی جانب موڑ دیا کہ دنیا کی تہذیب میں سب سے زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے اور مغربی تہذیب کی ترقی و عروج مسلمانوں کی مرہون منت

ہے۔ اس قسم کی تاریخی تحریروں نے وقتی طور پر تو شاید احساس کمتری کو دبا دیا ہو مگر یہ تاریخیں اسلامی معاشرے میں کوئی ہیجان اور تبدیلی لانے میں ناکام ہوگئیں بلکہ اس کا نقصان یہ ہوا کہ ہم نے اپنی قدیم عظمت کا اس شد و مد کے ساتھ یقین کیا کہ اس مسحور کن تصور میں مدہوش ہوکر حال اور مستقبل دونوں سے بے نیاز ہوگئے۔

یہی حال ان تاریخی تحریروں کا ہے جو قومی نقطہ نظر سے لکھی جارہی ہیں۔ قومی مورخ اپنی تحقیق اور ذہانت کو صرف اس بات پر صرف کررہا ہے کہ اس کی قوم تہذیب و تمدن اور ثقافت میں اعلیٰ مرتبہ کی حامل ہے۔ اور انسانی تہذیب کی ہر اعلیٰ قدر اس کی سرزمین میں پروان چڑھی ہے اور دوسری اقوام نے تمام خوبیاں ان سے مستعار لی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برائیوں پر پردہ ڈال کر صرف خوبیوں کو اجاگر کیا جاتا ہے بڑے بڑے تاریخی مجرم و ملزم، ہم قوم ہونے کی وجہ سے ہیرو و بطل جلیل کا خطاب پاتے ہیں۔ تاریخی حقائق و شواہد اور واقعات کو قومی تعصب کے رنگ میں رنگ کو حسین و خوشنما بنانا خود کو اور دوسروں کو فریب دینا ہے، یہ تحریریں خواب آور لوریاں ہیں جو حقیقت سے توجہ ہٹا کر قوم کو تھپک تھپک کر سلاتی ہیں۔

تاریخ کی ایک بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کی تاریخ کو یا تو ختم کردیا یا پھران کی تاریخ اپنے نقطہ نظر سے لکھی جیسے رومیوں نے پیونک (PUNIC) جنگوں کے بارے میں یک طرفہ معلومات فراہم کیں یا عیسائیوں نے، غیر عیسائیوں پر فتوحات کی تفصیل اپنے نقطہ نظر سے لکھی، یا عربوں نے غیر عربوں کی تاریخ کو اپنے انداز میں بیان کیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی فتح کے بعد یہاں کی پوری تاریخ سامراجی مفادات کے تحت لکھی فاتح قوم تاریخی حقائق کو اپنے استعمارانہ اور سامراجی عزائم کو پورا کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے تاکہ ان کے قبضہ اور فتح کو اخلاقی جواز مل جائے اور لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ استعمار کی جنگ اعلیٰ اور نیک مقصد کے لیے تھی۔

مغربی استعمار سے نجات پاکر ایشیا و افریقہ کی قومیں آزاد ہوئیں تو انہوں نے قومی نقطہ نظر سے تاریخیں لکھنی شروع کیں۔ تو ان کی اور دور استعمار کی لکھی جانے والی تاریخی اصطلاحات میں زبردست تصادم ہوا۔ مثلاً" برطانوی دور حکومت میں 1857ء کو بغاوت کہا جاتا تھا۔ انگریز مورخ اب تک اسی کے استعمال پر زور دیتے ہیں جبکہ برصغیر کے مورخوں نے اسے جنگ آزادی قرار دیا، وہ افراد جو برطانوی راج میں باغی و سازشی، و سیاسی مجرم تھے

آج انہیں آزادی کے ہیرو کا درجہ دیا گیا ہے۔

برصغیر کی تاریخ نویسی میں ہندو مسلم فرقہ پرستی کے جذبات نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے' جب محمود غزنوی کو ہندو مورخین نے ڈاکو اور لٹیرا کہا تو مسلمان مورخوں نے اسے مجاہد' اور متقی پرہیز گار مسلمان ثابت کرنے میں سارا تحقیقی زور صرف کردیا جب اورنگ زیب کو مذہبی متشدد بتایا گیا تو اس کے جواب میں اسے اسلام کا علمبردار اور پیر باصفا بنا کر پیش کیا گیا۔ جب شیوا جی کو مغل سامراج کے خلاف کا علمبردار بنایا گیا تو اس کے جواب میں اسے باغی اور غدار کہا گیا۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تاریخ کو حکمران جماعت اور صاحب اقتدار طبقہ نے اپنے عزائم اور مقصد کے لیے استعمال کیا ہے تاکہ ان کے اقتدار کی جڑیں مضبوط ہوسکیں۔ ہنری اسٹیل کو میگر نے کیا خوب لکھا ہے :

"راستبازی اور انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اعتراف کرلیں کہ یہ وہ سب کچھ سکھاتی جو مورخین یا یوں کہہ لیجئے کہ برسراقتدار لوگ سکھانا چاہتے ہیں۔ صدیوں سے تاریخ فتح مند فوجوں کے پیچھے پیچھے چلتی رہی ہے یہ ہمیشہ کامیاب فریقوں کی محافظ رہی۔ جن طبقوں کو اقتدار حاصل ہوا ان کے مختلف کاموں کا جواز پیش کرتی رہی اور جو مذہب قائم ہوئے ان کی نشرواشاعت میں لگی رہی۔" (26)

تاریخ مورخوں کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار کی مانند ہے جو قوموں میں نفرت و عناد پیدا کرکے انہیں جنگ و جدل اور قتل و غارت گری میں مصروف رکھتی ہے۔ شاید اس لیے کسی نے کہا تھا کہ "وہ قومیں خوش نصیب ہیں جن کی کوئی تاریخ نہیں۔"

تاریخ اور مورخ

کیا تاریخ کو جذبات سے عاری ہو کر لکھا جاسکتا ہے؟ کیا کوئی بامقصد تاریخ، معروضی طرز فکر سے تحریر ہو سکتی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب تاریخ کا ہر طالب علم ڈھونڈتا ہے مشہور مورخ رانکے (RANKE) نے اس بات کی کوشش کی کہ تاریخ میں رائے، فیصلہ اور جذبات نہیں ہونے چاہئیں صرف واقعات کو بیان کردینا چاہئے، مورخ کا کام صرف یہ ہے کہ تاریخ کو ایسے پیش کرے جیسا کہ ماضی میں ہوا تھا (Exactry / AS IT WAS) لارڈ ایکٹن نے بھی ان جذبات کا اظہار کیا کہ تاریخ کو اس معیار پر لے آیا جائے جہاں تاریخی واقعات اور شخصیات کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھا جاسکے اور ایک ہی اخلاقی معیار پر انہیں پرکھا جاسکے۔

"ہم سب کو کوشش کرنی چاہئے کہ جب تک ہم زندہ ہیں کسی آدمی کو اجازت نہ دیں کہ وہ تاریخ کی غیر فانی سزا سے بچ نکلے جو غلطی پر دی جانی چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم تاریخ کو اس معیار پر نہیں لے جاسکتے کیونکہ ایک مورخ اپنے موضوع کا اس طرح سے مشاہدہ نہیں کرسکتا جس طرح ایک کیمیا دان کرتا ہے کیونکہ اس کے پاس ماضی کے جو شواہد بکھرے ہوئے ہیں اسے ان میں سے کچھ کو منتخب کرنا ہوتا ہے اور وہ ان سے ایک ترتیب اور تنظیم پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو ماضی میں نہیں تھی۔ پھر مورخ نسلی، قومی اور نظریاتی جذبات سے مبرا نہیں ہوسکتا ہے اس لیے ایک مورخ کبھی بھی غیر متعصب نہیں ہوسکتا ہے وہ ایک حد تک واقعات کی تصویر تو پیش کرسکتا ہے لیکن وہ ان واقعات سے اپنے جذبات کو علیحدہ نہیں کرسکتا۔

پھر ہر مورخ کے پاس جو تاریخی معلومات ہوتی ہیں ان کے ذریعہ سے وہ اس قابل نہیں ہوسکتا ہے کہ ماضی کی حقیقت کو دوبارہ سے بیان کرسکے، اخلاقی، فنی، سیاسی اور آرٹ کی تاریخ کے مختلف معیار ہیں اور سب اپنی جگہ صحیح ہیں جب کسی تاریخی شخصیت کو یا واقعہ کو سیاسی طبی، نفسیاتی اور مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو نتائج مختلف نکلتے ہیں۔

مورخ کی مثال ایک مسافر کی ہے جو اپنے گھر سے دور رہتے ہوئے اپنے عہد سے اجنبی ہوجاتا ہے۔ اسے جو تاریخی واقعات میسر آتے ہیں وہ قابل اعتماد نہیں ہوتے اور ناقابل اعتماد تاریخی واقعات ہماری فکری وسعتوں میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتے ہیں اور اس

لیے ہم اپنے حال کو سمجھنے کے لیے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ (27)

مورخ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے مصور کسی کی تصویر بناتا ہے مگر اس تصویر میں وہ اصلی شکل کو مکمل اور حقیقی انداز میں پیش نہیں کرسکتا ہے یہی صورت تاریخی واقعات کی ہوتی ہے جو کبھی بھی اصلی شکل میں پیش نہیں کیے جاسکتے۔

مورخ سے ہم یہ توقع ضرور کرتے ہیں کہ وہ واقعات کی ہو بہو تصویر پیش کرے اس حیثیت سے مورخ کی مثال ایک فوٹو گرافر کی ہوجاتی ہے جو اصل کی شبیہہ پیش کرتا ہے۔ اس لیے مورخ کے لیے ماضی کی تشکیل جیسی کہ وہ تھی ایک ناممکن چیز ہے۔

ایک مورخ واقعات کو کس انداز سے دیکھے اور پرکھے؟ ایک نظریہ یہ ہے کہ مورخ جب تک تاریخی واقعات کو اسی عہد اور دور میں رچ بس کر نہیں دیکھے اس وقت تک وہ ان کی اصلی حقیقت و ماہیت سے واقف نہیں ہوسکتا۔ مثلاً" نپولین پر لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مورخ خود نپولین بن جائے۔ مورخ جب تک ماضی میں ڈوب کر اس عہد کی روح سے واقف نہیں ہوگا وہ اس کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکے گا۔

لیکن اس کے برعکس ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مورخ واقعات کی معنویت کو اس طرح پیش کرے جیسے کہ وہ مشاہدہ کرتا ہے اس حیثیت میں نہیں کہ جس میں تاریخی کردار اسے محسوس کرتے ہیں کیونکہ تاریخ میں محض واقعہ کو بیان کردینا مورخ کے لیے کافی نہیں' اصل چیز وہ جذبہ اور رد عمل ہے جو مورخ اس واقع سے حاصل کرتا ہے اور پھر الفاظ میں اس کا اظہار کرتا ہے۔

تاریخ کو پڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ مورخ کے بارے میں پڑھا جائے مورخ کے بارے میں جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے عہد کی سیاسی و سماجی و معاشی حالات کو جانا جائے کیونکہ ہر مورخ اپنے عہد اور حالات کی پیداوار ہوتا ہے اس لیے مورخ حال میں رہتے ہوئے ماضی کو دیکھتا ہے۔ وہ حال کی قدروں اور روایات سے ماضی کو دیکھتا ہے اسی لیے تاریخ بدلتی رہتی ہے یہ منجمد اور ٹھہرا ہوا علم نہیں ہر عہد کا مورخ اپنے عہد کے نظریات و افکار کی روشنی میں ماضی کے واقعات بیان کرتا ہے واقعات وہی ہوتے ہیں ان کی تعبیر بدلتی رہتی ہے اگر ہم گلیلیو کو اس عہد کی روایات میں جانچیں تو وہ آج بھی غلط ہے لیکن حال کی قدروں نے اسے عظیم انسان بنا دیا ہے۔

سری رام شرما' بنی پرشاد' بنارسی پرشاد' سکسینہ' پروفیسر محمد حبیب' تارا چند' پروفیسر

مجیب، کنور اشرف اور عابد حسین وہ مورخ ہیں جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ پر کتابیں لکھیں ان کتابوں میں ہندوستانی قومیت کا نظریہ اور ہندو مسلم اتحاد کا سبق ملتا ہے۔ مورخ تاریخ کا سہارا لے کر حال کے مسائل اور ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اسی لیے ای' ایچ کار نے کہا ہے کہ "ماضی کو ہم حال کی روشنی میں اوز حال کو ماضی کی روشنی میں دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔" اسی لئے ہر عہد میں تاریخ کی تعبیر بدلتی رہتی ہے۔ ہر نئی نسل ماضی کی تاریخ کو اپنے افکار و نظریات کی روشنی میں دیکھنا چاہتی ہے یہ ایک تغیر پذیر اور تبدیل ہونے والا علم ہے اور یہ ذمہ داری مورخین پر آتی ہے کہ وہ اس علم کو زندہ اور جاندار رکھیں اور اپنے عہد کی تاریخ' اپنے عہد کے نظریات کی روشنی میں لکھیں۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود جو ایک مورخ کو درپیش ہوتی ہیں ایسی تاریخیں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں قومی مذہبی ذاتی اور نظریاتی جذبات سے بلند ہوکر واقعات کو صحیح صحیح پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے سامنے ایسے بہت سے برطانوی مورخوں کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے برطانوی استعمار اور س کے نظام کی پوری حقیقی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ جرمنی میں ایسے مورخ موجود ہیں۔ جنہوں نے ہٹلر کو قومی ہیرو بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اس کے دور میں ہونے والے واقعات پر شرم کا اظہار کیا ہے وہ مورخ بھی ہیں جنہوں نے جرات و ہمت سے تاریخی عمل اور واقعات پر اپنا اخلاقی فیصلہ دے دیا مثلاً" آرنلڈ ٹائن بی جس نے یہودیوں کے مظالم کو جو انہوں نے فلسطینیوں پر کیے نازی مظام سے تشبیہ دی ہے اور اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ جو قوم جس عذاب سے گزری تھی وہی قوم اپنے ذہن کو بدل کر اب ظالم بن گئی ہے اور فلسطینیوں کے ساتھ وہی سلوک کررہی ہے جو نازیوں نے ان کے ساتھ کیا تھا۔

اس قسم کی تاریخ تحریریں انسانی ذہن و شعور کی تعمیر میں مثبت حصہ لیتی ہیں اور یہی وہ تحریریں ہیں جو انسانوں کو مذہبی و قومی حدود سے باہر نکال کر انسانیت کے دائرہ میں لاتی ہیں کیونکہ اگر کوئی قوم اپنی بے عیب اور نقص سے پاک تاریخ پڑھنے کی عادی ہوجائے اور اس کی کمزوریوں سے ناواقف رہے تو ایسی قوم میں بے جا فخر و غرور کے احساسات پیدا ہوجاتے ہیں۔ جو اس حال اور مستقبل کی تعمیر میں بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔

اسی طرح ایک مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ واقعات کو تحقیق کے بعد ترتیب کے ساتھ پیش کردے اس کا کام یہ نہیں کہ وہ واقعات پر یا شخصیتوں پر کوئی فیصلہ دے کیونکہ یہ فیصلہ

اس کے نظریات کی روشنی میں ہوگا اور اس کے ذریعے سے وہ قاری کے ذہن کو مغلوب کرکے اس پر اپنی رائے مسلط کردے گا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مورخین کے ان فیصلوں کی وجہ سے تاریخ مسخ ہوئی ہے اور خصوصیت سے نوجوان طالب علموں کے ذہنوں کو غلط راہ پر لگایا گیا ہے کہ وہ ان فیصلوں کو من و عن قبول کرلیتے ہیں۔ اور خود ان کی تنقیدی صلاحیتوں کو آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ مورخ کا کام واقعات کی تحقیق و تدوین ہے جس طرح سے ماہر نباتات کا کام پودوں اور پھولوں کے خواص بیان کرنا ہے۔ ان کی خوبصورتی اور لطافت نہیں اس لیے مورخ اخلاقیات کا مدرس نہیں کہ وہ اخلاقی فیصلہ کرے مورخ کا کام واقعات کو بیان کرنے کا ہے اور پھر یہ قاری کا کام ہے کہ ان واقعات کی روشنی میں ان کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرے۔

تاثرات

ہمیں تاریخ کا مطالعہ محض اس لیے نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے ذریعہ سے ہم کسی عہد کے تاریخی واقعات کو یاد کرلیں یا اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرلیں بلکہ تاریخ کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس عہد کی روح کو سمجھا جائے اور اس تک رسائی حاصل کی جائے۔ ہم کسی عہد کی روح کو محض تاریخی کتابوں اور واقعات سے نہیں سمجھ سکتے ان کتابوں کے ذریعے ہم ماضی میں ہونے والے واقعات ان کی تاریخیں اور سن سے تو کما حقہ واقف ہو سکتے ہیں لیکن کتابوں میں درج یہ واقعات سرد' ٹھنڈے اور بے جان ہوتے ہیں ان کی مدد سے ہم کسی عہد کی گرمی اور تپش کو محسوس نہیں کرسکتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ کتابوں میں درج شدہ ان واقعات کے ساتھ ساتھ' اس عہد کی تعمیرات مصوری' موسیقی' رقص اور ادب کا بھی مطالعہ کیا جائے ان تمام اصناف کے مطالعہ کے بعد ہی ہم کسی عہد کی روح سے آشنا ہوسکتے ہیں۔

خصوصیت کے ساتھ کسی بھی عہد کا فن تعمیر اس عہد کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے یہ وہ فن ہے جس میں پورے معاشرے کی تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جس میں فن کار اپنے عہد کی روح کو مقید و گرفتار کردیتا ہے کتابوں میں جو چیز مردہ اور بے روح نظر آتی ہے وہ ان عمارتوں میں جیتی جاگتی اور زندہ نظر آتی ہے۔ مثلاً" اگر ہم نے مغل تاریخ کا مطالعہ کررکھا ہے اور اس کے بعد ہم اس عہد کی تعمیر شدہ عمارتوں کو دیکھتے ہیں تو وہ تمام مردہ تاریخی واقعات تخیل کی مہمیز سے زندہ و جیتے جاگتے قبروں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کے قلعوں' محلوں' باغوں اور بارہ دریوں میں ماضی حال میں تبدیل ہوجاتا ہے ان عمارتوں کے چپہ چپہ میں ہمیں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغل عہد کی روح ان عمارتوں میں بند پھڑ پھڑا رہی ہے۔

تاریخی عمارتوں کا مطالعہ' ایک تاریخی وجدان پیدا کرتا ہے کہ جس کے بغیر کسی بھی عہد کی روح کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے ان عمارتوں کی طرز تعمیر ان کی آرائش ان کا پھیلاؤ' ان کی تنگی' ان کی بلندی اور پستی' غرض ان عمارتوں کے ہر پہلو میں اس عہد کی روح اور اس عہد کا ذہن رچا بسا اور آباد ہوتا ہے۔

اسی صورت حال سے ہم مصوری' موسیقی و رقص اور ادب سے دوچار ہوتے ہیں'

انسانی معاشرے کے یہ فن ہیں جن کی تخلیق میں معاشرہ حصہ لیتا ہے یہ معاشرے کی تصویریں ہیں جن میں اس معاشرے کے خدوخال اور اجزاء نظر آتے ہیں ان میں معاشرے کی ثقافت رسم و رواج رہن سہن عادات اور رجحانات نظر آتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تاریخی مطالعہ کے لیے جمالیاتی ذوق و آگہی بھی ہو کہ جو ان فنون کی جمالیات' خوبصورتی اور حسن سے لطف اندوز ہو اگر تاریخ کے مطالعہ میں ان پہلوؤں کو نظرانداز کردیا گیا تو ہمارا علم تاریخ محدود اور تنگ ہوجائے گا۔

تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ ہر عہد میں پیدا ہونے والے' معاشی' مذہبی اور فلسفیانہ نظریوں کا بھی مطالعہ کیا جائے کیونکہ ان نظریات کا تاریخی عمل سے گہرا تعلق ہے ہر نظریہ' زمانہ اور وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اور اسی لئے نظریات معاشرے اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں ان کے پس منظر میں معاشرے کا ذہنی ارتقاء ہوتا ہے تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ نظریات کبھی کسی ایک طبقہ کی ضروریات پوری کرتے ہیں تو کبھی یہ معاشرے میں تغیرو تبدل سے پیدا ہونے والے خلاء کو بھرتے ہیں۔ مثلاً" بنو امیہ کے دور میں جبریہ یا قادریہ نظریہ کو اس لیے فروغ ہوا کہ اس نظریہ سے حکومت کو اخلاقی سہارا ملتا تھا۔

مامون نے معتزلہ کے نظریات کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے اس کی مطلق العنانی کو مدد ملتی تھی۔ پروشیا کی حکومت نے ہیگل کے فلسفہ کی اس لیے سرپرستی کی کہ اس سے ریاست کے ادارے کو استحکام ملتا تھا۔ ہندوستان میں سید احمد خان کے سیاسی و مذہبی نظریات کو یہاں کے ابھرتے ہوئے تعلیم یافتہ طبقہ نے اس لیے اختیار کیا کہ یہ ان کی ضروریات پوری کرتا تھا اس لیے اگر انسانی تاریخ میں ان مذہبی و فکری اور فلسفیانہ نظریات کو تاریخ کے عمل کے ساتھ دیکھا جائے اور ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ان کی تخلیق اور ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دے گا اس لحاظ سے علم تاریخ کو سمجھے بغیر فلسفہ' معاشیات' سیاسیات و عمرانیات یا ادب کو مکمل طور پر نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ اس بات کی جانب بھی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کی یہ کوشش بھی رہی ہے کہ جس طرح اس نے فطرت سے مقابلہ کرتے ہوئے' دریاؤں کے رخ کو بدل دیا یا ان پر بند باندھ کر ان کے بہاؤ کو روک دیا اسی طرح وہ تاریخ کے دھارے کو بھی بدل دے یا اس پر بند باندھ کر اس کے پھیلاؤ اس کی قوت اور اس کی تیزی کو روک دے اس

لیے انسان ہر دور میں قوانین بناتا ہے مختلف نظاموں کی تشکیل کرتا ہے اور روایات کی بنیاد ڈالتا ہے اور انہیں آفاقی اور اٹل بنانے کا عزم کر کے کوشش کرتا ہے کہ تاریخ کے پھیلاؤ کو ان کی مدد سے سمیٹ لے۔ اور اس کی رفتار کو ختم کر کے اسے ایک جگہ ٹھہرا دے۔ انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین' روایات اور نظاموں اور دستوروں کا مقصد یہی ہے کہ تاریخی عمل کو روک دیا جائے۔ انسانی ذہن کو ایک جگہ منجمد کردیا جائے ان آفاقی قوانین اور آفاقی قدروں کی مدد سے انسانی معاشرے کو ایک جگہ ٹھہرا کر تغیر و تبدل کے تمام راستوں کو محدود کردے لیکن تاریخی مطالعہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے یہ تمام بند اور یہ تمام رکاوٹیں اور کوششیں ناکام ہوئیں۔ تاریخی عمل نے ان تمام رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا اور اس کے تیز و تند دھارے نے تمام آفاقی قوانین' روایات اور قدروں کو مٹا دیا' تاریخ میں کوئی شے آفاقی اور اٹل نہیں یہاں ہر شے' تغیر و تبدل کا شکار ہوتی ہے۔ انسانی رجحانات کو کبھی کسی سانچہ میں مقید کر کے نہیں رکھا جاسکتا۔ ہر نسل اپنی روایات خود تشکیل کرتی ہے۔ زندہ نسل مردہ نسل کو اپنے پر حکومت کرنے کا اختیار نہیں دیتی۔ ہر نئی نسل مردہ اور کھوکھلے ڈھانچہ میں زندگی نہیں چاہتی انہیں شگفتہ اور تر و تازہ روایات و نظریات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے جب ایک نظریہ تاریخی عمل میں موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو پھر اس قوم یا معاشرہ کو نئی زندگی کے لیے کسی نئے نظریہ یا نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو بکھری ہوئی صلاحیتوں کو اکٹھا کر کے مایوس دلوں کو پھر امید سے منور کردے۔ اور قوم کو کوئی مقصد یا مطمع نظر دے۔

اشپینگلر نے کہا ہے کہ دنیا کی تاریخ شہروں کی تاریخ ہے' شہروں کی ثقافت' کسی بھی عہد کی نمائندہ ثقافت ہوتی ہے شہروں ہی میں سیاست کے تمام ڈرامے کھیلے جاتے ہیں اور شہروں ہی میں تجارت و صنعت اور لین دین کے ذریعے معاشرہ کی معاشی زندگی کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس لیے مورخ کی نگاہیں صرف شہروں پر ہوتی ہیں اس لیے باہر یا اس سے پرے' اس کی نگاہیں نہیں جاتیں۔ شہروں سے دور' دیہات کی زندگی میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان تک ہمارا مورخ پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس لیے ہماری تاریخ ایک بہت ہی محدود تاریخ کو پیش کرتی ہے۔ یہ تاریخ پورے معاشرے اور معاشرے کے تمام طبقوں پر حاوی نہیں ہوتی بلکہ یہ ہمیشہ اقلیت کی تاریخ ہوتی ہے اور یہ اقلیت بھی حکمران طبقہ ہوتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مورخ اپنی تاریخ کی بنیاد جن دستاویزات اور شہادتوں پر رکھتا ہے وہ بھی مکمل نہیں ہوتی ہیں کیونکہ ہر دور میں اور ہر عہد میں خفیہ معاہدے اور خفیہ دستاویزات ہوتی ہیں جن کے بارے میں مورخ کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً" پہلی جنگ عظیم سے قبل جو خفیہ معاہدے انگلستان' فرانس اور روس میں ہوئے تھے۔ شاید دنیا ان سے باخبر نہ ہوتی' اگر وہ معاہدے' انقلاب روس کے بعد روس کی انقلابی حکومت شائع نہ کردیتی اور ہمیں معلوم بھی نہ ہوتا کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو ان خفیہ معاہدوں کے ذریعے سے انگلستان و فرانس نے آپس میں تقسیم کرلیا تھا جبکہ عرب بظاہر اپنی آزادی کے لیے عثمانی خلافت سے جنگ کررہے تھے اس لیے آج ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہماری تاریخ کس حد تک سچی صحیح اور مکمل تاریخ ہے کیونکہ مورخ کو بہت سی خفیہ دستاویز یا تو نہیں مل سکیں یا وہ ضائع ہوگئیں اور ہم جس تاریخ کو سچی اور مکمل سمجھ رہے ہیں حقیقت میں وہ ایسی نہیں۔

نٹشے نے کہا ہے کہ جب قومیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں' تو عظیم ثقافت پیدا ہوتی ہے' اگر کوئی قوم دنیا سے کٹ کر علیحدہ رہنا چاہے' اگر وہ اپنی روایات اور قدروں کو خالص رکھنے کی کوشش کرے تو ان کا حشر اہل اسپارٹا جیسا ہوتا ہے جو بالکل الگ تھلگ رہے اور کوئی عظیم ثقافت یا تمدن پیدا نہیں کرسکے۔ لیکن جو قومیں دوسری قوموں سے ملتی ہیں' وہ کسی احساس برتری میں مبتلا نہیں ہوتیں' اپنی روایات کو عظیم و آفاقی نہیں سمجھتیں بلکہ دوسری اقوام کی تہذیب و تمدن کو فراخدلی کے ساتھ قبول کرتی ہیں۔ ایسی قومیں ہمیشہ تخلیقی اور توانائی سے بھرپور ثقافت کو جنم دیتی ہیں۔ عظیم ثقافت کے پیدا کرنے کے لیے ذہن میں کشادگی اور محبت ہونی چاہئے' تنگ نظری اور نفرت کے جذبات کبھی بھی کسی وسیع ثقافت کو پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

ہم اپنی موجودہ تاریخ کو "عالمی یا آفاقی" تاریخ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے اپنی تمام ترقی کے باوجود اب تک تمام دنیا کی اقوام کی تاریخ کو مرتب نہیں کیا ہے' آج بھی افریقہ' ایشیا' آسٹریلیا اور لاطینی امریکہ کے ہزار ہا قبائل و اقوام ہیں' جن کی تاریخ' تمدن' ثقافت اور کلچر کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں' یا ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہم صرف مشرق و مغرب کی محدود تاریخ کو عالمی تاریخ نہیں کہہ سکتے ہیں اور نہ اس سے ہم جو نتائج نکالتے ہیں ان کو دوسری تمام تاریخوں پر نافذ کرسکتے ہیں۔

جب ہم مشرق اور مغرب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں' تو ان دونوں کے راستوں میں ہمیں واضح فرق ملتا ہے۔ ترقی و رجعت پسندانہ قوتوں کے تصادم میں مشرق اور مغرب کا جواب مختلف ہے' مغرب میں اس تصادم کے نتیجہ میں ترقی پر پیچ (ZIGZAG) طریقہ سے آگے بڑھی ترقی پسند قوتوں کو شکست بھی ہوئی اور پسپائی بھی اختیار کرنی پڑی لیکن بالاخر وہ کامیاب ہوئیں' اور آگے کی جانب بڑھیں لیکن ہم اپنی تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ یہاں اس تصادم کے نتیجہ میں ترقی پسند قومیں ہمیشہ ناکام رہیں اس لیے ہماری تاریخ نہ تو اوپر کی جانب جارہی ہے' اور نہ آگے کی جانب بڑھ رہی ہے بلکہ گرداب میں چکر کاٹ رہی ہے۔

ہماری تاریخ میں روایت پسندی بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے یہ وہ زہر ہے جس نے ہمارے پورے جسم کو زہر آلود کرکے اس کی تمام قوت و حرارت کو مفلوج کردیا ہے اسی لیے ہماری تاریخ میں ہمیں نہ تو ترقی کا نظریہ ملتا ہے نہ ترقی پسند قوتوں کی فتح کا تصور' بلکہ یہ ایک مایوس اور تاریک تصویر پیش کرتا ہے' کہ جس میں امید اور روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔

تاریخ انسان کو ماضی سے وابستہ کرکے اس کے لیے ماضی کی محبت اور جذبات پیدا کرتی ہے' لیکن ماضی سے حد سے زیادہ لگاؤ بھی معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے اس لیے نیٹشے نے کہا کہ انسان کو ماضی کو اس قدر معلومات رہنی چاہئیں کہ جس قدر کہ وہ ہضم کرسکے کیونکہ حد سے زیادہ ماضی کی معلومات اور حد سے زیادہ ماضی کی یادیں' ذہن کو انتشار کا شکار کردیتی ہیں اور وہ اس قابل نہیں رہتا ہے کہ اپنے حال کے مسائل کو حل کرسکے' ماضی اس کے لیے سہانا خواب بن جاتی ہے' کہ جس سے وہ بیدار ہونے اور جاگنے پر تیار نہیں ہوتا۔

تاریخ کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان تاریخ کے تجربات سے حال کے مسائل حل نہیں کرسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے تاریخ میں ہونے والے تمام واقعات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں' دنیا کی ہر تہذیب و تمدن ایک جداگانہ یونٹ ہے جس کی ابتدا اور انتہا بالکل ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے اس لیے ہم ایک کی روشنی میں دوسرا واقعہ اور ایک تہذیب کے نمونہ پر دوسری تہذیب نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں اسی ایک واقعہ کی روشنی میں دوسرے واقعہ کا حل نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔ مثلاً

فرانسیسی انقلاب اور روسی انقلاب میں سطحی مماثلت کے باوجود ان دونوں کے نمونے (PATTERN) میں زبردست اختلاف ہے۔ دونوں کا ارتقاء مختلف حالات میں ہوا اور اس لیے دونوں کے نتائج بھی مختلف نکلے۔

تاریخ میں اگر مماثلت سے نتائج نکالنے کی کوشش کی جائے تو یہ ہمیشہ گمراہی کی جانب لے جاتی ہے۔ کیونکہ تاریخ کا کوئی منصوبہ نہیں' اس کے کوئی سائنسی قوانین' نہیں اسی لیے ہم کسی چیز کے بارے میں کوئی پیشن گوئی نہیں کرسکتے ہیں' اسی لیے تاریخ کی اس حیثیت سے کوئی افادیت نہیں کہ یہ ہمیں مرض سے پہلے باخبر کرکے اس سے محفوظ کردے۔ تاریخی تجربات نہ تو قوموں کے زوال کو روک سکتے ہیں' اور نہ ہی ان کی تباہی کو کیونکہ ہر معاشرہ اور قوم یا تہذیب کا ارتقاء و کمال بالکل علیحدہ نمونہ پر ہوتا ہے اور یہ نمونہ دوسروں پر منطق نہیں ہوسکتا ہے۔

قوموں کی تاریخ میں ان کے عمل کے علاوہ بیرونی واقعات اور حادثات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے اکثر یہ اسباب و مسبب ہی ہے مگر کسی قوم کو اس سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور کسی کو نہیں' یہ کیا ہے؟ محض اتفاق' یا چانس! یا مشیت ایزدی۔ مثلاً" سلطنت' اورنگ زیب کے مرنے کے بعد اندرونی و بیرونی واقعات و حوادثات کے نتیجہ میں محمد شاہ (1747ء) پر ختم ہوگئی۔ لیکن عثمانی سلطنت جس کا زوال سلیمان قانونی کی وفات سے شروع ہوا لیکن 1750ء تک صحیح و سالم کھڑی رہی' اس کے بعد زوال ہوا لیکن پھر بھی 1914ء تک قائم رہی' ترکوں کا زوال تیموریوں سے پہلے شروع ہوا' لیکن تیموری پہلے ختم ہوگئے اور عثمانی سلطنت ان کے زوال کے 165 سال تک باقی رہی' تاریخ میں جو ایک قوم کو پیش آتا ہے وہ دوسری کو پیش نہیں آتا تاریخ کی یہ بوقلمونی' یہ جدت یہ تغیر و تبدل یہ رنگا رنگی ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ تاریخ میں نہ تو کوئی منصوبہ ہے' اور نہ اٹل قوانین ہیں۔ اس تاریخ کو ہم نہ تو مکمل سائنس کہہ سکتے ہیں' اور نہ مکمل آرٹ بالکل یہ آرٹ اور سائنس سے جدا ایک تیسرا علم ہے۔

اختتامیہ

علم تاریخ تمام کمزوریوں کے باوجود علوم کی ایک انتہائی اہم' ضروری' اور لازمی صنف ہے کیونکہ یہی وہ واحد علم ہے' جو ماضی کے تمام تجربات' اور واقعات کے خزانہ کو محفوظ کیے ہوئے ہے' یہی وہ علم ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کی بنیادوں کو سہارا دیئے ہوئے ہے اگر آج دنیا سے تاریخ ختم ہوجائے ہمارے تمام تجربات ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوجائیں اور ہماری ماضی کی یاداشتیں ذہن سے کھو جائیں' تو ہم خود کو اچانک کھوکھلا اور بے جان پائیں گے۔ اور ہماری زندگی' ہماری تہذیب و تمدن' خلا میں معلق ہوکر رہ جائیں گی' اسی لیے معاشروں کی ترتیب و تنظیم کے لیے تاریخ کا ہونا ضروری ہے' بغیر تاریخی تجربات کے ہم کوئی نیا دستور' قانون یا روایات تشکیل نہیں دے سکتے ہیں۔

انسان کو تاریخ سے اس لیے بھی دلچسپی ہے کہ یہ انسان کی اپنی کہانی ہے' اس کے عروج و زوال کی بلندی و پستی کی خوش و غمی کی کہانی' اس لیے جب وہ تاریخ پڑھتا ہے تو اس میں اسے اپنا عکس اپنا ذہن اور اپنا عمل جلوہ گر نظر آتا ہے' اسے یہ پڑھ کر تسکین ہوتی ہے کہ جو دوسروں پر بیتی' وہ اس پر گزر رہی ہے' یا جو دوسروں کو پیش آیا' وہ بھی اس سے دوچار ہے۔ بہادری اور صبر و تحمل کے واقعات سے اسے حوصلہ ملتا ہے' غم کے واقعات سے رنج ہوتا ہے۔ خوشی کے واقعات سے مسرت ہوتی ہے' عجیب و غریب اور نادر واقعات سے تحیر کی حالت ہوتی ہے۔ عظیم انسانوں کی زندگیوں ان کی قربانیوں ان کے عمل سے اسے تسکین ملتی ہے کہ' انسان عظیم کام بھی کرسکتا ہے' نیکی کے لیے جدوجہد بھی کرسکتا ہے مقصد کے لیے جان بھی قربان کرسکتا ہے' عملی زندگی میں' ظالم چاہے کامیاب ہو' لیکن تاریخ کے صفحات مین وہی شخصیتیں زندہ رہتی ہیں' جنہوں نے حق کی خاطر قربانیاں دی ہوں' یہ تاریخ کا وہ پہلو ہے' جو ہمیں حوصلہ دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو پر مسرت اور خوشگوار بنانے کے لیے کسی کا انتظار نہیں کریں' خوشگوار زندگی کو مستقبل کے حوالے نہیں کریں' بلکہ اپنے حال کو بہتر بنانے کی جدوجہد کریں' اس جدوجہد میں ہم تنہا نہیں' تاریخ ہمارے ساتھ ہے۔

حوالے

1)- William, Dray : philosophy of History,

Englewood Cliffs N.J. 1964. P.4.

2)- R.G.Colingwood. The Idea of History,

Reprinted, Oxford. 1966. PP. 115.116.

3)- Ibid. P.I.

4)- Ibid. PP.114-115

5)- Ludwlg Von Misses: Theory and History.

London, 1985, P.225.

6)- گیورگی پلیخانوف۔ تاریخ میں فرد کا کردار۔ ماسکو۔ 1957ء۔ ص۔ 51

7)- Collingwood, P.55.

8)- K, Mark & F.Engles: Manifesto of the

communist party Moscow, 1966, P.40

9)- Karl vietor: Goethe, The Thinker. Harvard, 1950; P121.

10)- پلیخانوف، ص، 42

11)- ص، 42 - 52

12)- Owen Chadwick: The Secularization of the European Mind

in the Nineteenth Century. Cambrigde, 1972, P 198

Johann Gotfired von Heder : Reflection on the philosophy of

13)-

History of Mankind. Abridged. Eng. trans. Erank. E Manuel

Chicago. 1968p. 54.

14)- Ibid, p 53.

15)- Ibid, P.89.

16)- Ibid, P,90.

17)- Collingwood, P.114.

18)- Herder, PP. 5.10. 12.16. 30, 77, 78.

19)- Ibid, P 80.

20)- Ibid, p 80.

21)- Ibid, P.80.

22)- Ibid, p. 81.

23)- Ibid, p. 81-82

24)- Mieses, P.236.

25)- Vietor, P.135.

(26)- ہنری اسٹیل کو میجر' مطالعہ تاریخ (اردو ترجمہ) لاہور 1972ء
ص- 157

27)- Collingwood P.6

تاریخ اور فلسفہ تاریخ

لغت میں تاریخ کے معنی وقت کی نشاندہی کرنا' یا' وقت بتانا ہیں۔ اصطلاحاً" اس کے معنی ہیں "وقت بتا کر احوال متعین کرنا" ماضی میں ہونے والے واقعات جنھوں نے تاریخ میں کوئی تبدیلی کی ہو یا جن کی سیاسی معاشرتی اور معاشی اہمیت ہو' ایسے واقعات کو ترتیب و تدوین کرکے انھیں سنہ وار بیان کرنا تاریخ کے دائرے میں آتا ہے چونکہ ابتدا میں تاریخ محض حکمران طبقوں کی سرگرمیوں تک محدود تھی اس لیے وہ اہم موضوعات جو اس کے دائرہ میں آتے ہیں ان میں بڑی بڑی شخصیتوں کی ولادت و وفات' قوموں' حکمرانوں اور شہروں کی تاریخ' جنگیں' فتوحات اور شکستیں' عمارتوں کی تعمیر ارضی و سماوی حادثات جیسے قحط' وبا' زلزلے سورج و چاند گرہن اور سیلاب' عجیب و غریب واقعات جو انسان کے لیے حیرت کا باعث ہوں' حکمران طبقوں کی ثقافتی زندگی' جس میں موسیقی رقص اور مصوروں کا ذکر ہو۔

یہ تاریخی سرمایہ جو ہم تک محفوظ حالت میں پہنچا ہے بہت محدود اور کم مایہ ہے کیونکہ یہ صرف چند طبقوں کی تاریخ ہے جس میں ان کی سیاسی و ثقافتی زندگی اور ان کے افکارونظریات ہیں' ان اقلیتی حکمران طبقوں کے اقتدار کی بنیاد صرف فوجی طاقت پر نہیں تھی بلکہ انھوں نے اپنے افکار و نظریات اقدار و روایات کے ذریعہ اکثریت کو ذہنی طور پر اس قدر مفلوج کردیا تھا کہ انھوں نے سوچنا' غور کرنا اور آزادانہ سرگرم عمل ہونا چھوڑ دیا تھا۔ حکمران طبقوں نے حکومت و انتظام چلانے کے لیے اعلیٰ تعلیم و تربیت خود میں محفوظ کرلی تھی۔ افلاطون نے اسی کو ذہن میں رکھ کر کہا تھا کہ "عقل مندوں کا کام راہنمائی کرنا ہے جبکہ عوام کا کام محض تقلید ہے" اس سے یہ تصور مقبول عام ہوا کہ عوام' نااہل' نالائق اور عقل سے بے بہرہ ہوتے ہیں اس لیے ان پر حکومت کرنے' اور ان کی راہنمائی کے لیے چند افراد کی ضرورت ہوتی ہے محکوم اور حکمران کی تقسیم میں محکوم کا کام محض اطاعت و وفاداری ہے۔

اس لیے تاریخ نے معاشرہ کی اکثریت کو جن میں غلام' کسان' مزدور' دستکار اور کاریگر شامل ہیں' انھیں فراموش کردیا اور ان کی محنت' ان کی جدت اور ان کی صلاحیتوں کو جن سے زمانہ کی رفتار آگے بڑھی نظر انداز کرکے اپنا دائرہ صرف اقلیتی حکمران طبقوں تک محدود رکھا اور ان کے کارنامے ہی انسانی تاریخ کے کارنامے قرار پائے۔

تاریخ کی کم مائیگی صرف' یہاں پر ہی ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کی تنگی اور بڑھ جاتی ہے جب یہ خود کو صرف مردوں کے کارناموں تک محدود کرلیتی ہے کیونکہ ہماری تاریخ صرف مردوں کی تاریخ ہے اس میں عورتوں کے دھارے سے بالکل علیحدہ کردیا ہے۔ اگر چند عورتوں کا ذکر تاریخ میں آتا بھی ہے تو یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے مردوں کی نقل کی ان کی عادات و اطوار اختیار کیں اور اپنی نسوانیت کم کرکے مردانہ اوصاف و خصوصیات پیدا کیں' اور یہی وجہ ان کی کامیابی بیان کی جاتی ہے۔ جیسے سلطانہ رضیہ (اسے رضیہ سلطان بھی کہا جاتا ہے) کے بارے میں ہم عصر مورخ لکھتے ہیں کہ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی بے پردہ باہر آتی تھی۔ شمشیر زنی و تیر اندازی' گھڑ سواری (جو مردانہ اوصاف مانے جاتے ہیں) میں مشاق تھی اگرچہ ان مردانہ خصوصیات کو اختیار کرنے کے باوجود اسے زیادہ عرصہ برداشت نہیں کیا گیا۔ اس لیے تاریخ میں عورت کے کردار' اس کے عمل اور اس کے اس حصہ کو جو اس نے تاریخ کی تشکیل میں کیا مورخوں نے اجاگر نہیں کیا۔

اشپنگلر نے تاریخ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر مرد سیاسی اور سماجی طور پر باشعور اور آزاد ہے تو عورت بھی ابدی' مادرانہ طور پر درخت کی مانند ہے۔ (درخت میں عورت کی خصوصیات ہیں) اس لیے اگر آدمی تاریخ بتاتا ہے تو عورت خود تاریخ ہے۔ عورت کی زندگی بھی بغیر جنگ کے نہیں ہوتی اسے بھی بچہ کی پیدائش کے وقت ایک جنگ لڑنی پڑتی ہے اور بچہ کی پیدائش پر یہ جنگ فتح پر ختم ہوتی ہے۔ ازٹیک (AZTEC) اور میکسیکو کلچر میں عورت کو دردزہ کی جنگ میں بحیثیت جنگجو تسلیم کیا جاتا تھا اور اگر وہ اسی دوران مرجاتی تھی تو اسے جنگ میں مرنے والے شہید کا درجہ ملتا تھا لیکن جب معاشرہ میں مرد کا تسلط ہوا تو عورت کی آزادی اور خودمختاری ختم ہوگئی اور عورت کے ذریعے اپنی شناخت کرانے پر مجبور کردی گئی۔ باپ کا وارث لڑکا بنا جو اس کا خون اور ورثہ لے کر اس کے خاندان کو زندہ رکھتا ہے اس طرح مرد اور عورت دو طرح کی تاریخ پیدا کررہے ہیں دونوں میں خاموش تلخ اور بے رحم جدوجہد جاری ہے چونکہ مرد نے عورت کی اپنی حیثیت کو کچل کر ختم کر دیا ہے اس لیے عورت مرد کی تاریخ سے نفرت کرتی ہے وہ مرد کی سیاست سے نفرت کرتی ہے کیونکہ یہ وہ سیاست ہے جس میں اس کے لڑکے اس سے چھین لیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے اس فتح کا کیا مقصد جس میں اس کی بستر کی جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی فتوحات کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے مرد کی یہ وہ تاریخ ہے جو عورت کی تاریخ کو

تباہ کردیتی ہے۔

پھر معاشرہ کی تمام مذہبی و نسلی اقلیتیں ہیں جو اقتدار اور طاقت سے محروم اکثریت کے زیر سایہ خاموشی سے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں اور اسی خاموشی میں اپنے تحفظ اور بقا کی جنگ میں ان کی جدوجہد پر اسرار علامتوں اشاروں اور کنائیوں میں گم ہوجاتی ہے اور انہیں معاشرے کے دھارے سے کاٹ کر علیحدہ کرکے ان کی صلاحیت کو نظرانداز کردیا جاتا ہے جیسے امریکہ میں نیگرو باشندوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے امریکہ کی تاریخ سفید آدمی کی تاریخ ہے اس میں نیگرو غلاموں کی محنت و جدوجہد کا کوئی ذکر نہیں جو انہوں نے امریکی معاشرہ کی تشکیل میں کی اس لیے انسانی تاریخ مکمل اور جامع نہیں بلکہ ادھوری اور نامکمل ہے۔ یہ انسانی سرگرمیوں کا ایک مختصر بیان ہے' یہ تاریخ بااقتدار اقلیتی طبقہ کی تاریخ ہے جو معاشرہ پر مسلط کی جاتی ہے' چونکہ اس میں اکثریت کو اپنی جدوجہد کا عکس نظر نہیں آتا اس لیے ان کو اس میں کوئی جاذبیت اور دلکشی بھی نظر نہیں آتی۔

لیکن اب جمہوری اقدار کے فروغ کے ساتھ تاریخ کا تصور بدل رہا ہے اور تاریخ جو اب تک حکمران طبقوں کی پر شکوہ زندگی میں گھری ہوئی تھی اب وہ اس تنگنائے سے نکل کر وسعت اور پھیلاؤ میں داخل ہو رہی ہے۔

انسانی تاریخ' معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ مختلف مرحلوں پر بدلتی رہی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جبکہ معاشرہ طبقاتی تقسیم کا شکار نہ تھا اس وقت انسان ایک مقصد کے لیے جنگ کررہا تھا' اپنے بچاؤ' تحفظ اور بقا کے لیے۔ اس عہد کا انسان ذات پات' نسل' رنگ اور جنسی تفریق سے نا آشنا تھا فطرت سے جنگ نے اسے ایک مقصد کے لیے متحد کردیا تھا اس دور کے جو آثار ملتے ہیں اس میں پتھر اور مختلف دھاتوں کے اوزار ہیں جو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ظاہر کرتے ہیں ان اوزاروں میں اس کی محنت' جفاکشی اور جدوجہد کی کہانی پوشیدہ ہے جو اس کی ذہنی اور فکری ترقی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

انسانوں کا یہ اتحاد اس وقت ٹوٹا جب ریاست وجود میں آئی اور ریاست کا بالائی ڈھانچہ تشکیل ہوا جس میں چند طبقوں نے اکثریت کو ذہنی و جسمانی طور پر اپنا غلام بنا' لیا لیکن معاشرہ کی یہ اکثریت چاہے وہ غلام ہوں یا کسان' کاشتکار ہوں یا مزدور' انہوں نے تاریخ کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ ان کے کارناموں کو حکمران طبقوں سے منسوب کردیا گیا مثلاً" تاج محل کی تعمیر و تشکیل تزئین و آرائش میں ہزار

مزدوروں' دست کاروں' صناعوں' کاریگروں' معماروں اور ہنر مندوں نے حصہ لیا مگر تاریخ میں اسے صرف شاہجہاں سے منسوب کردیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی تاریخ سے علیحدہ ہوتا چلا گیا اور تاریخ کے لیے وہ اجنبی ہوگیا یہاں تک کہ حکمران طبقوں کی تاریخ نے اسے بالکل فراموش کردیا۔

معاشرہ کی مکمل تاریخ وہ ہوگی جس میں معاشرے کے تمام طبقوں کے کردار اور عمل کا ذکر ہوگا چاہے وہ غلام ہوں یا کسان اور مزدور' عورتیں ہوں یا اقلیتیں' اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تاریخ کو سیاست کے محدود دائرے سے نکال کر اس کے سماجی و معاشرتی اور معاشی پہلوؤں کو ابھارا جائے کیونکہ سیاست پر چند افراد اور حکمران اقلیت کا تسلط ہوتا ہے اور وہی اس میں باعمل ہوتے ہیں اس لیے وہی تاریخ میں اپنا مقام بناتے ہیں جب کہ ثقافتی زندگی میں معاشرہ کا ہر فرد باعمل ہوتا ہے اور یہ وہ تاریخ ہے کہ جس میں انسان بحیثیت جنگجو' سازشی قتل و غارت گری کرنے والا اور لوٹ مار کرنے والا نظر نہیں آتا جو کہ سیاسی تاریخ کی خصوصیات ہیں' ثقافتی تاریخ سے انسان کو جو تصور ابھرتا ہے وہ پرامن خوشی و مسرت کا متلاشی' ہمدرد اور محبت کرنے والے انسان کا ہوتا ہے یہی وہ تاریخ ہوگی جو انسان کو جنگ و جدل سے دور لے جائے گی اور انسانی قدروں کو فروغ دے گی۔

ہیگل نے تاریخ کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ہمعصر تاریخ' تخیلاتی تاریخ اور فلسفیانہ تاریخ' ہمعصر تاریخ سے مراد وہ تاریخ ہے جو کہ ہمعصر مورخ لکھا کرتے ہیں یہ تاریخ بنیادی ماخذ کا کام دیتی ہے ہم عصر مورخ ان واقعات کو جو اس کے زمانہ میں پیش آتے ہیں اور جنہیں وہ اہم اور ضروری سمجھتا ہے انہیں ضبط تحریر میں لے آتا ہے اس لیے یہ واقعات دیومالائی تصورات اور لوک کہانیوں سے پاک ہوتے ہیں اگرچہ ان واقعات کی حیثیت جامع نہیں ہوتی کیونکہ مورخ خود اس ماحول کا ایک حصہ ہوتا ہے جس میں یہ واقعات ہوئے وہ ان کا مشاہدہ کرتا ہے اور انہیں بیان کردیتا ہے مگر وہ ان مشاہدات پر غور و فکر نہیں کرتا اور نہ ہی ان کا تجزیاتی مطالعہ کرتا ہے۔ اگر کوئی سیاستدان اور فوجی جنرل تاریخ لکھتا ہے تو وہ تاریخ میں اپنے مقاصد کو بھی شامل کرلیتا ہے۔ یہ اپنی غلطیاں چھپا کر اپنے خلاف شہادتوں کو ضائع کردیتا ہے۔ اس لیے تاریخ میں جو غلطیاں رہ جاتی ہیں اس کے ذمہ دار وہی لوگ ہوتے ہیں کیونکہ سوانح حیات اور ذاتی یاد داشت میں فرد کا تعصب اور پسند و ناپسند واضح ہوتی ہے اس لیے اکثر مورخ اسے تاریخ کا ایک حصہ تسلیم نہیں کرتے۔

اس کے برعکس تخیلاتی تاریخ وقت میں قید نہیں ہوتی بلکہ یہ حال کی روح کی نمائندگی کرتی ہے۔ مورخ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پہلے اپنی قوم اور ملک کی تاریخ کا مکمل طور پر مطالعہ کرے اور پھر اسے عالمی تاریخ کے نقطہ نظر سے دیکھے اس میں مورخ اپنے نقطہ نظر یا حال کی روح کو ماضی میں شامل کردیتا ہے اور ماضی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ حال کی نمائندگی کرتی ہے مثلاً" مشہور رومی مورخ لیوی (LIVY) رومی بادشاہوں کی زبانی وہ کہلواتا ہے جو وہ خود کہنا چاہتا تھا کیونکہ یہ خیالات رومی بادشاہوں کے ذہن اور ان کی روایات کے خلاف تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی سب سے اچھی مثال ضیاء الدین برنی ہے جس نے بادشاہوں' علماء اور حکومت کے عہدیداروں سے وہ کہلوایا جو اس کے اپنے خیالات تھے۔

تخیلاتی تاریخ دور دراز ماضی سے واقعات کو نکال کر لاتی ہے اور پھر ان واقعات کو جو فرسودہ اور بوسیدہ ہوچکے تھے ان کو حال کی روایات و اقدار میں رنگ کر انہیں جاندار اور دلکش بناتی ہے انہیں موثر بنانے کے لیے ان میں اخلاقی سبق بھی شامل کردیے جاتے ہیں خصوصیت سے ان تاریخوں میں بادشاہوں' سیاستدانوں اور حکمران طبقوں کے لیے اخلاقی و عبرت آموز اسباق ہوتے ہیں تاکہ وہ پچھلے تجربات سے سیکھ سکیں لیکن قومیں اور معاشرے ان تجربات سے شعور تو حاصل کرتے ہیں مگر چونکہ ہر دور اور ہر زمانہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور ہر واقعہ علیحدہ عوامل کی پیدوار ہوتا ہے اس لیے اس اصول اور تجربہ کی بنا پر جو کہ ماضی میں صحیح تھا وہ حال میں بھی صحیح ہوسکتا ہے تاریخ سے مدد نہیں لی جاسکتی ہے۔

تخیلاتی تاریخ ہر دور اور ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہے اور ماضی کو بدلے ہوئے حالات کی روایات میں منتقل کرتی رہتی ہے' تخیلاتی تاریخ ہی دراصل تاریخ میں وہ نئی زندگی پیدا کرتی ہے جو اسے زندہ رکھنے اور دلچسپ بنانے میں مدد دیتی ہے یہ تاریخ کا رنگ و روپ بدلتی رہتی ہے اور ہر نئی نسل کے جذبات و امنگوں کو ان میں سمودیتی ہے۔

تخیلاتی تاریخ محض واقعات کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ ہم عصر مورخوں کی رائے اور تاریخ کے ماخذوں کی روشنی میں واقعات کا تجزیہ کرکے تنقیدی نظر سے ان کا جائزہ لیتی ہے اور ماضی کے بہت سے مفروضوں کو حقیقت میں ڈھالتی ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان واقعات سے مورخ کا جذباتی لگاؤ ختم ہوجاتا ہے اور وہ اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ ان کا تجزیہ کرکے جھوٹ اور سچ کو سامنے لائے۔

تحیلاتی تاریخ میں تاریخ کو کئی پہلوؤں میں تقسیم کردیا جاتا ہے جیسے آرٹ' قانون اور مذہب وغیرہ' پھران کی علیحدہ سے تاریخ تشکیل دی جاتی ہے اور ان کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ پورے معاشرہ کے ڈھانچے اور اس کی زندگی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

تاریخ کی تیسری قسم فلسفیانہ تاریخ ہے اس میں تاریخ کو عقل کی بنیاد پر دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اور عقل کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس عالمی روح کو جو ایک ہے اور اپنا اظہار مختلف ماحول میں کرتی ہے اسے تاریخ کے ذریعہ ظاہر کیا جائے۔

انسان کو تاریخ سے اس لیے دلچسپی ہے کہ یہ اس کی اپنی تاریخ ہے اور جب وہ تاریخ میں ہونے والے واقعات اور بیانات کو پڑھتا ہے تو اسے ان میں اپنی جھلک نظر آتی ہے مارکس کہتا ہے۔

"تاریخ کچھ نہیں کرتی اس کے پاس وافر دولت نہیں یہ کوئی جنگ نہیں لڑتی' یہ انسان ہے' حقیقی انسان جو ہر کام کرتا ہے اور جو ہر عمل پر قادر ہے"

تاریخ میں مورخ کا تخیل اس کا اسلوب بیان اور اس کا طرز تحریر وہ عناصر ہیں جو ماضی کے واقعات کو جیتا جاگتا اور زندہ بنا دیتے ہیں اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہ واقعات اس کے سامنے ہورہے ہیں وہ خود ان واقعات کا ایک حصہ ہے ماضی جو ایک بند کتاب کی طرح ہوتی ہے۔ تاریخ اسے کھول کر روشنی میں لے آتی ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ' ماضی کے واقعات' ان واقعات کا پس منظر اور اسباب و علل کے مطالعہ کے بعد مفکرین نے تاریخ کے ذریعہ فکر کی راہیں متعین کرنے کی کوشش کی اور یہ جائزہ لیا کہ

کیا تاریخ کے مطالعہ سے انسان کچھ سیکھتا ہے یا نہیں؟ کیا یہ حقیقت کی تلاش میں مدد کرتی ہے؟ کیا تاریخ کا اپنا کوئی منصوبہ ہے جس کی یہ تکمیل کر رہی ہے؟ کیا ایسے تاریخی قوانین ہیں جن کے تحت تاریخ کا دھارا بہہ رہا ہے؟ کیا تاریخ ترقی کی جانب بڑھ رہی ہے اور کیا یہ ترقی مسلسل ہے یا اس میں جگہ جگہ رکاوٹیں آجاتی ہیں؟ کیا انسان تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہے یا انسان اپنی تاریخ خود تعمیر کرنے پر قادر و مختار ہے؟ ان سوالات کے جوابات فلسفہ تاریخ کے ذریعہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

فلسفہ تاریخ' تاریخی واقعات کے انبار سے انسانی ذہن و شعور اور فکر کی ترقی کا مطالعہ کرتا ہے اور ان واقعات کی تہہ میں جو عوامل کام کررہے تھے ان پر سے پردہ اٹھاتا

ہے اور انسانی ذہن و دماغ کی تہوں میں جو پوشیدہ تھا اسے کھینچ کر باہر لاتا ہے جس کی وجہ سے تاریخی واقعات ہمارے سامنے اپنی اصلی شکل و صورت اور صحیح خدوخال میں ابھر کر سامنے آتے ہیں اس لیے تاریخ کو پڑھنے کے لیے فلسفہ تاریخ کی ضرورت ہے جس کی آگہی کے بغیر تاریخ اور تاریخی واقعات کی اصلیت و ماہیت سے واقف نہیں ہوا جاسکتا ہے فلسفہ تاریخ کی مدد سے ہم انسانی تاریخ کا نہ صرف تنقیدی نظر سے جائزہ لے سکتے ہیں بلکہ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ مختلف ادوار میں نظریات و عقائد کے تحت جو تاریخیں لکھی گئیں ان کے موضوعات کیا تھے؟ اور وہ کن مقاصد کی تکمیل کے تحت لکھی گئیں؟

اس کی مدد سے ہم تاریخی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ذہن انسان کے ارتقاء کا بھی مطالعہ کرسکتے ہیں۔

ابتدائی مشرقی تاریخیں دیوی دیوتاؤں ان کے مافوق الفطرت کارناموں اور داستانوں پر مبنی ہیں اس لیے ان تاریخوں میں دیوی اور دیوتاؤں کی عظمت اور بڑائی ہے اور انسانی عمل مفقود ہے اس الہیاتی تاریخ سے انسانی ذہن اور اس کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس ابتدائی دور میں انسان کے لیے فطرت ایک سربستہ راز تھی اور اس لیئے وہ تمام ارضی و سماوی حوادث اور واقعات کو دیوی دیوتاؤں سے منسوب کرتا ہے ان تاریخوں میں ساری قوت و طاقت دیوتاؤں کے پاس ہے اور انسان کی حیثیت محض ایک ان کے آلہ کار کی ہے۔

سب سے پہلے یونانیوں نے تاریخ کا شعور حاصل کیا اور انسان اور فطرت کے تصادم کے ذریعے تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی فطرت کی تبدیلی و تغیر میں انہوں نے انسان کی تبدیلی اور تغیر کو دیکھا موسموں کا تبدیل ہونا اور متعین وقت پر خزاں' بہار گرمی و سردی کا آنا زلزلوں اور سیلابوں سے زمین کے اندر اور اوپر تبدیلی کا آنا فطرت سے مقابلہ میں انسان کی فتح و شکست اور اپنی بقا کے لیے انسان کی جدوجہد' ان مشاہدات نے انہیں انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور تجزیہ کرنے میں مدد دی اس لیے یونانیوں نے جس تاریخ کی بنیاد رکھی یہ مذہبی قصوں اور دیومالائی کہانیوں پر مشتمل نہیں تھی بلکہ ان انسانی سرگرمیوں اور عمل پر تھی جس سے وہ واقف تھے ان کی تاریخ میں وہ واقعات نہیں جو مفروضی اور حقیقت سے دور ہوں بلکہ وہ واقعات ہیں جو ماضی میں واقع ہوئے اور جن کے بارے میں ان کی واقفیت تھی' یونانی علم تاریخ کو اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اس سے تبدیلی کا شعور پیدا ہوتا ہے

اور تبدیلی کے اس شعور کے ذریعے انسان اپنے اعمال پر قادر ہو سکتا ہے۔

یونانیوں کے بعد رومیوں نے تاریخ کو ایک نئی جہت دی وہ تاریخ کو ایک مسلسل جاری رہنا والا سلسلہ سمجھتے تھے اسی لیے انہوں نے ماضی کے ورثہ کی حفاظت کی اور قدیم اشیاء اور نوادرات کو محفوظ کیا رومیوں نے پہلی "عالمی اور قومی تاریخ کا تصور دیا۔"

یونانی اور رومی تاریخ میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس میں دیوتاؤں کا اثر محدود ہے ان کے نزدیک تاریخ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔

عیسائیت کے تاریخی نظریہ میں انسانی عمل کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ اچانک ایک شدید خواہش کے ذریعے ہوتا ہے یہی عیسائیت میں "بنیادی گناہ" کا تصور ہے۔ عیسائیت میں ایک منصوبہ کی نشاندہی کی گئی ہے یہ منصوبہ انسان کا نہیں بلکہ خدا کا ہے اور انسان محض آلہ کار کی حیثیت سے اس منصوبہ کی تکمیل کررہا ہے عیسائیت کے اس تاریخی نقطہ نظر سے یہ آفاقی تصور پیدا ہوا کہ خدا کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں اور وہ سب مل کر ہر ملک معاشرہ اور ماحول میں خدا کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔

اسلامی تاریخی تصور میں بھی خدا کی ذات تاریخ کا محور ہے اور انسانی عمل خدا کے منصوبوں کی تکمیل کررہا ہے اس کے علاوہ اسلامی تصور تاریخ میں علم تاریخ عبرت کے مواقع فراہم کرتا ہے ماضی کے واقعات ماضی کے آثار اور قوموں کا عروج و زوال یہ سب دنیا کی بے ثباتی اور فانی ہونے کی دلیلیں ہیں اس لیے تاریخ انسان کے لیے باعث عبرت ہے۔

روشن خیالی کے دور میں تاریخ کو سائنسی اور عقلی بنیادوں پر پرکھا گیا لیکن اس فکر کے تحت ماضی کو دور وحشت و بربریت سمجھا گیا اور اس سے مقابلہ کرتے ہوئے زمانہ حال کو ترقی یافتہ اور روشن خیالی عہد کہا گیا اس کے خلاف رومانوی تحریک پیدا ہوئی جس کا پرجوش کارکن روسو تھا۔ اس نے تاریخ میں حکمرانوں سے زیادہ عوام پر زور دیا اور والٹیر پر نقطہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ روشن خیال حکمران اس وقت تک کچھ نہیں کرسکتے جب تک کہ عوام خود روشن خیال نہ ہوں ماضی کو دور وحشت سمجھ کر نہیں بلکہ انسانی تہذیب کے ارتقاء کی ایک کڑی سمجھ کر دیکھنا چاہئے انسانی تاریخ ایک مسلسل عمل ہے اور انسانی تہذیب

ثبوتیت پسندوں نے تاریخ کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی تاکہ تاریخ کو بھی سائنس کی بنیادوں پر جانچا اور پرکھا جاسکے لیکن اس نظریہ کے تحت لکھی جانے والی تاریخوں میں واقعات کی چھان بین اور تفصیل تو ہے مگر ان پر کوئی تنقید نہیں انہوں نے تاریخ کو صرف تاریخ سمجھ کر مطالعہ کیا اور اس کی تہہ میں پوشیدہ فکر کو نہیں دیکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے تاریخ کو صرف سیاست تک محدود رکھا اور سائنس مذہب اور آرٹ کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا۔

مارکس اور اینگلز نے تاریخ مادیت کا نظریہ پیش کرکے تاریخ کی تعبیر و تفسیر کو ایک نیا اور جاندار نقطہ نظر دیا۔ تاریخ مادیت نے انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور اس کی ترقی کا جائزہ لے کر انسان اور فطرت اور طبقاتی تصادم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اثرات کو بے نقاب کیا ہے۔ تاریخ مادیت معاشرے کی تاریخ اور فطرت کی تاریخ میں بنیادی فرق بتاتے ہوئے اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ چونکہ فطرت شعور نہیں رکھتی اس لیے اس کا ارتقاء طبعی ہوتا ہے۔ لیکن معاشرے کا ارتقاء شعوری ہوتا ہے معاشرہ کا شعور ان نظریات سے تشکیل پاتا ہے جو عہد بہ عہد اور مرحلہ بہ مرحلہ معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں۔

انسان محنت اور شعوری قوتوں کے ذریعے فطرت کو تبدیل کرتا ہے اوراس پر قابو پاتا ہے انسانی دماغ اور ہاتھ اس کی محنت کے آلات ہیں جن کی حیثیت پیداواری نظام میں ہڈیوں اور عضلات کی ہوتی ہے۔ آلات محنت ذرائع کو تشکیل دیتے ہیں اور یہ دونوں مل کر پیداوار کے ذرائع کو فروغ دیتے ہیں پیداواری قوتوں کے ذریعے انسان اور فطرت کے رشتہ کا علم ہوتا ہے کہ انسان نے محنت اور مشقت کے ذریعہ کیا کیا تبدیلیاں کیں کیونکہ انسانی آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ پیداوار بھی بڑھی اور ضرورت کے تحت انسان نے نئے نئے آلات ایجاد کیے تاکہ کم محنت سے وہ زیادہ پیدوار حاصل کرسکے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پیداواری قوتیں' پیداواری تعلقات کو تشکیل دیتی ہیں چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ پیداواری قوتیں بدلتی رہتی ہیں اس لیے اس کے ساتھ ساتھ تعلقات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب پیداواری تعلقات' پیداواری قوتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو تعلقات کی خرابی کے نتیجہ میں اندرونی تصادم ہوتا ہے اور جب پیداواری قوتیں آگے بڑھتی ہیں تو تعلقات پیچھے رہ جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اس

کی ترقی میں رکاوٹ ڈالیں اس مرحلہ پر پیداواری قوتوں اور تعلقات کو نئے سرے سے تشکیل دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تشکیل سماجی انقلاب کے ذریعہ ہوتی ہے چونکہ طرز پیداوار سماجی زندگی کی بنیاد ہے اس لیے تاریخ کو پیداوار کی ترقی کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ فلسفہ تاریخ، تاریخ کو ایک وسیع نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور ان فکری موضوعات کو ڈھونڈ کر لاتا ہے جو تاریخی واقعات کی تہہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں مثلاً" عبرت کا احساس پیدا کرنا، کامیابی و ناکامی کا تصور، عروج د زوال، خدا کے منصوبوں کی تکمیل، تقدیر و حالات کی قوت، افراد کی عظمت خیر و شر کا تصادم، قوموں د نسلوں کی برتری انسان اور فطرت کا تصادم اور انسان کی فطرت کا تغیر و تبدل۔

ان موضوعات کے ذریعے فلسفہ تاریخ ان قوانین کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو تاریخی واقعات کی تہہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں یا ان منصوبوں کی تلاش کرتا ہے جنہیں مکمل کرنے کا کام تاریخ کررہی ہے لیکن فلسفہ تاریخ ان گوناگوں پہلوؤں کو دریافت کرنے کے باوجود اب تک تاریخی قوانین اور ضابطوں کو متعین نہیں کرسکا ہے اور نہ ہی اس بارے میں کچھ بتا سکا ہے کہ کیا تاریخ سیدھی لائن میں ترقی کرتے ہوئے بڑھ رہی ہے یا لائن سیدھی نہیں خمدار ہے اور یا یہ کہ تاریخ ایک دائرہ میں گردش کررہی ہے؟ جب یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ ایک دائرہ میں گردش کررہی ہے تو یہ تصور ترقی کی نفی کرتا ہے۔

کیونکہ تاریخ کا بار بار اس چیز کو دہراتا اور نپے تلے و متعین راستے پر چلنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ تاریخ اس دائرہ میں مقید و گرفتار ہے اور اس سے باہر نکلنا اس کے اختیار میں نہیں----- اس لیے تاریخ میں ترقی کے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے یہ کہا گیا کہ یہ سیدھی لائن میں برابر آگے کی جانب بڑھ رہی ہے، اس کا آگے کی جانب بڑھنا ترقی کی علامت ہے لیکن اس ترقی کے نظریہ میں خرابی یہ ہے کہ یہ تاریخ کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو نظرانداز کردیتے ہیں اس لیے اس نظریہ کو فروغ ہوا کہ تاریخ ایک خمدار لائن پر جارہی ہے اس کے راستہ میں رکاوٹیں بھی آتی ہیں پرانی د نئی روایات میں تصادم بھی ہوتا ہے اور رجعت پرستی و ترقی پسند قوتوں کی کشمکش کے بعد یہ آگے کی جانب بڑھتی ہے۔

تاریخ اور فلسفہ تاریخ دونوں ماضی کے واقعات کا تجزیہ کرکے انسانی فہم و ادراک میں نہ صرف اضافہ کرتے ہیں بلکہ اسے شعور د آگہی بھی دیتے ہیں جس سے حال اور مستقبل کو سنورنے میں مدد ملتی ہے۔

تاریخ میں گردش کا نظریہ

تاریخ کے عمل اور حرکت کو چار طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے۔

پنڈولم (PENDULAM)

آرا (SEESAW)

پہیہ (WHEEL)

اور تیر (ARROW)

جب تاریخ پنڈولم کی صورت میں حرکت کرتی ہے اس کا مطلب ہے کہ ایک نظام قائم ہوتا ہے اور جب اس کی خرابیاں ظاہر ہوتی ہیں تو لوگ اس سے بد دل ہوجاتے ہیں اور اس کی جگہ دوسرے نظام کو قائم کرتے ہیں اس طرح ایک کے بعد دوسرا نظام آتا ہے۔ تبدیلی ہوتی رہتی ہے مگر اس عمل اور حرکت میں کسی مسئلہ کا حل ممکن نہیں ہوتا ہے۔

آرے کی شکل میں جب تاریخ حرکت کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی تہذیب اپنی صلاحیتیں ایک خاص وقت اور مدت میں ختم کردیتی ہے اور پھر دوبارہ اس میں یہ صلاحیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ قوموں کا عروج و زوال اور تہذیبوں کی زندگی موت کا سبب اسی حرکت اور عمل کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔

تاریخ جب پہیہ کی صورت میں ایک دائرے میں گردش کرتی ہے تو یہ آرے اور پنڈولم کی طرح صرف دو سمت میں حرکت نہیں کرتی بلکہ ایک محدود دائرے میں مسلسل چکر لگاتی رہتی ہے اور اس کی یہ گردش پورے دائرے میں ہوتی ہے تاریخ کی یہ حرکت' ان تینوں صورتوں میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ماضی اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ واقعات و تاریخی حادثات بار بار ہوتے رہتے ہیں لیکن تیر کی علامت تاریخ میں ترقی کے نظریہ کو ظاہر کرتی ہے کہ تہذیب جمع شدہ روایات کو لے کر برابر آگے کی جانب بڑھ رہی ہے اور انسانی تہذیب ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔

تاریخ میں گردش کا نظریہ سب سے قدیم ہے کیونکہ انسان کا فطرت سے گہرا تعلق رہا ہے اور اس تعلق کی وجہ سے اس نے فطرت سے کچھ سیکھا' موسموں کی تبدیلی خزاں اور اس کے بعد بہار کا آنا سورج کا نکلنا اور غروب ہونا چاند کا آہستہ آہستہ مکمل ہونا اور پھر اسی آہستگی کے ساتھ گھٹتا جانا رات کی تاریکی کا چھٹنا اور صبح کا ظاہر ہونا اور پھر خود انسان کی

زندگی میں پیدائش و موت کا چکر ان سب نے اسے گردش کے نظریہ سے روشناس کرایا۔
جب انسان نے تاریخی واقعات کو حافظہ میں محفوظ کرنا شروع کیا تو اس نے محسوس کیا کہ کچھ واقعات و حادثات ایسے ہیں جو بار بار وقوع پذیر ہوتے ہیں سلطنتیں و حکومتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں' قومیں تہذیبیں' تمدن اور ثقافتیں عروج و زوال سے دوچار ہوتی ہیں اس لیے اس نے گردش کے اس نظریہ پر تاریخ میں کسی ایسے منصوبے کی تلاش شروع کی جس کی بنیاد پر وہ تاریخ میں بار بار ہونے والے واقعات کی تعبیرو تفسیر پیش کرسکے۔

گردش کے اس نظریہ کو دو تین چار یا اس سے بھی زیادہ الفاظ کے آہنگ میں پیش کیا جاسکتا ہے جیسے عروج و زوال' جنگ و امن' موت و زندگی' خزاں و بہار اس میں تین الفاظ کے آہنگ بھی آسکتے ہیں جیسے پیدائش' ارتقاء اور زوال' قدیم' قرون وسطی اور جدید دعویٰ' ضد دعویٰ اور ترکیب یا چار الفاظ کا آہنگ جیسے بچپن' جوانی شباب اور ضعیفی۔

ابن خلدون پہلا مفکر تھا جس نے تاریخ میں گردش کے نظریہ کو پیش کیا لیکن اس نے اپنے مطالعہ کو سلطنتوں اور حکمران خاندانوں نے عروج و زوال تک محدود رکھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک خاندان قبائلی عصبیت کی بنیادوں پر متحد ہو کر اقتدار حاصل کرتا ہے اور پھر جیسے جیسے قبائلی عصبیت کمزور ہوتی جاتی ہے اس کا زوال اسی طرح ہوتا رہتا ہے اس نے ایک سلطنت کے عروج و زوال کی مدت 40 سال رکھی ہے اور اس کا حساب اس طرح لگایا ہے کہ پہلی نسل اور اس کا سربراہ سلطنت کی بنیاد رکھتے ہیں دوسرا اس کو عروج پر پہنچاتا ہے اور اس کے بعد تیسرا اور چوتھا محض تقلید کرتے ہیں چار نسلوں کے بعد سلطنت زوال پذیر ہوجاتی ہے اس کی مثال وہ ایک آدمی کی زندگی سے دیتا ہے جو پیدائش' بچپن' جوانی اور بڑھاپے سے گزر کر بالاخر موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے اس لیے پیدائش و موت وہ چکر ہے جس کے دائرے میں سلطنتیں اور حکومتیں گھوم رہی ہیں۔

ابن خلدون کے بعد اطالوی مفکر ویکو نے گردش کے نظریہ کو نئے سرے سے پیش کیا اس نے کہا کہ انسانی معاشرے کی بنیاد اور اس کا پورا ڈھانچہ انسان کی اپنی تشکیل ہے جو اس نے اس مرحلہ سے شروع کیا جب کچھ نہ تھا اس لیے معاشرے کی تشکیل و تنظیم اور ترتیب کی تمام جزویات انسان کے ذہن میں پوشیدہ ہیں ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی ذہن کو سمجھا جائے۔

اس کے بعد ویکو نے انسانی تاریخ میں مختلف معاشروں کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے اور

ان ادوار کا تجزیہ کیا ہے جن سے معاشرے گذرے۔

دیوتاؤں کا زمانہ

عظیم انسانوں (HEROES) کا زمانہ

عام انسان کا زمانہ' جب کہ اس نے ان عظیم اور مافوق الفطرت شخصیتوں سے چھٹکارا پایا اور خود پر اعتماد کرنا شروع کیا۔

تاریخ میں ادوار کی تقسیم سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ انسانی معاشرہ اس عمل میں انتشار سے تنظیم کی جانب اور وحشیانہ بربریت سے عقل و تہذیب کی جانب بڑھتا ہے اور اس کے نتیجہ میں صنعت کاشتکاری پر' نثر شاعری پر اور امن جنگ پر فوقیت حاصل کرلیتی ہے جب کوئی معاشرہ اس دائرہ کو مکمل کرلیتا ہے تو اس کا نیا دور پھر دور وحشت سے شروع ہوتا ہے۔

ویکو کے گردش کے نظریہ میں تاریخ سیدھے طریقہ سے ان متعین درجوں میں اپنے آپ نہیں دھراتی بلکہ یہ گردش خمدار (SPIRAL) ہوتی ہے اس لیے تاریخ اپنے آپ کو اس مشکل میں نہیں دھراتی بلکہ ہر گردش میں اس کا راستہ اور رفتار مختلف ہوتی ہے اور ہر بار وہ ایک نئی طاقت سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔

انیسویں صدی کے ایک روسی مفکر ڈینی لووسکی نے تاریخ میں گردش کے نظریہ کو ایک نئے انداز سے پیش کیا وہ انسانی تہذیب و تمدن کے اتار چڑھاؤ کو انسانی زندگی سے تشبیہ دیتا ہے جو پیدائش سے لے کر مرحلہ بہ مرحلہ بڑھتا ہے اور آخر میں یقینی طور پر مر جاتا ہے۔

ہر تمدن کی زندگی میں تین ادوار ہوتے ہیں۔

1- جب تمدن تشکیل کے عمل میں ہوتا ہے اور ایک منظم شکل اختیار کرلیتا ہے۔

2- دوسرا دور تمدن کا درمیانی دور ہوتا ہے اس میں ثقافت و سیاست کی ابتداء ہوتی ہے اور معاشرہ اپنی تخلیقی قوتیں جمع کرلیتا ہے۔

3- تیسرا دور شباب کا ہوتا ہے اس میں معاشرہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی مدد سے عروج تک پہنچتا ہے لیکن دور شباب سب سے زیادہ مختصر ہوتا ہے۔ اور اس دور میں تہذیب و تمدن معاشرے کی تمام صلاحیتوں کو نچوڑ کر ختم کردیتا ہے۔ اس زوال کی حالت میں تمدن بے جان ہوجاتا ہے۔

آگے چل کر گردش کے نظریہ کو ہیگل' پارے ٹو (PARETO) بروکس ایڈمس (BROOKS ADAMS) اشپنگلر' ٹائن بی اور سوروکن (SOROKIN) نے پیش کیا ان مفکرین کے ہاں تاریخ کا مفہوم وسیع ہوگیا ہے اس لیے انہوں نے تاریخ میں گردش کے عمل کو واضح طریقے سے پیش کیا ہے۔

ہیگل نے اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ انسانی معاشرے اور فطرت کے عمل میں فرق ہے فطرت ایک ہی قسم کی گردش میں رہتی ہے اس لیے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا' مثلاً" روز سورج نکلتا ہے اور غروب ہوجاتا ہے دن رات آتے و جاتے ہیں۔ موسموں کی تبدیلی متعین وقت پر ہوتی ہے لیکن گردش اس عمل سے کائنات میں تبدیلی نہیں آتی جبکہ انسانی معاشرہ جن ادوار اور مرحلوں میں گردش کرتا ہے اس کے نتیجہ میں تبدیلی آتی ہے اور یہ تبدیلی ترقی کی شکل میں نمودار ہوتی ہے وہ اس گردش کو دعویٰ (THESIS) ضد دعویٰ (ANTITHESIS) اور ترکیب (SYNTHESIS) کہتا ہے۔ ایک نظریہ پیدا ہوتا ہے پھر اس میں داخلی تضادات ابھرتے ہیں اور ان کی کش مکش کے نتیجہ میں ایک امتزاج تخلیق ہوتا ہے اس امتزاج سے جس نظریہ اور فکر کی پیدائش ہوتی ہے وہ دوبارہ سے اسی کشمکش کے عمل سے گزرتی ہے اس طرح تاریخ ایک نہ ختم ہونے والے خمدار دائرے میں چلی جارہی ہے۔

پارے ٹو (PARETO) کے ہاں تاریخی گردش تین ادوار میں ہوتی ہے۔

1- حادثاتی
2- مختصر مدت کا دورہ
3- طویل مدت کا دورہ

حادثاتی دورہ وقتی حادثات اور واقعات کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے 1848ء کا انقلاب یا 1870ء کی جنگ چونکہ ان کی وجوہات وقتی ہوتی ہے اس لیے ان کے اثرات بھی وقت ہوتے ہیں۔ پارے ٹو نے تاریخ میں سماجی عمل کے بجائے' اقتصادی عمل اور اس گردش کو اجاگر کیا ہے اس کے نزدیک یہ اقتصادی دورے اعلیٰ طبقہ کی رہائش' ان کے اطوار اور ان کے عمل پر مبنی ہوتے ہیں ان کے ہاں اعلیٰ طبقہ کی گردش کا نظریہ بڑا اہم ہے اس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ جس طرح انسان جسمانی عقلی اور فنی صلاحیتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے چونکہ طبقہ اعلیٰ میں یہ صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں اس

لیے وہ معاشرہ کی سطح سے اوپر ہوتا ہے اور دوسرے طبقوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر طبقہ اعلیٰ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ممتاز ہوتا ہے تو پھر تاریخ میں اس ذلت آمیز زوال کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب اس کے ہاں بڑا اہم ہے وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ طبقہ امراء تاریخ میں ہمیشہ عروج پر نہیں رہا اور کسی نہ کسی مرحلہ پر وہ تاریخ سے روپوش ہوگیا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ مثلاً" جب تک معاشرے میں مقابلہ کی جنگ ہوتی ہے اس میں باصلاحیت افراد کامیاب ہوتے ہیں اعلیٰ طبقہ جب ایک مرتبہ اپنی حیثیت کو مضبوط کرلیتا ہے اور معاشی ذرائع پر قابض ہوجاتا ہے تو وہ خود کو دوسرے طبقوں سے جدا کرکے علیحدہ ہوجاتا ہے اس طرح اس میں نیا خون شامل نہیں ہوتا اور وہ آہستہ آہستہ کمزور و خستہ ہوتا چلا جاتا ہے اور بالاخر اپنے مخالفین کے ہاتھوں ختم ہوجاتا ہے۔

دوسری صورت میں امراء کا طبقہ مقابلہ کے لیے ہمت' طاقت اور تشدد کو اختیار کرتا ہے جب اس میں سرمایہ دار شامل ہوتا ہے تو وہ دھوکہ اور سازش استعمال کرتا ہے اس کی وجہ سے سماجی تعاون بگڑتا رہتا ہے اور نچلے طبقے کے لوگ اعلیٰ طبقہ میں شامل ہوتے رہتے ہیں اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ نچلے طبقہ میں جاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اعلیٰ طبقہ نچلے طبقے کے ہاتھوں شکست تسلیم کرلیتا ہے۔

اشپینگلر نے پہلی مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ تاریخ کے ذریعہ واقعات کا تعین کرلے اور تاریخی عمل سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کی نشاندہی کرے اس نے دنیا کی 8 بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کیا جنھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر موت تک کی گردش پوری کی اس نے ان تہذیبوں کا ذکر نہیں کیا جو اس گردش کو پورا نہیں کرسکیں اور ابتدائی یا درمیانی درجہ و مرحلہ پر ختم ہوگئیں۔

اشپینگلر ان تہذیبوں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تہذیبیں نہ تو خدا کی مرضی سے گردش کرتی ہیں اور نہ انسان کی خواہش سے بلکہ اس تاریخی عمل کے پس منظر میں کچھ ایسی پراسرار قوتیں ہیں جو تہذیب کو بلندی تک لے جاتی ہیں اور پھر اسے زوال پذیر کرکے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کردیتی ہیں وہ تہذیب کی گردش کی مدت ایک ہزار سال مقرر کرتا ہے جس میں ہر تہذیب اپنے ابتدائی زمانہ سے موسم گرما' خزاں' سرما میں گردش کرتی ہوئی ختم ہوجاتی ہے اپنے اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دوسری

تہذیبوں کی طرح مغربی تہذیب بھی زوال کے عمل سے گزر رہی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس زوال کو تسلیم کرلینا چاہئے۔ اور ایک یونانی ہیرو کی طرح موت کے لیے تیار رہنا چاہئے۔

اسپنگلر نے تہذیبوں کا مطالعہ حیاتیاتی (BIOLOGICAL) نقطہ نظر سے کیا ہے اس کے ہاں تاریخ اور تقدیر لازم و ملزوم ہیں انسان اس تاریخی عمل کو نہ تو روک سکتا ہے اور نہ ہی تبدیل کرسکتا ہے۔

بروکس ایڈمس (BROOKS ADAMS) نے انسانی معاشروں کی گردش کے جو راستے متعین کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

معاشرہ دور وحشت اور دور تہذیب کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے ابتدا میں معاشرہ بکھیرا ہوا ہوتا ہے بعد میں یہ خود کو متحد کرلیتا ہے جب یہ بکھری حالت میں ہوتا ہے تو اس وقت یہ مذہبی اور فوجی کارنامے سرانجام دیتا ہے لیکن جیسے جیسے یہ مستحکم ہوتا جاتا ہے تو اس میں تجارت، دولت اور نفع کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور یہ اوصاف بہادری اور شجاعت کی جگہ لے لیتے ہیں اس کی ذہنیت میں لالچ رچ بس جاتی ہے اور سرمایہ سب پر اقتدار حاصل کرلیتا ہے آخری دور استحکام میں معاشی و سائنسی ذہانت کا چرچا ہوتا ہے جب کہ تخیل، جذبات، بہادری اور فنون لطیفہ کی صلاحیتیں زوال پذیر ہوجاتی ہیں - بہادری کی صلاحیتیں پیسہ کمانے کی جگہ لے لیتی ہیں اور ذاتی عنصر کی جگہ عقلیت آجاتی ہے۔

اس کی مثال مغربی تہذیب کا موجودہ دور ہے جس میں شاعری کی شگفتگی ختم ہوچکی ہے ڈرامہ مرچکا ہے اور تجارت کے پرستار آرٹ کی خوبصورتی سے بے خبر ہوچکے ہیں۔

اشپنگلر اور بروکس ایڈمس نے مغربی تہذیب کو زوال پذیر تہذیب قرار دیا تو اس پر سوالات پیدا ہوئے کہ کیا واقعی مغربی تہذیب زوال پذیر ہے؟ اور اگر ایسا ہے کیا یہ بھی دوسری تہذیبوں کی طرح موت سے ہم کنار ہوجائے گی؟ اور کیا اسے موت سے بچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

پہلی جنگ عظیم سے مغربی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور یہ تصور مقبول ہورہا تھا کہ انسان نے جنت ارضی کی تشکیل کرلی ہے لیکن جنگ نے ان تمام تصورات کو پاش پاش کردیا اور اہل مغرب کے سامنے یہ تلخ حقیقت آئی کہ مغربی تہذیب بھی اس زوال سے دوو چار ہونے جارہی ہے جس کا شکار قدیم تہذیبیں ہوچکی ہیں اس لیے ٹائن بی نے اس

افسردگی اور مایوسی کے ماحول میں اس بات کی کوشش کی کہ وہ دنیا کی تہذیبوں کے مطالعہ کے بعد کوئی راستہ تلاش کرے کہ جس کے ذریعہ مغربی تہذیب کو بچایا جاسکے اس کے نظریہ گردش میں حیاتیاتی یا نامیاتی ارتقائی اور عیسائی نقطہ نظر شامل ہیں اس کے نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ خدا تاریخ کو کس مقصد کے تحت بناتا ہے؟ تو اس کا جواب ٹائن بی کے ہاں اس طرح سے ہے کہ یہ جاننا ہمارے لیے ناممکن ہے اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ تصوف اور وجدان کا ہے جس کے ذریعے اس کائنات کی تخلیق کا مقصد جانا جاسکتا ہے۔ چونکہ خدا نے تاریخ انسانوں کے ذریعہ بناتی ہے اس لیے انسان کو سمجھ کر خدا کے منصوبہ کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

ٹائن بی دنیا کی تہذیبوں کو تین درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔

1- وہ تہذیبیں جو اپنے ابتدائی دور میں ختم ہوگئیں۔

2- وہ تہذیبیں جو ایک جگہ پر آکر جامد ہوگئیں۔

3- وہ تہذیبیں جو مرحلہ بہ مرحلہ اور درجہ بہ درجہ بڑھیں اور نشو ونما ترقی کے بعد ختم ہوگئی۔

ٹان بی اس بات کی جانب نشاندہی کرتا ہے کہ تہذیب کی ترقی اور اس کے عروج میں چیلنج اور اس کے جواب کو دخل ہوتا ہے اگر تہذیب ارضی و سماوی سماجی و معاشی اور سائنسی و چیلنجوں کا موثر جواب نہیں دیتی تو ایسی تہذیب ختم ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد وہ تہذیب کی ترقی میں تخیلی شخصیت کو اہمیت دیتا ہے یہ عظیم شخصیتیں' صوفی' پیر' پیغمبر' شاعر' جنرل' سیاستدان' مورخ اور فلسفی ہوتے ہیں جو کہ تہذیب کو تخلیق کرتے ہیں اور پھر اسے ترقی دیتے ہیں۔ عوام کا کام محض تقلید کرنا ہوتا ہے۔ تہذیب کی ترقی اس وقت رک جاتی ہے جب تخلیقی اقلیت اور تخلیقی شخصیت غلطی پر غلطی کرتی ہیں اور چیلنج کا موثر جواب نہیں دے سکتیں۔ جس کے نتیجہ میں عوام پرانی اقدار اور روایات کی تقلید کرنے لگتے ہیں اس وقت تمدن ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے عمل سے دوچار ہوجاتا ہے کیا تہذیب کو اس مرحلہ پر زوال سے روکا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب ٹائن بی یہ دیتا ہے کہ اگر فرقہ بندی اور اختلافات ختم ہوجائیں تو اس صورت میں زوال کا عمل رک سکتا ہے اور تہذیب ایک جگہ مستقل طور پر ٹھہر سکتی ہے۔

اس تجزیہ کے بعد وہ مغربی تہذیب کو مشکلات کے دور میں دیکھتا ہے جو کہ زوال پذیر

تہذیب کا آخری دور ہوتا ہے اس آخری عہد میں معاشرہ باہمی جھگڑوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ تخلیقی اقلیت بااقتدار ہوجاتی ہے مذہب کا زوال ہوجاتا ہے۔ صنعتی ترقی اور جمہوریت مغربی تہذیب کے دو اہم عنصر ہیں جو اسے زوال کی جانب لے جارہے ہیں۔ صنعتی ترقی کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مزدور یا تو مشین ہوجائیں گے یا بے روزگار اور یہ صنعتی ترقی خدا کی جگہ دولت کو دے دے گی' جمہوریت روحانی تنزل کی جانب لے جائے گی کیونکہ ثقافت جب عوام تک پہنچ جائے تو وہ زوال پذیر ہوجاتی ہے لہٰذا ٹائن بی کے نزدیک مغربی تہذیب کے زوال کو روکنے کا واحد علاج مذہب کے احیاء میں ہے۔

سوروکن تاریخ عمل کو دو مرحلوں میں گردش کرتا ہوا دیکھتا ہے۔ مثالی (IDEATIONAL) اس کے اثرات مثبت ہوتے ہیں حسی (SENSATE) جس کے اثرات منفی ہوتے ہیں ہر تہذیب ان دودائروں میں گردش کرتی ہے۔

مثلاً" یونانی تہذیب 6 صدی ق۔ م سے پہلے مثالی تھی لیکن 4 صدی ق۔ م پر یہ حسی ہوگئی ہے۔ جب ایک حسی تہذیب اپنے دائرہ کو پورا کرلیتی ہے تو وہ اس وقت تبدیلی کے عناصر جو ہر تہذیب میں ہوتے ہیں وہ ایک نئی تہذیب کو جنم دیتے ہیں۔

اشپینگلر اور ٹائن بی کی طرح سوروکن نے بھی مغربی تہذیب کو حالت زوال میں دیکھا ہے۔ اس زوال کی علامتیں یہ ہیں کہ معاہدے اور عہد نامے اپنی طاقت کھو رہے ہیں اخلاقی قدروں کی جگہ سازش اور دھوکہ دہی لے رہی ہے اکثریت کے لیے آزادی خواب بن گئی ہے جب کہ اقلیت کے لیے یہ آزادی بے لگام ہے ان حالات میں آمرانہ ذہن کے سازشی لوگ طاقت میں آرہے ہیں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو یہ عوام کو روٹی کی جگہ بم دیں گے اور معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔

تاریخ میں گردش کے نظریات نے مایوسی اور ناامیدی پیدا کی کیونکہ تاریخ کی اس حرکت اور عمل میں ہر تہذیب اور معاشرے کو زوال سے دوچار ہونا لازمی ہوگا۔ یہ انسانی تہذیب کو ایک ایسے چکر اور گردش میں مبتلا رکھتی ہے کہ جس میں نجات کا کوئی راستہ نہیں یہ نظریہ نظام جاگیرداری سرمایہ داری کو قائم رکھنے میں بھی مدد دیتا ہے تاریخ میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اور نہ ہی ابدی اور آفاقی قدروں کو تبدیل کرکے اپنی قسمت و تقدیر کا مالک ہوسکتا ہے۔

اس لیے گردش کے نظریات کی روشنی میں انسانی تاریخ اور تہذیب و تمدن کی ترقی اور تاریخی تبدیلی کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخ کا مذہبی نظریہ

فطرت نے انسان کی زندگی اور تاریخ میں اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ اس کے حسن، خوبصورتی، دلکشی، جاذبیت اور مظاہر نے انسان میں غور و فکر کی عادات پیدا کیں اور فطرت کی تنہائیوں میں مراقبہ کے ذریعہ اس میں قوت برداشت پیدا ہوئی فطرت نے انسان کی اندرونی خلفشار اس کے صدمات اداسیوں اور غموں کو دور کر کے اس میں سکون و طمانیت پیدا کی۔ فطری مظاہر جن میں درخت پھل پھول، پرندے دریا، پہاڑ اور آبشار آتے ہیں ان سے انسان نے عملی زندگی میں کامیابی کے تجربات سیکھے فطرت اور انسان کا یہ رشتہ ایک دوست و دشمن اور غمخوار و ہمدرد دونوں کا رہا اگر ایک طرف فطرت کی آفات اس کے لیے تباہی و بربادی لاتی رہیں تو دوسری جانب اسے زندگی کی نعمتیں بھی مہیا کرتی رہیں اس لیے فطرت انسان کے لیے ہمیشہ سے ایک پراسرار ان جانی اور نہ سمجھ میں آنے والی ہستی رہی ہے۔

چونکہ انسان کے قدیم مذاہب بھی فطرت کی پیداوار تھے اس لیے اس کے لیے فطرت دیوتاؤں کا خارجی مظہر تھی وہ فطرت سے ڈرتا تھا اس سے خوفزدہ رہتا تھا اور اس کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے اس میں جھجک اور ڈر تھا، چاند سورج درخت اور جانور اس کے لیے پراسرار قوتیں تھیں فطری حوادثات اس کی سمجھ اور عقل سے بالاتر تھے، طوفان، زلزلے اور وبائیں وہ قوتیں تھیں جن کے آگے انسان خود کو مجبور اور بے بس سمجھتا تھا فطرت ہی نے انسان کو گردش کے نظریہ سے روشناس کرادیا جس کی وجہ سے تاریخ کا یہ نظریہ پیدا ہوا کہ انسانی تاریخ ایک دائرہ میں محو گردش ہے اور حالات و واقعات خود کو بار بار دہرا رہے ہیں۔

جب تک انسان یہ سمجھتا رہا کہ حالات و واقعات پر اس کا کوئی اختیار نہیں اور وہ وقت کے دھارے کے آگے بے بس اور مجبور ہے اس وقت تک اس کے علم و شعور نے ترقی نہیں کی اور نہ ہی فطرت کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ ہوا چونکہ انسان کو اپنی قوت و طاقت پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے فطرت کی برتری مانتے ہوئے گردش کے نظریہ میں پناہ لے لی اور اسی گردش میں اپنے نروان کی راہیں تلاش کرتا رہا۔

جب یہودیوں کے مذہب میں ایک ان جانے خدا کا تصور ابھرا جو نظر تو نہیں آتا تھا

مگر ہر جگہ موجود رہتا تھا' وہ لوگوں کی نیکیوں پر انہیں انعام دیتا اور برائیوں پر سزا تو اس سے اس عقیدہ نے جنم لیا کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے وہ پوری کائنات کامالک ہے اس لیے فطرت بھی خدا کی تخلیق کردہ ہے اس کا نظام بھی خدا کی مرضی و منشاء کے مطابق چلتا ہے۔ اور تاریخی عمل ایک مقصد کے تحت ہو رہا ہے خدا کا اس کائنات کو چلانے کا ایک منصوبہ ہے اس کا ایک متعین مقصد ہے اور تاریخ اس منصوبہ اور مقصد کو پورا کر رہی ہے اس سے ایک بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ قدیم مذاہب جو فطرت کی پیداوار تھے ان میں تاریخ کو فطرت کا ایک حصہ بتایا گیا ہے اب فطرت تاریخ کا ایک حصہ بن گئی اس لیے اب تک فطری حوادثات مثلاً" قحط' زلزلے' سیلاب' طوفان اور وبائیں جو انسان کی عقل و فہم سے بالا تر تھے مذہب نے ان کی توجیح فراہم کردی کہ یہ آفات خدا کی جانب سے انسان کے گناہوں کی پاداش میں آتے ہیں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کی وجہ سے انسان نے تمام جسمانی و ذہنی اذیتوں کو چاہے وہ فطری حادثات کے نتیجہ میں آئیں یا سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے اس لیے برداشت کرلیا کہ یہ خدا کی جانب سے اس کا امتحان لینے کی غرض سے ہیں اور ان میں اس کی بھلائی پوشیدہ ہے اگر وہ ان اذیتوں کو برداشت کرنے میں ثابت قدم رہا تو اسے اس دنیا میں آخرت میں اس کا اجر عظیم ملے گا۔

خدا تعالیٰ تاریخ کے ذریعہ جن منصوبوں کی تکمیل کررہا ہے یہ منصوبے انسان کے منصوبوں سے مختلف ہوتے ہیں انسان جو چاہتا ہے اسے وہ اپنے عمل سے پورا نہیں کرسکتا ہے بلکہ وہ غیر شعوری طور پر خدا کے منصوبوں کو پورا کرتا ہے اس لیے قدرت کچھ شخصیتوں کے ذریعہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کرتی ہے اس غرض کے لیے ان شخصیتوں میں اعلیٰ صفات پیدا کردی جاتی ہیں اور یہ اس سرزمین پر خدا کے نمائندے بن کر جاہل اور ناسمجھ انسانوں کی راہنمائی کرتی ہیں ان میں پیغمبر حکمران سیاستدان' فوجی جنرل' مفکر اور دانش ور آجاتے ہیں۔

ہیگل کے نزدیک دیکھنے میں تو بظاہر یہ شخصیتیں اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرنے اور ان کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتی ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے منصوبے پورے کرتی ہیں جس کا انہیں علم نہیں ہوتا۔ یہ قدرت کی چالاکی ہے کہ وہ انہیں ایسا کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔

چونکہ ان شخصیتوں کے سامنے سب سے بڑا مقصد منصوبہ کی تکمیل ہوتا ہے اس

لیے انہیں یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جو چاہیں ذرائع استعمال کریں یہ شخصیتیں عام قوانین سے بالاتر ہوتی ہیں اور ان پر عام اخلاقیات کا اطلاق نہیں ہوتا وہ ہر وہ کام صحیح کرتے ہیں جو ان کے مقاصد کو پورا کرنے میں مددگار ہوتا ہے مذہب کا یہ پہلو ہر ظالم و جابر اور غاصب حکمران کو عوام پر ظلم و جبر کے ذریعہ حکومت کرنے اخلاقیات کو پامال کرنے اور اپنے ذاتی اقتدار کو مستحکم رکھنے کو جائز قرار دیتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ قدرت کی جانب سے لوگوں کو ان کے اجتماعی گناہوں کی سزا دینے آیا ہے اور وہ قدرت کا قہر ہے۔

مشہور عیسائی مبلغ اور مذہبی راہنما سینٹ آگسٹائن نے تاریخ میں گردش کے نظریہ کی مدد سے مذہبی نظریہ کو ایک نئی جہت دی اس نے اپنی مشہور کتاب خدا کا شہر (OF GOD CITY) میں کہا ہے کہ خدا نے دو شہر بنائے ہیں ایک نیکی کا اور دوسرا بدی کا اگرچہ ان دونوں شہروں میں زندگی ایک جیسی پائی جاتی ہے مگر ان میں روحانی فرق ہوتا ہے انسان کی زندگی نیکی اور بدی کے درمیان کشمکش کی حالت میں گزر جاتی ہے اور یہی پوری انسانی تاریخ ہے اس تصادم کے انجام میں اگر نیکی کامیاب ہوگئی تو انسان کو نجات مل جائے گی اور اگر بدی فتح یاب ہوئی تو انسان ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہوجائے گا لیکن آگسٹائن نے کہا ہے کہ اس تصادم میں فتح نیکی کی ہوگی اور خدا اپنے نیک بندوں کو اپنی نعمتوں سے نوازے گا۔

اس نظریہ میں مادی فوائد اور اس کے لیے جدوجہد کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ کوئی مادی چیز نیکی کا باعث نہیں ہوتی یہ دنیا مادی دنیا ہے اور اگلی دنیا کے لیے تیاری کا ایک لمحہ ہے اس وجہ سے اس انسانوں میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ وہ اس دنیا کو بہتر بنانے کی جدوجہد کریں' ذہن کو جلا بخشیں اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کریں۔

تاریخ کے مذہبی نظریہ کے تحت تاریخ کسی دائرہ میں گردش نہیں کرتی بلکہ یہ سیدھی لکیر کی طرح آگے کی جانب جاتی ہے اس لیے تاریخ کی ایک ابتداء درمیان اور انتہاء ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر اپنے انجام تک پہنچ جائے گی اور تاریخ کا آخری انجام (FINALEND) ہوگا خدا کا جب یہ آخری منصوبہ پورا ہوجائے گا تو یہ تاریخ کی انتہا ہوگی۔

تاریخ کا یہ آخری منصوبہ پورا ہوگیا ہے یا مستقبل میں کسی دور میں پورا ہوگا۔ ہیگل کے ہاں یہ تاریخ کا آخری منصوبہ ہوگا۔ جب کہ کومے (COMIE) کے ہاں اس کے اپنے

زمانہ میں یعنی اٹھارویں و انیسویں صدی میں تاریخ اس آخری مرحلہ میں داخل ہورہی تھی۔ مسلمانوں کے نزدیک خدا کا یہ منصوبہ پیغمبر کے اور خلفاء کے دور میں مکمل ہوگیا تھا کیونکہ انہوں نے ایک مثالی معاشرہ قائم کردیا تھا جس میں اب کسی اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی اس لیے تاریخ صرف اس منصوبہ کو جو وقت کے ساتھ مسخ ہوگیا ہے بہتر بنانے کی کوشش کرے اور یہ کام احیاء کی تحریکوں کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

تاریخ میں مذہبی نظریہ نے انسان کی اپنی جدوجہد اور کارناموں کو جو اس نے اپنی بقا اور زندگی کے لیے کیے تھے اس سے انکار کرکے اس کی تمام کامیابیوں اور کارناموں کو خدا سے منسوب کردیا اور انسان اس کے بعد سے تاریخی عمل میں ایک مہرہ کی مانند ہوگیا جو بغیر سوچے سمجھے اور بغیر شعور کے خدا کے منصوبوں کی تکمیل کررہا ہے۔

اس نظریہ نے انسان کی جڑیں فطرت سے بھی کاٹ دیں کیونکہ اب فطرت خدا کا مظہر بن گئی اور اس کی نعمتیں خدا کی خوشی اور اس کی آفات خدا کا قہر ہوگئیں اب انسان کو فطرت کے رازوں سے پردہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں رہی کیونکہ یہ تمام عمل خدا کی مرضی سے ہورہا ہے اس لیے اس راز کو پانے کے بعد کسی دوسرے راز کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

چونکہ اس نظریہ میں انسان مجبور محض اور لاچار ہے اس لیے یہ نظریہ جمود کی جانب لے جاتا ہے۔ جس میں کسی جدوجہد اور کوشش کی ضرورت نہیں اگر انسان اپنے عمل سے کائنات میں ٹھہراؤ یا نظام میں تبدیلی لاتا ہے تو اس کا یہ عمل خدا کے خلاف بغاوت تصور کیا جاتا ہے کہ خدا کے نظام میں خلل ڈال کر وہ اس کے منصوبوں کو بگاڑ رہا ہے۔

جب تک انسان یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی تاریخ خود بناتا ہے اس وقت تک وہ تاریخ عمل کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھتا تھا اور اگر اس میں کوئی خرابی دیکھتا تھا اس کا قصور وار انسان ہی کو ٹھہراتا تھا مگر اب جبکہ تاریخ بنانے کا کام خدا کے سپرد ٹھہرا تو اس کے لیے اس میں کوئی خرابی ڈھونڈنا اور واقعات و حالات کا تنقیدی تجزیہ کرنا ممکن نہیں رہا اس لئے اس نظریہ کے تحت تاریخی واقعات کو بغیر تجزیہ کئے صحیح تسلیم کرلیا گیا۔

تاریخ میں ترقی کا نظریہ

تاریخ میں گردش کے نظریات نے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ کیا انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ ایک دائرے میں محو رقص رہے؟ اور کیا یہ ایک اذیت ناک عمل نہیں ہے کہ انسان اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے باوجود مقدر کے متعین راستے کے چکر میں مبتلا رہے اور اسے نجات کا کوئی راستہ نہیں ملے اگر انسان ایک دائرے میں گردش کررہا ہے تو پھر انسانی تہذیب کے نشو ونما اور ترقی کو کس طرح سمجھا جائے اور اگر موت و زندگی' عروج و زوال اور بلندی و پستی کا یہ زیر و بم انسان کے عمل میں آہنی زنجیریں ڈال چکا ہے تو پھر انسان کی تمام محنت اور جدوجہد بے معنی ہوجاتی ہے تاریخ کے مطالعہ سے یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ کیا انسان نے خود کو تقدیر کے حوالے کردیا ہے یا یہ کہ اس نے تاریخ کے دائرے سے خود کو آزاد کرا لیا ہے اور مسلسل ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے۔

جب مورخین اور مفکرین نے آثار قدیمہ اور تاریخی واقعات کی مدد سے ماضی کا مطالعہ کیا تو اس چیز کا احساس ہوا کہ انسان نے ماضی سے لے کر آج تک لحظہ بہ لحظہ درجہ بہ درجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ ارتقائی طور پر ترقی کی ہے۔ انسانی تہذیب ایک جگہ جامد ہوکر نہیں رہ گئی بلکہ برابر آگے بڑھ رہی ہے قوموں کا عروج و زوال ہوتا رہتا ہے تہذیبیں آتی اور جاتی رہتی ہیں اور معاشرے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں لیکن سب کے باوجود تاریخی عمل آگے کی جانب بڑھ رہا ہے تاریخی واقعات ایک زنجیر کی مانند ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے پھیلتے جارہے ہیں۔

ارتقاء اور ترقی کے نظریات نے انسان کو یہ پیغام دیا کہ انسان مجبور محض اور تقدیر کے ہاتھوں میں قیدی نہیں ہے بلکہ وہ برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے اور انسانی تہذیب و تمدن مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

ارتقاء اور ترقی کے نظریہ کی بنیاد جن مفروضات پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہیں۔

1- پہلا مفروضہ یہ ہے کہ ہر معاشرے کی بنیادی خصوصیت تبدیلی کا عنصر ہے جب ہم حال کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں اور ماضی میں بڑا فرق پاتے ہیں اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حال کا یہ فرق ماضی کی تبدیلی کی وجہ سے آیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تاریخی عمل کا ایک انتہائی اہم قانون "تبدیلی کا قانون" ہے۔

2- تبدیلی معاشرے کا ایک فطری عمل ہے اگر کسی معاشرے میں جمود طاری ہے تو اس کی وجہ حادثات اور غیر معمولی حالات ہوتے ہیں۔

3- معاشرے کی تبدیلی میں انسانی صلاحیتوں اور قوتوں کو دخل ہوتا ہے تبدیلی کی خواہش نہ صرف انسان میں ہوتی ہے بلکہ انسان کے تخلیق کردہ اداروں میں بھی ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ بیرونی عناصر بھی تبدیلی کا موجب بنتے ہیں جیسے دوسرے معاشروں اور ان کی ثقافت کے اثرات لیکن بیرونی عناصر تبدیلی کے راستہ کو متعین نہیں کرسکتے یہ تبدیلی کی رفتار پر تو اثر انداز ہوتے ہیں مگر تبدیلی کو اپنی مرضی سے قابو نہیں کرسکتے۔

4- وہ تبدیلی جو معاشرے کی ساخت' ہیت اور شکل کو بدل دے وہ تدریجی اور آہستگی کے ساتھ آتی ہے۔

5- انسانی معاشرے میں تبدیلی کسی مقصد کے تحت ہوتی ہے مقصد تعین کرنے کا عنصر انسانی فطرت کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔

6- معاشرہ کی تبدیلی سادگی سے پیچیدگی کی جانب لے جاتی ہے اور اس میں ہمیشہ پھیلاؤ ہوتا ہے۔

7- تبدیلی کے قوانین ہر زمانہ اور ہر حالت میں ایک ہی طریقہ سے عمل کرتے ہیں اس لیے کسی بھی معاشرے کی تبدیلی اور ارتقاء کے عمل کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اور اس کی مدد سے تاریخ میں کسی ایک منصوبہ کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔

جب ہم تاریخی عمل میں ارتقاء کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد ایسی ترقی ہے جو آہستہ آہستہ اور ترتیب کے ساتھ ہو جب کہ ترقی سے مراد اصلاح یا کسی چیز کا بہتر ہونا ہے۔ ترقی ایک اضافی تصور ہے اور ہمارے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں کہ جس کی بنیاد پر ہم کسی معاشرے کو ترقی یافتہ اور کسی کو غیر ترقی یافتہ کہیں۔

ترقی کا نظریہ اٹھارویں صدی کے یورپی مفکرین کی پیداوار ہے جو خاص حالات میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپی معاشرہ سائنس و فنی اور اقتصادی طور پر ترقی کررہا تھا اور ایشیا و افریقہ کے ممالک کو اپنی نو آبادیات بنا رہا تھا۔ جب کہ یورپی سیاحوں نے ایشیا' افریقہ اور امریکہ کے معاشروں کو دیکھا تو انہوں نے یورپی تاریخ کی مدد سے یورپی معاشرے کے ابتدائی دور اور ان میں مقابلہ کیا اور مشابہتیں ڈھونڈیں' مثلاً" امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل اس وقت اس مرحلہ پر تھے جہاں ابتداء میں یونانی اور رومی تھے ان کے عقائد

روایات اور اداروں کی مماثلت نے انہیں ترقی کے نظریہ کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔

ترقی کے نظریہ کو سمجھنے میں مزید دشواری اس وقت پیش آئی جب ڈیکارٹ نے کہا کہ خدا نے فطرت میں چند قوانین بنائے ہیں اس لیے جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ ان قوانین کے تحت ہوتا ہے اس لیے دنیا کا ارتقاء خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے ذریعے ہوتا اور یہ قوانین اٹل ہیں۔ اس لیے ایک جیسے نتائج ہر دور اور ہر جگہ نکلتے ہیں ان قوانین کو عقل اور دلیل کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔

لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ دنیا کے مختلف معاشروں میں ثقافت کی بنیادیں علیحدہ علیحدہ ہیں اور ترقی کی رفتار بھی جدا ہے تو اس کا جواب اس طرح سے دیا گیا کہ اگرچہ ہر معاشرہ اور ثقافت کی بنیاد ایک ہے فرق صرف "ترقی شدہ" اور "ترقی پذیر" میں ہے۔

ترقی شدہ اور ترقی پذیر معاشروں کے فرق کو واضح کرنے کے لیے ترگوت (TURGOT) نے انسانی معاشرے کے درجے متعین کیے ہیں۔ مثلاً" وہ انسانی معاشروں کی ترقی کو اس طرح سے بیان کرتا ہے' پہلا دور شکاری سماج کا ہوتا ہے اس کے بعد راعیانہ (PASTORAL) اور پھر کاشتکاری' یورپی معاشرہ ان درجوں سے گزر کر موجودہ شکل میں وجود میں آیا دوسرے معاشروں کو بھی انہی درجوں سے گزرنا ہوگا۔

لہٰذا اٹھارویں صدی کے مفکرین و مورخین نے تاریخ کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انہیں مختلف انسانی معاشروں میں مشابہتیں نظر آئیں اس نقطہ نظر سے جو تاریخ لکھی گئیں اس میں دور وحشت سے دور تہذیب تک تاریخ کو سلسلہ وار بیان کر کے انسانی ارتقاء اور ترقی کو ثابت کیا گیا۔

اٹھارویں صدی کے مورخوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ تاریخی واقعات کے نیچے جو کچھ چھپا ہوا اور پوشیدہ ہے اسے باہر لانا چاہئے اور اس ذریعہ سے تاریخ کی روح کو تلاش کرنا چاہئے انہوں نے تاریخ کو سنہ وار ترتیب سے لکھنے والوں کو حقارت سے دیکھا اور تاریخ میں وقت و مدت کے تعین کے لیے سنہ وار ترتیب کو استعمال نہیں کیا بلکہ علم الاقوام کے ذریعہ تاریخ کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا اور ان کے مختلف نام رکھے۔ مثلاً" جہالت' غیر کاشتکاری' اور غیر یورپی ثقافت سے تعلیم' کاشتکاری اور تجارتی اور یورپی ثقافت تک یا آزاد جنسی تعلقات سے ایک بیوی تک کمیون سے نجی جائیداد تک فطرت کی پوجا سے توحید تک اور سادگی سے پیچیدگی تک۔

جب ہم تاریخ کو ارتقاء اور ترقی کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ تاریخ عمل مسلسل ارتقائی شکل میں ترقی کی جانب جارہا ہے ترقی کی دو شکلیں انسان کو تاریخ کے مطالعہ سے بخوبی نظر آتی ہیں۔ اول انسان کا فطرت کے مقابلہ میں فتح مند و کامیاب ہونا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسانی معاشروں میں طبقاتی تقسیم نے عوام کی اکثریت کو جس طرح کچل کر اور دبا کر رکھا تھا بادشاہوں' امراء اور جاگیرداروں کا جو اپنی رعیت پر غلبہ تھا اور عوام کی اکثریت اپنی عزت اور عظمت سے محروم جہالت و ناواقفیت کے اندھیروں میں گم تھی' تاریخ یہ نشاندہی کرتی ہے کہ عوام غلامی کی یہ زنجیریں بھی آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں اور دنیا کے ہر معاشرہ میں عوام میں شعور' واقفیت اور آگہی پیدا ہورہی ہے۔ مراعات یافتہ طبقے اپنا اثر و رسوخ اور طاقت آہستہ آہستہ کھو رہے ہیں۔ دنیا کے کونے کونے میں عوامی تحریکیں اپنے حقوق اور عظمت کے لیے جنگ کررہی ہیں۔ یہی وہ پہلو ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ ترقی مسلسل اور جاری و ساری ہے اور یہ تاریخ عمل برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔

تاریخ کا مادی نظریہ

ایک عرصہ تک تاریخ کی تعبیر و تفسیر سیاسی نقطہ نظر سے کی جاتی تھی اور تاریخ میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو سیاسی تبدیلیوں کے پس منظر میں دیکھا جاتا تھا۔ بادشاہت سے جاگیرداری اور جاگیرداری سے جمہوریت کا سفر اور اس کے نتیجہ میں معاشرہ کی ترقی سیاسی اتار چڑھاؤ کے نقطہ نظر سے دیکھی گئی۔ اس وجہ سے ابتدا میں مورخین نے اپنی ساری توجہ ان تبدیلیوں پر دی جن میں شاہی خاندانوں کا اقتدار' زوال' جنگیں' سازشیں اور انتظامی امور شامل تھے۔

تاریخ کے مطالعہ کے نقطہ نظر میں اور تبدیلی آئی جب معاشرتی تبدیلیوں کو آب و ہوا کے زیر اثر دیکھا گیا اس نقطہ نظر کو بکل (BUCKLE) نے ابھارا کہ جغرافیائی ماحول' غذا اور ذہن تاریخی عمل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ملک ایک ایسے علاقہ میں واقع ہے جہاں آب و ہوا اچھی زمین زرخیز اور غذا وافر مقدار میں موجود ہو تو اس سے معاشرہ میں خوشحالی اور فارغ البالی پیدا ہوگی اور یہ معاشرہ کی ترقی کا باعث ہوگی کیونکہ یہ معاشرہ کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے جن کی مدد سے فطری قوتوں کو شکست دے کر انسان اپنے آرام و آسائش کی سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

مارکس نے ان نظریات سے علیحدہ تاریخ کا مادی یا معاشی نظریہ دیا جس میں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانی زندگی شعور کے ذریعہ متعین نہیں ہوتی بلکہ شعور زندگی کے ذریعہ متعین ہوتا ہے۔ معاشرے کے اداروں اور روایات کی ابتداء کو کسی نظریہ' تصور یا خیال میں نہیں ڈھونڈنا چاہئے کیونکہ یہ معاشرتی تبدیلیاں مادی حالات پیداوار کی وجہ سے ہوئی ہیں کسی عہد کی تاریخ کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اس کے عہد کے پیداواری ذرائع آلات اور ان کے تعلقات کو نہیں سمجھا جائے پیداواری ذرائع کے بدلنے سے انسان اپنے تمام سماجی رشتوں کو بدل لیتا ہے۔ ہینڈ مل نے جاگیرداری معاشرہ کو پیدا کیا تو اسٹیم مل نے سرمایہ داری کو جنم دیا انسان کے سماجی تعلقات کی بنیاد مادی ذرائع ہوتے ہیں اور وہ ان کے مطابق اپنے نظریات اور قدروں کو تشکیل دیتا ہے اس لیے تمام نظریات عبوری ہوتے ہیں۔

مارکس کہتا ہے کہ جغرافیائی ماحول اور حالات اس وقت تک اثر انداز ہوتے ہیں

جب تک کہ پیداواری ذرائع عمل پذیر ہوتے ہیں اس لیے زمین کی زرخیزی نہیں بلکہ پیداوار کے طریقوں' ان کے اختلاف' موسموں کی تبدیلی اور ماحول کی فطری تبدیلیاں اہم ہوتی ہیں جو آدمی کو اس بات پر ابھارتی ہیں کہ وہ زیادہ پیدا کرے اور اپنے ذرائع آلات کو تبدیل کرے یہ وہ صورت حال تھی جس میں انسان مجبور ہوا کہ وہ تاریخ میں اہم کردار ادا کرے۔ یہ وہ نقطہ نظر ہے جس کی روشنی میں ہم تاریخ میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً" ابتداء میں انسان غول کی شکل میں رہتا تھا پھر قبائلی نظام آیا اس کے بعد خاندان کی شکل ابھری اور اس کے ساتھ ریاست کا ڈھانچہ تشکیل ہوا۔

بقول اینگلز کہ ریاست کا وجود اس لیے آیا کہ تاکہ اس کے ذریعہ طبقاتی جدوجہد کو روکا جاسکے کیونکہ ریاست کے قیام کے بعد بااقتدار طبقہ نے سیاسی طاقت کے ذریعہ اپنے اقتدار کو مضبوط کرلیا۔ اس لیے طبقاتی جدوجہد میں معاشیات سے سیاست کی طرف رخ ہوجاتا ہے کہ جدوجہد کرکے سیاسی اقتدار پر قابض ہوا جائے اور عوام کے چھنے ہوئے حقوق انہیں دیئے جائیں۔ سیاسی اقتدار پر قبضہ کی یہ جدوجہد کبھی پر امن طور پر ختم نہیں ہوئی۔

لیکن مارکس اور اینگلز کے بارے میں یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ انسانی رجحانات کے بدلنے میں صرف اور صرف معاشی مفادات کو سمجھتے ہیں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ معاشی مفادات' انسانی عمل کو تیز کرنے میں حصہ لیتے ہیں لیکن وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ دوسرے عوامل بھی تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اس کی وضاحت کرتے ہوئے 1890ء میں اینگلز نے ایک خط میں لکھا تھا کہ اس وقت یہ بات اس لیے زور دے کر کہی گئی تھی کہ دوسرے مفکرین اس عنصر کو فراموش کیے ہوئے تھے۔ بعد میں ہمیں اس کا موقع نہیں ملا کہ دوسرے عناصر کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے۔ ایک دوسرے خط میں اس نے لکھا کہ معاشی حالات و مفادات بنیاد ہیں مگر سماجی ڈھانچہ کے دوسرے پہلو جیسے سیاسی کشمکش' دساتیر' قانون اور فلسفیانہ نظریات ان تمام عوامل کا انسان کی ترقی پر اثر ہوا اور انہوں نے مل کر سماج کو ایک خاص شکل دی۔

1850ء سے 1860ء تک مارکس نے یورپی سرمایہ داروں کا مطالعہ کیا تاکہ وہ یہ ثابت کرسکے کہ یہ نظام کس طرح مرحلہ وار تاریخ عمل سے پیدا ہوا اور اس کا خاتمہ کس طرح سے ہوگا اس سلسلہ میں اس نے تین اہم نظریات پیش کیے۔

1- (LABOUR THEORY OF VALUE)

2- قدر زائد (THEORY OF SURPLUS VALUE)

3- سرمایہ کا آہستہ آہستہ جمع ہونا اور اس کے استحصال کے نتیجہ میں محروم طبقوں کی تعداد میں اضافہ ہونا کیونکہ جب سرمایہ کھینچ کر چند ہاتھوں میں جمع ہوتا چلا جائے گا تو چھوٹے تاجر و دست کار و کاریگر اپنے روزگار سے محروم ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ وہ بڑی بڑی کمپنیوں سے مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور اس طرح یہ بے روزگاری کی فوج میں شامل ہوتے چلے جائیں گے۔

مارکس اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانیت کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ موہوم خوابوں اور مغائرت (ALIENATION) سے نجات پانے کی جدوجہد کرے اس جدوجہد میں صنعتی کارکن سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ پرولتاری طبقہ سرمایہ داری نظام کی خرابیوں کے نتیجہ میں زیادہ طاقت ور ہوگا اور فلسفیوں کی راہنمائی میں باشعور بن کر سیاسی طاقت پر قبضہ کرے گا۔ اس کے سیاسی اقتدار کے بعد ہی معاشرہ سے طبقاتی جدوجہد ختم ہوگی اور نجی ملکیت کا تصور ختم ہوجائے گا۔

اس مرحلہ پر ایک سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا پرولتاری انقلاب کے بعد جدلیاتی عمل ختم ہوجائے گا؟

اس کا جواب اس طرح دیا گیا پرولتاری اقتدار کے بعد طبقاتی جدوجہد کی گردش تو ختم ہوجائے گی کیونکہ پرولتاری طبقہ استحصالی نہیں ہوتا اور نہ اس کے پاس نجی ملکیت ہوتی ہے لیکن سماجی ترقی سیاسی انقلاب کے بعد بھی جاری رہے گی۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی نے اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پرولتاری انقلاب کے بعد معاشرہ میں غیر مخالفانہ تصادات

(NON-ANTOGONISTIC CONTRADITIONS)

پیدا ہوں گی جو تاریخی عمل کو جاری رکھیں گی۔

تاریخ کا مادی نظریہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اگر معاشرہ میں معاشی حقوق برابر ہوں گے' ہر فرد کو ترقی کے مواقع میسر ہوں گے تو اس کے نتیجہ میں اخلاقی اقدار پروان چڑھیں گی اور خود غرضی' دھوکہ دہی انتقام اور خود نمائی کے جذبات و عادات ختم ہوں گی محبت اور لگاؤ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی کسی کا دست نگر نہ ہو انسان کی

عزت، حرمت، عظمت اور وقار اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ انسانی کردار اسی وقت بلند اخلاقی اصولوں پر تشکیل پاتا ہے جب وہ آزاد ہو۔

معاشرہ میں امن، اور عالمی امن کی بنیاد بھی معاشی حقوق پر ہوتی ہے جب اقوام عالم معاشی طور پر آزاد ہوں گی تو جنگ و جدل اور غارت گری کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ معاشی آزادی ہی روحانی قوتوں کو پروان چڑھاتی ہے جس میں ضعیفوں، محتاجوں، معذوروں اور انسانوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ کا مادی نظریہ ان قوتوں کی جانب اشارہ کرتا ہے جو معاشرہ کے عروج و زوال، خوش حالی اور خستگی اور اس کی عظمت اور ذلت میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔

اس کی مدد سے تاریخ کو بہتر طریقہ سے سمجھا جاسکتا ہے اور اسکی روشنی میں تاریخی شعور کے ذریعہ عوامی حقوق کی جدوجہد کی جاسکتی ہے۔

تاریخ، تبدیلی اور ترقی

تاریخ کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے برابر تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ایک درجہ سے دوسرے درجہ کی جانب بڑھتے رہتے ہیں جن معاشروں نے اس تبدیلی کے عمل کو جلد قبول کیا وہاں ترقی کی رفتار تیز رہی اور جہاں تبدیلی کے خلاف رد عمل ہوا ایسے معاشرے منجمد ہوکر رہ گئے اور ان کی ترقی کی رفتار رک گئی۔ تبدیلی کے اس تاریخی عمل میں کچھ معاشرے ترقی کرتے چلے گئے کچھ ست روی کے ساتھ اس عمل سے گزرے اور کچھ بالکل جامد ہوکر ختم ہوگئے۔

معاشرے میں تبدیلی اچانک نہیں آتی بلکہ تبدیلی کے جراثیم آہستہ آہستہ اور خاموشی سے اندر ہی اندر نشوونما پاتے ہیں وہ لوگ جو ابتدا میں معاشرے کی مضبوط اور مستحکم روایات کو توڑنا چاہتے ہیں اور معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں انہیں سب سے زیادہ قربانیاں دینا پڑتی ہیں کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی پرانی روایات و اقدار سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتا اور روایات و اقدار و رسوم و رواج کی ذرا سی تبدیلی اسے ذہنی اذیت و کرب میں مبتلا کردیتی ہے اس لیے روایات کے باغی معاشرے میں مجرم اور معتوب ہوتے ہیں۔ اور اس جرم میں انہیں روحانی و جسمانی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے لوگوں کے طعن و تشنے برداشت کرنا پڑتے ہیں، تنہائی کے صدمے اٹھانا پڑتے ہیں اور غربت و افلاس سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن آہستہ آہستہ ان منحرف اور باغیوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے یہاں تک معاشرہ ذہنی طور پر تبدیل ہونے کے لیے تیار ہوجاتا ہے اس لیے معاشرہ کو اس وقت تک تبدیل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اس کا ذہن تبدیلی پر تیار نہ ہو۔ اگر معاشرہ اپنی روایات میں کسی تبدیلی کا خواہاں نہیں اور ان سے وابستہ رہنا چاہتا ہے تو ان حالات میں نئے خیالات و افکار اور نظریات کے خلاف زبردست رد عمل ہوتا ہے اور تبدیلی کی ہر کوشش کو سختی سے دبا دیا جاتا ہے۔ تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب نئے افکار و خیالات پیش کرنے والوں کو زندہ آگ میں جلایا گیا، سولی پر لٹکایا گیا، ان کی تصانیف کو آگ لگائی گئی، ان کے خیالات پر قدغن لگائی گئی اور ان پر روزی و معاش کے تمام دروازے بند کردئے گئے تاکہ معاشرہ نئے اور تازہ افکار سے روشناس نہ ہو اس تصادم اور سختی کے عمل میں نہ جانے کتنی عظیم شخصیتیں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے

ہی موت سے ہم کنار ہوگئیں اور نہ جانے کتنے خیالات و افکار شہرت کے دائرے سے نکلنے سے پہلے ہی ختم کردیئے گئے اور آج نہ تو ہم ان کے ناموں سے واقف ہیں اور نہ ہی ان کے خیالات و افکار سے مثلاً" قدیم ہندوستان میں چارواک فلسفیوں نے اپنے عہد کے مذہبی و فلسفیانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی تو ان کے خیالات کو سختی سے کچل دیا گیا۔ آج اگر ان کے بارے میں کچھ معلومات ملتی ہیں تو ان کے مخالفین کی کتابوں میں اعتراضات کی صورت میں ہیں۔

یورپ میں انکوزیشن (INQUISION) کے زمانہ میں علم و ادب سائنس' فلسفہ اور مذہب میں ہر نئے خیال اور فکر کو طاقت و سختی سے ختم کردیا اور سائنسدانوں' عالموں اور دانشوروں کو خوف و دہشت و اذیت کے ذریعے نئے پیش کرنے سے روکا۔ اسلامی معاشرے میں روشن خیالی کی ہر تحریک کو مانی و مزدک کے پیروکار اور زندیق کہہ کر کچل دیا تبدیلی کے خلاف اس رد عمل نے تاریخ کے بہاؤ اور دھارے کو ایک حد تک روکے رکھا جس کی وجہ سے انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی میں زبردست رکاوٹ پیدا ہوئی اور تاریخی عمل کی رفتار آہستہ ہوگئی۔

معاشرے میں اسی وقت تبدیلی آتی ہے جب معاشرے کا ذہن اجتماعی طور پر تبدیل ہونے پر تیار ہو اس لیے وہ ہی شخصیتیں کامیاب ہوتی ہیں جو سازگار ماحول میں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ ان کے خیالات سے متاثر ہوکر عمل کو تیز تر کردیتا ہے۔ کامیابی کا دارومدار حالات کے ساز گار ہونے پر ہوتا ہے کہ کون سازگار ماحول میں پیدا ہوا اور کامیاب ہوا اور کون ناسازگار ماحول میں پیدا ہوا' قربانی دی' اور پھر بھی ناکام ہوا۔

لیکن آخری درجہ میں کامیاب ہونے والوں کی فتح میں ہزار ہا لوگوں کی قربانیاں اور جدوجہد شامل ہوتی ہیں اس لیے تاریخ کا کام ہے کہ وہ اس تسلسل کو برقرار رکھے اور واقعات کو درمیانی یا آخری درجہ سے شروع کرکے کامیابی کا سہرا صرف ان شخصیتوں کے سر نہ باندھے جنھوں نے پچھلے لوگوں کی کوششوں کے نتیجہ میں سازگار حالات پائے اور کامیاب ہوئے مثلاً" روسی انقلاب کی کامیابی کا سہرا صرف لینن اور اس کے ساتھیوں کے سرپر نہیں باندھا جاسکتا' اس کے پس منظر میں وہ تمام حریت پسند تحریکیں تھیں جنھوں نے زار کے خلاف مسلسل بغاوتیں کرکے عوام کو جھنجھوڑ' جھنجھوڑ کر بیدار کیا یہاں تک کہ 1917ء میں روس کے انقلاب کے لیے تیار ہوگیا۔

تاریخ کے صفحات ان افراد کے خون سے رنگین ہیں جنھوں نے معاشرے کی بہتری کے لیے قربانیاں دیں مگر کامیاب نہیں ہوسکے۔ تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ جن افراد نے اور جن لوگوں نے اصول و مقصد اور حق کی خاطر جانیں دیں مگر کامیاب نہیں ہوسکے تو ایسے لوگوں کے لیے اس کے صفحات پر کوئی جگہ نہیں یہ لوگ خاموشی سے اپنا کردار ادا کرکے گمنامی میں روپوش ہوگئے۔

تاریخ میں ہم ترقی کے عمل کو مسلسل آگے کی جانب بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں یہ ترقی کیا ہے؟ کیوں کر پیدا ہوتی ہے؟ اور کیا یہ ترقی مساوی ہے یعنی تمام انسانی معاشروں میں ایک ساتھ ہوتی ہے یا علیحدہ علیحدہ؟

اس سلسلہ میں دو اہم نظریات ہیں یعنی ترقی بذات خود نہیں ہوجاتی ہے بلکہ اس کے لیے انسان مشترکہ طور پر جدوجہد کرتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی محنت سے اپنی ذہانت سے اور اس کی اپنی صلاحیت سے ہوتی ہے یہ اس کی آزادانہ کوششوں کا ثمرہ ہوتی ہے جب کہ دوسرے نظریہ میں کہا جاتا ہے کہ ترقی تاریخی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور اس طرح انسان کا خوش گوار مقدر بن جاتی ہے یعنی وہ قدرت کی جانب سے ہے کہ انسانی معاشرہ میں ترقی ہو انسان قدرت کے منصوبوں کی تکمیل کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔

بعد میں ہیگل' مارکس اور لینن نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی وضاحت کی یہ ترقی انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے اور یہ انسان معاشرہ میں تضادات کے مسلسل تصادم سے وجود میں آتی ہے جدلیاتی عمل انسان کو ترقی کی جانب لے جاتا ہے اور انسان ماضی کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تہذیب کو مالا مال کرتا رہتا ہے اس لیے تاریخ کا ایک اہم عنصر انسانی معاشروں میں مسلسل تبدیلی اور ترقی کا ہے انسانی ذہن ایک جگہ منجمد ہوکر نہیں رہ جاتا بلکہ مسلسل حرکت کرتا رہتا ہے۔ روایات قدریں اٹل اور آفاقی نہیں رہتیں۔ یہ زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ بنجمن فرینکلین نے اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا تھا کہ

"مردہ لوگوں کا کوئی حق نہیں کہ وہ زندوں پر حکومت کریں۔"

ہر نسل اپنا زمانہ خود تعمیر کرنا چاہتی ہے اپنا ماحول خود تشکیل کرنا چاہتی ہے اسی جذبہ میں ترقی کا راز پنہاں ہے۔ اور رجعت پرست طاقتیں اسی جذبہ کو ختم کرنا چاہتی ہیں تاکہ تبدیلی و ترقی سے معاشروں کو محروم کردیں۔

تاریخ کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تمام انسانی معاشروں کی ترقی یکساں اور مساوی طور پر نہیں ہوئی دنیا کے ایک خطہ اور حصہ میں تہذیب و تمدن نے ترقی کی اور عروج و کمال پر پہنچا تو دوسرے حصوں میں معاشرے آہستہ روی کے ساتھ تمدن کے مراحل سے گزرے ترقی کے اس غیر مساوی عمل نے قوموں و متمدن و وحشی' طاقت ور و کمزور' برتر و کمتر اور مہذب و غیر مہذب میں تقسیم کردیا جو معاشرے نظریات و افکار اور تخلیق کے میدان میں آگے رہے انہوں نے دوسرے معاشروں کو اپنے برتر ہتھیاروں کی مدد سے زیر کرکے اپنا غلام بنالیا۔

مثلاً" امریکہ اور آسٹریلیا کے معاشروں کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ تاریخ کے تسلسل اور ترقی کے دھارے سے دور اور علیحدہ رہے اس لیے ترقی کی اس منزل پر نہیں پہنچ سکے جس پر پرانی دنیا کی اقوام تھیں جب ان کا مقابلہ ان اقوام سے ہوا تو انہوں نے ان کے مقابلہ میں خود کو بے دست و پا پایا' ان کا سیدھا سادا ذہن ان کے معمولی ہتھیار اور ان کی پر امن زندگی ان کے لیے تباہی کا باعث بن گئی امریکہ اور آسٹریلیا کے معاشرے سماجی و معاشرتی لحاظ سے پرانی دنیا کے مقابلے میں پر امن اور صلح باہمی کے اصولوں پر قائم تھے کیونکہ ان کے ہاں نہ تو بادشاہت تھی اور نہ قانونی و سیاسی ادارے نہ انتظامی افسر' نہ جاگیرداری و زمینداری اور ذاتی ملکیت کا تصور اور نہ طبقاتی تقسیم لوگ مل جل کر قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے' جب کہ یورپ میں اس وقت بادشاہی طرز حکومت اور نظام جاگیر داری اپنے عروج پر تھا جس کی بنیاد طبقاتی تقسیم اور غلاموں و کسانوں کی محنت و مشقت پر تھی یہ دونوں معاشرے سماجی لحاظ سے دو مختلف راہوں پر گامزن تھے امریکی اور آسٹریلوی معاشرے اپنی امن پسندی' صلح جوئی اور سادھے ذہن کی وجہ سے یورپی اقوام کے اعلیٰ ہتھیاروں اور چالبازوں اور سازشوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے اس شکست نے نہ صرف انہیں اپنی زمین سے محروم کیا بلکہ ان کی تہذیب و ثقافت بھی اس کے نتیجہ میں پامال ہوگئی۔

ایشیا و افریقہ کے معاشروں کی بدقسمتی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی تہذیب کو کامل سمجھ کر' تبدیل ہوتی ہوئی دنیا کا ساتھ نہیں دیا اور بلند و بالا دیواروں میں گھرے ہوئے اپنی روایات کو اعلیٰ و آفاقی سمجھتے رہے جس کی سزا انہیں یہ ملی کہ وہ مغربی اقوام کے ہاتھوں شکست کھا کر ان کی نو آبادیاں بن گئے۔

معاشروں کے عروج و زوال کے پس منظر میں دو عناصر کام کرتے ہیں مسلسل تغیر و

تبدل معاشرے کو متحرک رکھتا ہے جب کہ تبدیلی سے انکار معاشرے کو منجمد اور پتھر بنا دیتا ہے۔ ایسا معاشرہ گھن لگی ہوئی لکڑی کی طرح ہوجاتا ہے جو ذرا سی چوٹ سے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ جغرافیائی حالات نے بھی انسانی معاشرے کی غیر مساوی ترقی میں برابر کا حصہ لیا۔

مختلف انسانی معاشرے مختلف جغرافیائی ماحول اور حالات کے تحت ارتقاء پذیر ہوئے اس لیے ہر معاشرہ کی ذہنیت کا جداگانہ ارتقاء ہوا اور ہر معاشرے نے اپنی علیحدہ روایات اقدار و رسوم و رواج کو تخلیق کیا اس جداگانہ ذہنیت اور ثقافت کی وجہ سے ایک معاشرے کے لیے دوسرے معاشرے کو سمجھنا انتہائی مشکل ہوگیا جب اہل یورپ امریکہ گئے تو انہیں وہاں کے معاشرے کو سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آئی کیونکہ نہ تو وہاں پیسہ تھا' نہ تاجر نہ امیر و غریب کی تفریق اور نہ قیمتی دھاتوں کی قدروقیمت اس مغائرت اور بے گانگی کا یہ نتیجہ نکلا کہ دونوں معاشروں کے درمیان افہام و تفہیم کے راستے بند ہوگئے اور اہل یورپ انہیں جاہل اور غیر مہذب سمجھنے لگے' انسانی معاشروں کی تہذیبی اور ثقافتی اجنبیت انہیں ایک دوسرے سے دور کرتی ہے اور یہی دوری مہذب و غیر مہذب اور ترقی یافتہ و ترقی پذیر کے تصور کو جنم دے کر برتری و کمتری کے احساس کو باقی رکھتی ہے۔

○

تاریخ میں فرد کا کردار

تاریخ ہر عہد کے ذہن کی عکاسی و نمائندگی کرتی ہے۔ تحریری تاریخ اس وقت تشکیل ہوئی جب انسانی معاشرے میں شخصی حکومتیں قائم ہوئیں اور اقلیت نے اقتدار پر قبضہ کرکے اکثریت کو اپنا تابع بنا لیا اس کے بعد سے اقلیت کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے اقتدار اور اپنے اثر رسوخ کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف روایات' اقدار اور اداروں کے ذریعے عوام کو یہ تاثر دیا جائے کہ وہ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بالاتر ہیں لہٰذا ان کی اطاعت کرنا عوام کا اخلاقی اور قانونی فرض ہے۔

اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے سلسلہ میں انہوں نے علم و ادب کو بھی استعمال کیا۔ شعراء نے ان کی شان میں قصیدے لکھ کر ان کی ذات کو زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی تو مورخین نے ان کے کارناموں کو بیان کرکے انہیں تاریخ ساز بنا دیا۔ تاریخ میں شخصیتوں کا کردار اس قدر ابھرا کہ کچھ کے نزدیک تاریخ سوائے عظیم افراد کی سوانح حیات کے اور کچھ بھی نہیں۔

ابتدا میں صرف سیاسی شخصیتوں کو تاریخ میں زیادہ اہمیت تھی' چونکہ یہ اقتدار اور طاقت کے مالک تھے اس لیے مورخوں کی خدمات حاصل کرسکتے تھے۔ چنانچہ ان سیاسی شخصیتوں کو ہر عہد میں تاریخ کا مرکز بنا کر' انہیں تاریخ کی تعمیرو تشکیل کرنے والا قرار دیا گیا ان میں حکمران وزیر' سپہ سالار اور امراء و جاگیردار ہوا کرتے تھے اور ان کے کارناموں کے دائرے میں جنگیں' فتوحات انتظام سلطنت اور علم و ادب کی خدمات آتی تھیں۔ بعد میں سیاسی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ مذہبی علمی و ادبی شخصیتوں اور سائنسدانوں کو بھی شامل کرلیا گیا ان کی شمولیت سے تاریخ کا دائرہ پھیل کر وسیع تو ہوا مگر تاریخ میں سماجی و معاشی و معاشرتی قوتوں نے جو اثرات ڈالے ان کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔

چونکہ ماضی کے واقعات وقت کے ساتھ ساتھ دھندلے ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کے اردگرد غیر حقیقی روایات کی تہہ چڑھتی چلی جاتی ہے اس لیے اس سے فائدہ اٹھا کر شخصیتیں خود کو تاریخ کے عظیم واقعات یا عظیم خاندانوں سے منسوب کرکے معاشرہ میں عزت و عظمت حاصل کرتے ہیں۔

تاریخ میں دو قسم کی متوازن شخصیتیں چلتی ہیں ایک تاریخی اور دوسری دیومالائی'

تاریخی شخصیت کے بارے میں مورخ واقعات کی چھان بین کرکے ان کی روشنی میں سب کے کارناموں کو بیان کرتا ہے اگرچہ اس میں مبالغہ' تعصب اور خوشامد ہوتی ہے مگر اس کے باوجود واقعات کی حیثیت تاریخی ہوتی ہے اس لیے غیر جانبدار مورخ کے لیے یہ مواقع بھی ہوتے ہیں کہ وہ ان شخصیتوں کو ان کے صحیح روپ میں لوگوں کے سامنے لائے اور ان کے کارناموں کی نفی کرے مگر دیومالائی شخصیتیں اس تصوراتی خاکہ میں ڈھلتی ہیں جو عوام چاہتے ہیں عوام جب اپنے موجودہ حکمرانوں کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل نہیں پاتے تو ان کی مایوسی اور اذیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان حالات میں وہ ہیرو تراشتے ہیں جس میں وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں ہوں جو ان کے مسائل کو حل کردے چونکہ وہ مزید انتظار برداشت نہیں کرسکتے اس لیے ان کے ہیرو میں ایسی روحانی خصوصیت آجاتی ہے جو چند لمحوں میں ظالموں کو خاکستر کردے گا اور دنیا میں امن و امان قائم کرکے معاشرہ کو خوش حال بنا دے گا اس لیے یہ دیو مالائی شخصیتیں یا جنہیں عوامی تخیلاتی تصوراتی شخصیتیں کہا جائے ان میں بہادری' شجاعت اور ذہانت و فیاضی کی خوبیاں ہوتی ہیں وہ کرامات و معجزوں کی مالک ہوتی ہیں اور پوری کائنات ان کے ساتھ ہوتی ہے اس طرح یہ شخصیتیں عوامی خواہشات اور امنگوں کا مظہر بن جاتی ہیں اور حقیقی تاریخی شخصیت سے زیادہ عوام کے ذہنوں میں ان کا اثر ہوتا ہے اور ایک طرف یہ خدا کے پسندیدہ بندے بن جاتے ہیں تو دوسری طرف عوام کے نجات دہندہ۔

عوام کے ان جذبات سے فائدہ اٹھا کر وقتاً" فوقتاً" کچھ افراد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس شخصیت کے روپ میں لوگوں کی نجات کے لیے آئے ہیں اس بنیاد پر یہ افراد کبھی سیاسی اقتدار حاصل کرلیتے ہیں اور کبھی لوگ ان کے دعویٰ کو مسترد کردیتے ہیں لوگوں کے ذہن میں ان دیومالائی شخصیتوں کی پراسرار طاقت کا اثر اس وقت تک رہے گا جب تک ان کے مسائل حل نہیں ہوں گے اور جب تک انہیں اپنی طاقت و قوت کا احساس نہیں ہوگا۔

مفکرین کا ایک طبقہ تاریخ میں افراد اور عظیم شخصیتوں کی قوت اور طاقت کا قائل ہے ان کے نزدیک تاریخ کو بنانے والے اس کی تعمیر اور تشکیل کرنے والے اور اس کے دھارے کو بدلنے والے افراد ہوتے ہیں۔ عوام محض ان کے مقلد ہوتے ہیں۔ افراد عوام کو راستہ دکھاتے ہیں ان کو شعور و آگہی دیتے ہیں اس لیے تاریخی تبدیلیاں انہی افراد کی

مرہون منت ہیں۔ کارلائل ایسی ہی شخصیتوں کو تاریخ میں اہمیت دیتا ہے جنہوں نے مذہب سیاست اور علم و ادب میں فکر انگیز تبدیلیاں لاکر تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا چنانچہ "تخلیقی شخصیت" مرد کامل اور "سپرمین" کی اصطلاح کے ذریعے تاریخ میں افراد اور شخصیتوں کے کارناموں کو بیان کرکے تاریخ کے سارے عمل کو ان سے منسوب کردیا گیا اور عوام کو محض ان کا مقلد اور پیروکار بنا دیا گیا جو فلسفی اور مورخ تاریخ میں افراد کی اہمیت کو مانتے ہیں ان کے ہاں جمہور اور جمہوریت سے دشمنی کے جذبات پائے جاتے ہیں اور یہ اس طرز حکومت اور نظام کے خلاف ہوتے ہیں جس میں دائرہ اقتدار افراد کے ہاتھوں سے نکل کر عوام کے ہاتھوں میں چلا جائے۔ ان کے نزدیک صرف "تخلیقی اقلیت" ذہن و شعور کی مالک ہوتی ہے اس لیے یہ مساوات برابری' آزادی اور ارادہ اجتماعی کے مخالف ہوتے ہیں۔

ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں جب یورپی اقوام کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھیں تو ان میں بھی شخصیتوں اور عظیم افراد کے کردار کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا گیا اور ہزا ہا لوگوں کی قربانیوں کو نظر انداز کرکے کامیابی کا سہرا چند افراد کے سر باندھا گیا' کیونکہ یہ راہنما شخصیتیں اقلیت کی نمائندگی کررہی تھیں اور ان کے افکار و نظریات اور تعلیمات سے اس اقلیت کو فائدہ پہنچ رہا تھا اس لیے ان شخصیتوں کے گرد تقدس کا ہالہ بنا کر ان کے نظریات کو آفاقی درجہ دے کر اپنی مراعات اور فوائد کو باقی رکھا۔

تاریخ میں شخصیتوں اور افراد کے تاریخ ساز کردار کی اہمیت کا اثر یہ ہوا کہ عوام میں اور معاشرے کی اکثریت میں خود اعتمادی کا جذبہ ختم ہوگیا اور جب بھی معاشرہ بحرانوں سے دوچار ہوا یا مسائل پیدا ہوئے تو وہ اس کی توقع کرتے رہے کہ کوئی شخصیت پیدا ہوگی اور ان مسائل کو حل کردے گی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی امید میں لوگ ظلم و اذیت' تکلیف و دکھ' مفلسی و عسرت اور جہالت کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور نسلیں اسی موہوم امید پر اپنی زندگیاں قربان کردیتی ہیں کہ کوئی آئے گا اور انہیں تمام مظالم سے نجات دلا کر دنیا میں امن و انصاف قائم کردے گا۔ اس نظریہ اور تصور نے عوام کی قوت و طاقت اور عمل کو ختم کرکے انہیں اس بات پر آمادہ کردیا کہ وہ ہر ظلم کو خاموشی سے برداشت کریں اور ظالم کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں یہی وجہ تھی کہ اس کے سہارے دنیا میں ظالم و آمر کامیابی و کامرانی کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

تاریخ کا دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ عظیم شخصیتیں بذات خود کچھ نہیں ہوتیں بلکہ یہ

حالات کی پیدوار ہوتی ہیں شخصیتوں کی اہمیت اسی وقت ہوتی ہے جب ان کے کام کے لیے حالات ساز گار ہوں اور معاشرہ کا ذہن ان کے پیغام اور تسلیمات کو سننے کے لیے اور اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو اگر وہ سازگار ماحول سے علیحدہ ہٹ کر پیدا ہوتے ہیں تو ان کی عظمت ختم ہوجاتی ہے۔

بقول ٹالسٹائی۔ "عظیم شخصیتیں بذات خود کچھ نہیں۔ بلکہ یہ واقعات ہیں جو ان کا روپ اختیار کرلیتے ہیں۔"

تاریخ کے عمل کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ شخصیتوں کا اثر بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اور ان کی تعلیم، فکر، اور نظریہ تاریخ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ خاص حالات اور خاص ماحول کے لیے تھا اور وقت کے ساتھ وہ زمانہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان کی تعلیمات فرسودہ ہوجاتی ہیں اس لیے دوسرے حالات اور ماحول میں ان کے افکار کا احیاء ناممکن ہوجاتا ہے کیونکہ ہر عظیم شخصیت اپنے زمانہ کی خواہشات کا مظہر ہوتی ہے اور اسی لیے وہ عظیم ہوتی ہے اسے کسی دوسرے عہد کی علامت نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ وہ اپنا کردار ادا کرکے تاریخ کا ایک حصہ بن جاتی ہے اور اس کی عظمت تاریخ کے صفحات پر بطور یادگار رہ جاتی ہے۔

ہیگل ان شخصیتوں کی پیدائش اور ان کے عمل کو فطرت سے منسوب کرتا ہے۔ فطرت اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے ان شخصیتوں کو پیدا کرتی ہے اور جب فطرت ان کے ذریعہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کرلیتی ہے تو انہیں ناکارہ بنا کر ایک طرف پھینک دیتی ہے اس کی مثال نپولین کی ہے جب اس کی تمام صلاحیتیں ختم ہوگئیں تو اس نے اپنے آخری ایام سینٹ ہیلنا میں بحیثیت قیدی کے گزارے۔ نپولین اپنی دانست میں فرانس کی عظمت اور اپنی ذاتی شان و شوکت کے لیے جدوجہد کررہا تھا جب کہ اس کی جنگوں کے اثرات اس کے منصوبوں کے برخلاف ہوئے اور یورپ میں شکست کے رد عمل کے طور پر قومیت کی تحریکیں شروع ہوگئیں جس نے آگے چل کر یورپ کی تاریخ بدل ڈالی۔ اس طرح ہٹلر کے عروج و زوال کے نتیجہ میں اگرچہ اتحادی طاقتیں کامیاب رہیں مگر جنگ نے ان کی قوت و طاقت کو نچوڑ کر رکھ دیا اور ان کی کمزوری کے سبب نو آبادیات میں آزادی کی تحریکوں کو کامیابی ہوئی۔ مارکس کے نقطہ نظر سے افراد تاریخ کے معروضی عمل کو اپنی مرضی سے نہیں بدل سکتے۔ عظیم لوگ اتفاقاً" پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ تاریخی ضرورت کے

تحت پیدا ہوتے ہیں جب معاشرہ کے سیاسی' سماجی' معاشی اور معاشرتی پہلو پختگی کو پہنچ جاتے ہیں تو اس وقت ان حالات کے زیر اثر ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں جو معاشرے کی بہتر مستقبل کی جانب راہنمائی کرتی ہیں حالات ان میں ایسی بصیرت پیدا کردیتے ہیں کہ جس کی مدد سے یہ تاریخ کے عمل کو تیز کرکے مقاصد کے حصول میں کامیابی حاصل کرلیتے ہیں بقول پلیخانوف وہ تاریخ کے عمل کو سمجھ کر اور آنے والی رفتار کو پہچان کر معاشرے کی راہنمائی کرتے ہیں اور عوامی رائے اور عوامی قوتوں کو جمع کرکے انہیں استعمال کرتے ہیں۔

تاریخ میں اگر شخصیتوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو پھر وہ تاریخ نہیں بلکہ مذہب ہے اگر کسی شخصیت کو تاریخ کے دائرہ سے نکال کر اس سے معجزے' کرامات اور مافوق الفطرت باتیں منسوب کردی جاتی ہے تو اس سے اس کی عظمت کم ہوجاتی ہے اس کی عظمت اس میں ہے کہ اسے تاریخ کے خاکہ میں رہنے دیا جائے اور ایک انسان ہونے کی حیثیت سے جو کچھ اس نے کیا اس کا تجزیہ کیا جائے۔ تاریخ شخصیت کو عظیم بناتی ہے۔ اسی لیے مشہور فرانسیسی مفکر رینان نے کہا کہ اب اگر دنیا کا ایمان حضرت عیسیٰؑ پر سے اٹھے گا تو محض ان معجزوں کی وجہ سے کہ جن کی وجہ سے ابتدا میں لوگ ان پر ایمان لائے تھے۔

جیکب بک ہارڈٹ نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ تاریخی عمل شخصیتوں کا محتاج نہیں ہوتا یہ برابر آگے کی جانب بڑھتا رہتا ہے' شخصیتیں اس عمل کو تیز ضرور کردیتی ہیں مگر عمل کو روک نہیں سکتیں مثلاً" جغرافیائی دریافتیں حالات کا تقاضہ تھیں کولمبس اگر امریکہ دریافت نہیں کرتا تو کوئی اور دوسرا یہ کام کرتا اسی طرح ایجادات جن کی معاشرہ کو ضرورت ہوتی ہے وہ ضرور ہوتی ہے کیونکہ یہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس کچھ آرٹسٹ فلسفی اور شاعر ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ نہیں ہوتے تو آرٹ کا شاہکار جو انہوں نے تخلیق کئے وہ وجود میں نہیں آتے۔ جیسے رافیل' مائیکل انجلو' ہومر اور ورجل وغیرہ۔

تاریخ میں شخصیتوں کی اہمیت ہے لیکن تنہا شخصیتیں تاریخ ساز نہیں ہوتیں۔ حالات ان کو بناتے ہیں اور ان کے افکار و نظریات کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر یہ حالات کو بناتی اور معاشرہ کی تعمیر کرنے کا عمل سرانجام دیتی ہیں۔

تاریخ اور ادوار

تاریخ اگرچہ ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ اور عمل ہے لیکن تاریخی عمل کا دھارا ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا ایک خاص موڑ اور مرحلہ پر آکر حالات بدل جاتے ہیں اور تاریخ کی شکل بدل جاتی ہے اس لیے مورخین نے تاریخ کے اس عمل کو سمجھنے کے لیے اور واقعات کا تجزیہ کرنے کے لیے تاریخ کو مختلف ادوار اور عہدوں میں تقسیم کرتے تھے جیسے عہد سلاطین و عہد مغلیہ وغیرہ جب تاریخی شعور میں اضافہ ہوا تو مورخ نے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کون سے حوادث تھے جنھوں نے تاریخی عمل میں تبدیلی کی تو انہیں جنگیں' سیاسی انقلابات' بغاوتیں اور ارضی و سماوی حوادثات نظر آئے جنھوں نے معاشرے میں زبردست تبدیلیاں کیں۔ لہذا انہوں نے تاریخ کو اس طرح سے تقسیم کیا کہ ان واقعات و حوادث کو مرکز بنا کر ان تبدیلیوں کی نشاندہی کی جو تاریخ میں واقع ہوئیں۔

موجودہ تاریخ نویسی میں جو ترقی ہوئی وہ یورپ نے اپنی تاریخ کو مختلف انداز فکر کے تحت تقسیم کرنا شروع کردیا۔ مثلاً" ایک عمومی تقسیم کی گئی یعنی "قدیم ' قرون وسطیٰ اور جدید" اس تقسیم کے پس منظر میں ایک خاص ذہن اور فکر کارفرما تھی' یعنی اس میں تہذیب و تمدن کی ترقی کا نظریہ پوشیدہ تھا کہ یورپ کی تہذیب قدیم ادوار سے لے کر قرون وسطیٰ کے اندھیروں میں سفر کرتی ہوئی کس طرح جدید روشن خیالی اور عقلیت کے دور میں داخل ہوئی جب مسلمان مورخین نے بھی اپنی تاریخ کو اس انداز میں تقسیم کیا تو اس میں مصیبت یہ پیش آئی کہ قرون وسطیٰ جو یورپ کا تاریک دور ہے وہ ہماری تاریخ کا روشن عہد ہے یورپ کا جدید عہد جو روشن خیالی اور عقلیت کا عہد ہے وہ ہمارا تاریکی اور زوال کا دور ہے اس لیے ان ادوار کے ذریعہ ترقی کا نظریہ ہماری تاریخ پر پورا نہیں اترتا کیونکہ قدیم عہد غیر مہذب' قرون وسطیٰ جہالت' اور عہد جدید سائنسی و ذہنی ترقی کی علامتیں ہیں۔

یورپ کی تاریخ کو ذہنی و فکری لحاظ سے بھی مختلف نام دے کر ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جیسے "عقیدہ کا زمانہ" "عقلیت کا زمانہ" "روشن خیالی کا زمانہ" اور "جدید صنعت و سائنس کا زمانہ وغیرہ۔

مارکسی نقطہ نظر سے تاریخ کو اس طرح سے تقسیم کیا گیا ہے جس سے ہر معاشرہ کی ارتقائی تاریخ کا اندازہ ہوجاتا ہے جیسے "قدیم کمیونسٹ' غلامی زمینداری سرمایہ داری' اور

سوشلسٹ دور" نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد جب ایشیا و افریقہ میں تاریخ کو دوبارہ سے قومی نقطہ نظر سے تشکیل دینا شروع کیا تو اس میں تاریخ کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے تقسیم کیا گیا۔ اس قسم کی تقسیم میں ایک افریقی مورخ ہربک (HRBEK) کی تقسیم نئی فکر کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس نے افریقہ کی تاریخ کو جدید عہد سے شروع کیا مثلاً"

1950ء بیسویں صدی میں آزادی کی تحریکیں

1910ء - 1890ء آزادی کا خاتمہ

1820ء - 1805ء افریقہ و یورپ میں ہونے والی تبدیلیاں مغربی سوڈان میں عثمان دان فودیو کی تحریک جہاد چکہ کا زولو ریاست بنانا بگنڈا کا عروج محمد علی پاشا اور جدید مصر' مڈغاسکر کا اتحاد۔

15 ویں صدی کے خاتمہ سے سولھویں صدی تک یورپی اقوام کی آمد۔ افریقی تاریخ کی اس تقسیم کا مقصد یہ ہے کہ افریقی عوام کو جو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ وحشی اور غیر مہذب ہیں وہ اس نئی تقسیم سے ختم ہو۔

ہندوستان کی تاریخ کو پہلی مرتبہ ولسن اور مل کی انگریزی تاریخ میں ہندو' مسلمان' اور برطانوی' عہدوں میں تقسیم کیا تاکہ ہندوستان کی تاریخ کو مذہبی بنیادوں پر تشکیل دیا جائے اور ہندوؤں و مسلمانوں میں نفرت کو ابھارا جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کو فکری و عقلی ترقی کے لحاظ سے مختلف ادوار میں تقسیم کیا جائے تاکہ ذہن سے متعصب اور فرقہ واریت کے جذبات ختم ہوں اور تاریخ سے یہ تاثر ہو کہ فکری و عقلی ترقی میں سب برابر کے شریک ہیں۔

○

تحریری اور زبانی تاریخ

ابتدائی تاریخی سرمایہ زبانی روایات پر مبنی ہوا کرتا تھا لوگ اہم واقعات اور حوادث کو یاد کرلیا کرتے تھے اور انہیں واقعات و حوادث سے مدت کا تعین کرتے تھے۔ زبانی روایات' قصوں اور کہانیوں میں خرابی یہ تھی کہ نسل بعد نسل ان میں صداقت کم اور مبالغہ اور تخیل آمیزی زیادہ ہوتی چلی جاتی تھی اور ہر نسل ان میں اپنی خواہشات جذبات اور امنگوں کو داخل کرکے ان کی حقیقت و ماہیت کو بدل دیتی تھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ تین نسلوں کے بعد زبانی روایات میں صداقت بہت کم رہ جاتی ہے اور اضافے زیادہ ہوجاتے ہیں۔ صرف زبانی روایات سے تاریخ کو مکمل طور پر محفوظ نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ واقعات کو بھلا دیا جاتا ہے اور اکثر واقعات کو آگے پیچھے کردیا جاتا ہے۔ زبانی روایات میں چونکہ واقعات کو سنہ وار اور تاریخ کے ساتھ نہیں بیان کیا جاتا اس لیے یہ تاریخ کے زمرے میں نہیں آتیں صرف وہ واقعات جو تاریخ اور سنہ کے ساتھ بیان ہوں ایسے واقعات تاریخ کے دائرے میں آتے ہیں۔

تحریری تاریخ کے وجود میں آنے سے قبل ایشیا یورپ میں یہ رواج تھا کہ حکمران اور امراء کے خاندان بھاٹ اور شاعروں کو ملازم رکھا کرتے تھے تاکہ وہ ان کے خاندان کے کارناموں کو محفوظ رکھیں اور ان کا نسب دیوی و دیوتاؤں اور مظاہر فطرت سے ملائیں۔ یہ جنگ اور امن میں اہم واقعات کو شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ منظوم کرتے تھے اور پھر جشن تہوار اور خاص خاص موقعوں پر ان کو پڑھتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی ابتدائی دور میں تاریخ زبانی روایات پر مبنی تھی بعد میں ان روایات کی تصدیق کرکے انہیں تحریری شکل میں لایا گیا اور یہ اہم اصول اختیار کیا کہ ان شخصیتوں اور راویوں کے بیان سے تاریخ کو مرتب کیا جائے جو خود تاریخ کا کردار رہے ہوں اور جنہوں نے واقعات کا مشاہدہ کیا ہو۔ ابن خلدون کے زمانے سے زبانی روایات سے زیادہ تحریری شہادتوں پر بھروسہ کیا جانے لگا۔

ایشیا و افریقہ کے بہت سے ملکوں میں جہاں تاریخ لکھنے کا رواج نہ تھا وہاں آزادی کے بعد قومیت کے زیر اثر ماضی کو ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اس نئی تاریخ کی تدوین میں زبانی روایات سے مدد لی جارہی ہے زبانی روایات کی مدد سے تاریخ لکھنے کے تین مرحلے ہوتے ہیں مواد کو جمع کرنے کی تیاری کرنا' مواد جمع کرنا اور پھر اس کی تشریح

و تعبیر کرنا۔

زبانی تاریخ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ تحریری تاریخ صرف حکمران طبقہ کی تاریخ ہے اس میں عوام کی جدوجہد اور تاریخی عمل میں ان کے کردار کو نمایاں نہیں کیا گیا جب ہمارا ملک نو آبادیاتی میں تبدیل ہوا تو غیر ملکی حکمرانوں اور جدوجہد کو تحریر میں نہیں لایا گیا آزادی کے بعد اس بات کی توقع تھی کہ تاریخ کے دائرے کو وسیع کیا جائے گا اور اس میں عوام کے تاریخی کردار کو بھی شامل کیا جائے گا۔ مگر ہمارے پیشہ ور مورخین نے اس روایتی تاریخی اسلوب کو اپنایا اور تاریخ کو صرف حکمران طبقہ تک محدود رکھا۔

عوام کی تاریخی سرگرمیوں کی تفصیل نہ تو قدیم تاریخی ماخذوں میں ملتی ہے اور نہ جدید لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوامی سرگرمیاں یا عوامی رد عمل یا عوامی بغاوتیں جو انہوں نے حکمران طبقہ کے خلاف کیں تھیں بالکل بھلا دی گئیں یہ اگر تاریخ کے صفحات پر نہیں تو عوام کے سینوں میں محفوظ ہیں اور سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تاریخی سرمایہ لوگ گیتوں کہانیوں اور قصے کہانیوں میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے اس لیے مورخوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ تاریخ کی تعمیر و تشکیل میں اس مواد سے کام لے اس طرح ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان ہزار ہا مزدوروں اور محنت کشوں کی جدوجہد کو منظر عام پر لائیں جنہوں نے اپنے حقوق کے لیے اپنی جانیں قربان کیں اور جن کی محنت و مشقت سے ملک نے صنعتی اور فنی ترقی کی۔

جدید زمانہ میں تحریری تاریخ کے ساتھ ساتھ زبانی تاریخ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی کہ جن جن ملکوں میں شخصی حکومتیں قائم ہیں اور جہاں مورخ ڈر اور خوف سے عوام کی جدوجہد کو تحریر میں محفوظ نہیں کرسکتے یہ تاریخ زبانی روایات کے ذریعے عوام کے سینوں میں محفوظ رہتی ہے، پھر یہ آنے والے مورخ کا کام ہے کہ ان زبانی روایات کو تحریری شکل میں لاکر تاریخ کی تشکیل کو مکمل کرے۔

○

تاریخ کے نقصان اور فائدے

جب سے تاریخ کا علم وجود میں آیا ہے اور انسان نے اپنی ماضی کی یاداشتوں کو لکھنا شروع کیا ہے اس وقت سے مورخ یا تاریخ کو لکھنے والا واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنی پسند و ناپسند' تعصب' نفرت و محبت اور اپنی ذاتی رائے کو بھی اس میں داخل کرلیتا ہے۔ ذاتی جذبات کے علاوہ مورخ قومی و نسلی اور مذہبی نقطہ نظر سے بھی تاریخ واقعات کو دیکھتا اور پرکھتا ہے چنانچہ تاریخ ہر عہد اور ہر دور کے معاشرے کی پوری پوری عکاسی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ معاشرہ کی ذہنیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخ انسانی معاشرے پر منفی و مثبت دونوں اثرات ڈالتی ہے اس کے منفی اثرات میں سب سے ضرر رساں اثر وہ نفرت' عداوت' تعصب اور دشمنی ہوتا ہے جو یہ دنیا کی قوموں میں زندہ رکھتی ہے۔ مختلف اقوام کے درمیان خونریز جنگیں لڑائیں فتح و شکست ایک قوم کے ذریعہ ذلیل و خوار اور باہمی رقابت و دشمنی کی بنا پر معاشی و سیاسی نقصانات اٹھانا یہ وہ واقعات ہیں جو تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہتے ہیں اور قوموں اور معاشروں کے درمیان ان تلخ یادوں کو باقی رکھتے ہیں مثلاً" تاریخ یورپ میں انگلستان و فرانس' فرانس و جرمنی اور جرمنی اور اتحادی ممالک کے درمیان ہونے والی جنگیں شکستیں اور ان کے نتیجہ میں ہونے والے معاہدے نا انصافیوں کی یادوں کو تازہ رکھتے ہیں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی صلیبی جنگیں' ترکوں اور بلقان کی عیسائی ریاستوں کی باہمی رزم آرائیاں آج تک عیسائیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے بدظن کئے ہوئے ہیں۔ موجودہ دور میں اہل یورپ کا نو آبادیات کے ساتھ سلوک' تاریخ کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہورہا ہے۔ ماضی کی یہ تلخ یادیں جو تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں قوموں اور معاشروں کے درمیان نفرت و عداوت کو باقی رکھتی ہیں اور دنیا کو امن و آشتی کے بجائے جنگ و خوں ریزی کی جانب لے جاتی ہیں۔

تاریخ ماضی کی شاندار اور دلکش تصویر پیش کرتی ہے ماضی کی یہ دلکشی خصوصیت کے ساتھ زوال پذیر معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے کیونکہ رجعت پسند اور قدامت پرست تاریخ کی مدد سے اپنے نظریہ کی حمایت میں دلیل لاتے ہیں احیاء کی تحریکیں حال کے مسائل کا حل ماضی میں ڈھونڈتی ہیں اور عوام کے شعور اور ترقی کے جذبہ کو روک کر

دوبارہ سے معاشرہ کو ماضی کی موہوم اور دھندلی شان و شوکت میں واپس لے جانا چاہتی ہیں۔ ماضی کے احیاء کی تحریکیں حال کی جنگ کو ماضی کے زنگ آلود ہتھیاروں سے لڑنا چاہتی ہیں اور یہ ہتھیار وہ تاریخ کے سرد اسلحہ خانوں سے نکال کر استعمال کرتی ہیں کیونکہ تاریخ ہی وہ میوزیم ہے جہاں ان فرسودہ ہتھیاروں اور قدیم افکارو و نظریات کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔

تاریخ میں جس پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی وہ قوموں' معاشروں اور انسانوں کے درمیان جنگ و جدل اور قتل و غارت گری ہے جو جنگ میں کامیاب ہوا اس کی کامیابی اور فتح کو موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا' جنھوں نے زیادہ انسانی خون بہایا اور انسانی لاشوں کے انبار لگائے انہیں بہادر شجاع اور دلیر کہا گیا' ظالم' لٹیرے اور سفاک انسان فاتح عالم قرار پائے تاریخ کے اس نقطہ نظر میں اسی وقت تبدیلی آئے گی جب انسان اپنی فطرت کو بدلے گا اور جنگ کے بجائے امن کو ترجیح دے گا۔

تاریخ کا تابناک اور روشن پہلو یہ ہے کہ یہ انسان اور فطرت کے تصادم کی کہانی بیان کرتی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے کس طرح خود کو فطرت سے آزاد کیا۔ اس جدوجہد کے بارے میں فطرت کچھ نہیں بتاتی بلکہ یہ احساس تاریخ سے ہوتا ہے کیونکہ تاریخ میں انسان پوشیدہ ہے اس کی ترقی اس کے کارنامے اس کی روح اور اس کا جوہر یہ سب تاریخ سمیٹے ہوئے ہے تاریخ انسان کی ایک ایسی تخلیق ہے جس میں اس نے خود کو سمو لیا ہے۔

تاریخ نے انسان کو جاوداں اور لافانی بنا دیا ہے ورنہ تاریخ سے پہلے کے انسان کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تاریخ ہی ان راہوں کی نشاندہی کرتی ہے کہ جن پر چل کر وہ ماضی سے حال تک آیا ہے۔ اور تاریخ ہی میں وہ سب کچھ ہے جو ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے سیکھا ہے اور اسی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ارتقائی مراحل میں انسان کتنا مختلف تھا۔

تاریخ انسان کی مسلسل جدوجہد کی تصویر پیش کرتی ہے جس میں انسان ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف مصروف جہاد رہا اور تمام رکاوٹوں کے باوجود آگے کی جانب بڑھتا رہا تاریخ میں رجعت پسند قوتیں اپنی طاقت کے باوجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شکست سے دو چار ہوئیں اور ترقی پسند طاقتیں کامیاب ہوئیں۔

تاریخ میں بغاوت نے ہمیشہ معاشرے کی ترقی میں حصہ لیا یہ بغاوتیں چاہے سیاسی ہوں یا معاشی و معاشرتی اور مذہبی ان کے معاشرے پر ہمیشہ گہرے اثرات ہوئے اگر تاریخ میں یہ بغاوتیں نہیں ہوتیں تو معاشرے کے ادارے روایات اقدار' اور رسوم و رواج مضبوط اور مستحکم رہتیں اور انسانی معاشرہ ایک ہی نظام میں ہمیشہ مقید و نظر بند رہتا۔ لیکن ہر عہد اور ہر دور میں پیدا ہونے والی بغاوتوں نے اپنے عہد کے نظام کو چیلنج کیا اور منجمد معاشروں کو ہلا کر رکھ دیا معاشرے کی تخلیقی سرگرمیاں اسی وقت تیز تر ہوئیں جب معاشرے کے قائم شدہ اداروں اور قدروں کے خلاف بغاوت ہوئی۔

تخلیقی اور خیالات کی ندرت سے وہی افراد مالا مال ہوئے جنھوں نے روایات کے خلاف بغاوت کا اپنا شعار بنایا ایسے ہی افراد نے ادب موسیقی' مصوری' سنگ تراشی' سیاست' مذہب اور ثقافت میں نئے اسلوب نئے انداز اور زاویئے پیدا کئے اور اپنی تخلیقات سے معاشرے کی مردہ رگوں میں تازہ خون پیدا کیا۔

جن افراد نے اپنے عہد اور دور کے خلاف بغاوت کی اس جرم میں انہیں ذہنی و جسمانی کرب و اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ان کی بغاوت نے معاشرے کے جمود کو توڑ اور اسے ترقی کی جانب رواں دواں کیا۔

معاشرے کے خلاف یہ بغاوتیں حالات کی پیداوار ہوتی ہیں کیونکہ جب معاشرے کی روایات خستہ اور فرسودہ ہوجاتی ہیں تو ان پر ضرب لگانے اور پاش پاش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت باغی افراد اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں مگر ان کی اپنی زندگی اس بغاوت کی نذر ہوجاتی ہے اور صرف آنے والا عہد ان کی قربانیوں کی قدر کرتا ہے۔

تاریخ اگرچہ منفی و مثبت دونوں پہلو رکھتی ہے لیکن اس کا مطالعہ انسانی ذہن کو وسعت و کشادگی عطا کرتا ہے اور انسانی ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

تاریخ اور عوام

تاریخ نویسی کی ایک شکل اور روایتی تاریخ ہے جس میں خاص خاص شخصیتوں نظام حکومت' مذہبی اداروں اور جماعتوں کا ذکر کیا جاتا ہے چونکہ یہ تاریخ مخصوص شخصیتوں اور حکومتوں کے زیر اثر لکھی جاتی ہے اس لیے حکومتوں کے تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تعبیر و تفسیر بدلتی رہتی ہے اور واقعات کا بیان اور ان کی ترتیب بھی تبدیل کردی جاتی ہے یہ روایتی تاریخ بااقتدار طبقہ کی جانب سے اوپر سے مسلط کی جاتی ہے اس لیے حکومتوں کے بدلنے نظاموں کے تبدیل ہونے اور حکمران طبقوں کے زوال کے ساتھ ہی یہ تاریخ بھی ختم ہوجاتی ہے۔

ایک عرصہ تک یہ روایتی تاریخ جسے سرکاری پیشہ ور مورخ لکھتے رہے معاشرہ کے ذہن پر غالب رہی چونکہ یہ تاریخ حکمران طبقوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی اس لیے اس میں صرف ان ہی کی سرگرمیوں کو اجاگر کیا گیا اور نچلے طبقوں کی اہمیت کو نظرانداز کرکے انہیں تاریخ میں کوئی درجہ اور مقام نہیں دیا گیا۔

روایتی تاریخ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ تاریخ صرف بڑی اور عظیم شخصیتوں کے کارناموں کا مرقع ہے اور صرف یہ شخصیتیں ہی تاریخ ساز ہوتی ہیں۔ قدرت انہیں خاص صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کرتی ہے اور یہ اپنی صلاحیتوں کے ذریعے معاشرہ کی ترقی اور تمدن کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تاریخ میں شخصیتوں اور ان کے کردار کا نظریہ خاص حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا کیونکہ زمانہ قدیم اور قرون وسطٰی میں نظام بادشاہت اور مطلق العنان حکومتوں کا دور دورہ اور معاشرہ تہذیبی لحاظ سے عہد غلامی و جاگیرداری میں تھا اس لیے شخصیتیں' معاشرہ میں قوت و طاقت اور مراعات کی مالک تھیں ان کے اقتدار اور اثر و رسوخ کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ عوام کے ذہنوں میں اس خیال کو راسخ کیا جائے کہ ان کے حکمران خدا کے پسندیدہ بندے ہیں یہ خدا کا سایہ ہیں اور انہیں خدا نے خاص صلاحیتوں کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا ہے تاکہ وہ عوام کی راہنمائی کرسکیں اور ان پر حکومت کرسکیں۔

اسی خیال کو افلاطون نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ عقلمند کا کام حکومت کرنا ہے اور عوام کا محض ان کی تقلید ہے یہی بات بیسویں صدی کے مورخ ٹائن بی نے کہی کہ عظیم

شخصیتیں تہذیب پیدا کرتی ہیں اور ان کو ترقی دیتی ہیں جب کہ عوام کا کام محض ان کی تقلید کرنا ہے اور تقلید انسان کی سب سے کم رتبہ صلاحیت ہے۔ ارسطو نے بھی اس طبقاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے جو دلائل دیئے وہ زمانہ قدیم اور قرون وسطیٰ کے ذہن کی اچھی طرح عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے نظریہ کے مطابق فطرت نے کچھ کو آزاد پیدا کیا ہے اور کچھ کو غلام اس لیے غلاموں کے لیے غلامی انصاف پر مبنی ہے کیونکہ جو آدمی فطری طور پر آزاد پیدا نہ ہو وہ غلام ہی ہو گا آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ جو طبقے پیداوار کے لیے کام کرتے ہیں انہیں اور غلاموں کو آزاد شہری نہیں ہونا چاہیئے اس کا نعرہ تھا کہ "محنت کشوں کو حکومت نہیں کرنی چاہیئے اور حکمران طبقوں کو کام نہیں کرنا چاہیئے۔" بلکہ حکمران طبقوں کو کسی فن میں مہارت بھی حاصل نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس صورت میں وہ پیشہ کے قریب ہوجائیں گے اور اس کے ساتھ ہی اپنے طبقہ کی خصوصیات کھو دیں گے اس لیے حکمران طبقوں کو صرف آرام کرنا چاہیئے۔ اور فرصت کے کے لحات میں شکار و جنگ میں خود کو مشغول رکھنا چاہیئے۔

اسی قسم کے خیالات کا اظہار مشرق میں شاعروں' ادیبوں اور مفکروں نے کیا ہے جن کے مفادات موجودہ نظام سے وابستہ تھے شیخ سعدی نے ایک جگہ کہا ہے کہ "رموز مملکت خوش خسروان دانند" کہ حکومتوں کے رازوں کو صرف حکمران جانتے ہیں یعنی حکومت کے راز عوام کی فہم و عقل سے بالا ہیں اس سے حکمران و محکوم لوگوں کے درمیان ایک حد قائم ہوگئی اور دونوں فرائض مقرر کردیئے گئے ایک حکومت کرے گا تو دوسرا ان کی اطاعت کرے گا اور یہی فطرت کا نظام ہے۔

اس روایتی تاریخ میں عوام کا جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ کہ عوام کچھ تحقیق نہیں کرسکتے۔ ان کی عقل و فہم اور ان کی صلاحیتیں محدود ہوتی ہیں اس لیے وہ محض تقلید کرتے ہیں اور تقلید کرنے والے تاریخ کی تعمیر و تشکیل میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے تاریخ ساز صرف تخلیقی شخصیتیں اور تخلیقی اقلیتیں ہوتی ہیں اس لحاظ سے عوام تاریخ میں خاموش گمنام اور بے مقصد حیثیت رکھتے ہیں ان کے کسی عمل یا کردار سے تاریخ کے بہاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

حکمران طبقے عوام میں تاریخی شعور کو روکنے کے لیے کئی حربے اور طریقے استعمال کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ماضی کی شان و شوکت کو بیان کرکے حال کی ترقی

اور عمل کو روکا جائے چونکہ ماضی کی شان و شوکت اور سنہری دور کا تعلق صرف حکمران طبقوں سے ہوتا ہے اس لیے اس کو عوام کے ذہنوں پر مسلط کیا جاتا ہے تاکہ وہ موجودہ نظام کو اس کی کڑی سمجھ کر قبول کرلیں اگر عوامی نقطہ نظر سے ماضی کو دیکھا جائے تو وہ ماضی میں بادشاہوں آمروں اور مطلق العنان حکمرانوں کے ظلم و ستم کا شکار تھے اور ان کی اکثریت بحیثیت غلام اور کسان کے محنت و مشقت کی زندگی گزار رہے تھے ان کی عزت اور وقار کو ظلم و طاقت کے ذریعہ کچل دیا جاتا تھا اور وہ آزادی سے محروم سیاسی و معاشی اور معاشرتی طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ایک طرف سیاسی طور پر بادشاہوں کی حکمرانی تھی تو مذہبی طور پر علماء و صوفیا ان پر مسلط تھے اور وہ دین و دنیا و دونوں میں آزادی سے محروم تھے۔

تاریخ میں ایسے واقعات محفوظ ہیں کہ مغل دور میں جسے ہندوستان کی تاریخ کا شاندار زمانہ کہا جاتا ہے لوگ قحط' وبا اور فطری حادثات کے زمانہ میں غربت و مفلسی و بیماری اور عدم تحفظ کی وجہ سے مر جاتے تھے اور جب بادشاہ و امراء کے جلوسوں میں ان غربا پر پیسے نچھاور کئے جاتے تھے تو ان پیسوں کو حاصل کرنے کی غرض سے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے تھے اور کچل کر مرجایا کرتے تھے۔

تو کیا وہ شاندار ماضی ہے جس کے حصول کے لیے عوام جدوجہد کریں؟

موجودہ نظام کو برقرار رکھنے کے لیے دوسرا قدم یہ اٹھایا جاتا ہے کہ تبدیلی کے ہر عمل کو روک دیا جائے اس سلسلہ میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ ماضی میں جو مثالی معاشرہ قائم ہورہا تھا اس سے جتنا دور ہوں گے اور جتنی تبدیلی کریں گے اتنا ہی معاشرہ خراب ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے ہر نئی چیز اور بدعت' معاشرہ کو اس کے مقصد سے دور لے جارہی ہے۔ اس کے نزدیک معاشرہ میں صرف اس وقت تک امن و امان قائم رہ سکتا جب تک اس کی روایات و قدریں اور اس کا سیاسی و معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ اسی شکل میں رہے گا۔

لیکن تاریخ کے مطالعہ سے دو باتیں ہمارے سامنے واضح ہو کر آتی ہیں ایک یہ کہ انسان نے اب تک فطرت کے خلاف جو جنگ کی اس میں وہ آہستہ آہستہ فطرت کے خلاف کامیاب ہوتا چلا گیا۔ فطرت جو شروع میں انسان پر حاوی تھی۔ جس سے وہ خوفزدہ تھا اور جس کے مظاہر اس کے لیے دیوی دیوتا کا درجہ رکھتے تھے انسان کی صلاحیتوں نے فطرت کے ان مظاہر اور رازوں پر سے پردہ اٹھا کر فطرت پر قابو پالیا۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا

ہے کہ فطرت سے یہ جنگ کس نے لڑی؟ یہ جنگ کسی ایک شخصیت' یا اقلیت نے نہیں بلکہ تمام انسانوں نے بغیر کسی تفریق کے اجتماعی طور پر اور مل کر لڑی یہ انسانوں کی اجتماعی جدوجہد تھی کہ اس نے جنگلوں کو صاف کیا' دلدلوں کو قابل کاشت بنایا' جانوروں کو سدھایا اور اوزاروں کو ایجاد کیا۔ انسان کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس نے سیلابوں طوفانوں زلزلوں اور حادثات پر قابو پایا اور فطرت کے مقابلہ میں اپنی بقا کا تحفظ کیا۔

تاریخ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان برابر آزاد ہو رہا ہے۔ یہ آزادی صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ سماجی و معاشی پابندیاں بھی ایک ایک کرکے ٹوٹ رہی ہیں' بادشاہتیں' آمرانہ نظام حکومتیں اور ظالمانہ نظام ایک ایک کر کے ختم ہو رہے ہیں۔ وہ تمام ادارے روایات اور قدریں جن کے ذریعہ حکمران طبقوں نے عوام کو جسمانی اور روحانی طور پر جکڑ رکھا تھا وہ وقت اور تاریخ کے عمل کے ساتھ ساتھ ایک ایک کرکے ٹوٹ رہی ہیں۔ وہ تمام بند جو تبدیلی کے خلاف باندھے گئے تھے وہ عوامی شعور کے ساتھ ہی برابر کمزور ہو رہے ہیں۔

تاریخ کی ان دو تبدیلیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کوئی تخلیقی شخصیت اور اقلیت نہیں بلکہ عوام ہیں۔ معاشرہ کا ہر فرد اس کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے کیونکہ وہ اپنے ماحول کے تاریخی واقعات میں رہتا ہے اور یہ حالات پچھلے زمانے کے واقعات اور حال کی رفتار سے متعین ہوتے ہیں عظیم شخصیتیں بھی اس لیے عظیم بنتی ہیں کہ وہ معاشرہ کے افراد' ان خیالات' خواہشات اور امنگوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اس لیے وہ معاشرہ کی اجتماعی قوت کی نمائندگی کرتی ہیں وہ اس وقت کامیاب ہوتی ہیں جب وہ اپنے عہد کے لوگوں کے ساتھ چلنے پر تیار ہوں اس لیے تاریخی عمل معاشرہ کے تمام افراد کی سرگرمیوں سے مل کر بنتا ہے اور ان کی اجتماعی ذہنی و جسمانی کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

تاریخ کی یہ دو اہم تبدیلیاں انسان کے تابناک مستقبل کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ انسان نہ صرف فطرت پر مکمل قابو پالے گا بلکہ وہ ظالموں اور مطلق العنان حکمرانوں سے بھی چھٹکارا حاصل کرے گا اور سیاسی و معاشی اور معاشرتی طور پر آزاد ہو کر اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرے گا اس جدوجہد میں تاریخ ہمارے ساتھ ہے۔

تاریخ کو اگر روایتی انداز سے ہٹ کر دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ تاریخ کی تعمیر و تشکیل میں عوام کا کتنا عظیم حصہ ہے کہ جنھوں نے خاموشی سے انسانی ترقی کے لیے قربانیاں دیں اور انسانی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا غلامی کے معاشرے میں غلاموں نے محنت

و مشقت کرکے اقلیت کو یہ مواقع فراہم کیے وہ سیاسی مذہبی علمی و ادبی تخلیقات کے ذریعہ تاریخ کے دھارے کو آگے بڑھائیں۔ اس لیے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر یونان میں غلام نہیں ہوتے تو کیا یونانی علم و ادب' فلسفہ' موسیقی' سنگ تراشی اور مصوری کی دنیا میں ترقی کرسکتے ہیں؟ ان غلاموں نے اقلیت کو یہ فرصت کے لمحات دیئے جن میں انہوں نے تہذیب و تمدن کی ترقی میں حصہ لیا اس طرح جاگیر دارانہ معاشرے میں کسانوں اور کاشتکاروں کے کردار کو کس طرح سے فراموش کیا جاسکتا ہے۔ جنھوں نے محنت و مشقت کرکے حکمران طبقوں کو یہ مواقع فراہم کیے کہ وہ اپنے ذرائع اور صلاحیتوں کو معاشرے کی ترقی میں استعمال کریں۔ یہ انہیں افراد کی محنت کا نتیجہ تھا کہ علماء فقہا اور مذہبی اداروں کو جو زمینیں وقف کی گئیں اس کی آمدنی کے سہارے انہوں نے اپنا وقت تصنیف و تالیف میں گزارا۔ بادشاہوں' جاگیرداروں اور امراء نے زمین کی آمدنی کے سہارے ادیبوں شاعروں' موسیقاروں اور مصوروں کی سرپرستی کی۔ صنعتی دور میں ان ہزار ہا مزدوروں اور محنت کشوں کی قربانیوں کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ جنھوں نے گاؤں و دیہات کی صاف ستھری آب و ہوا اور سادگی کو چھوڑا اور شہر کی غلیظ و گندی آبادیوں میں رہ کر اٹھارہ گھنٹے فیکٹریوں کے پر شور اور آلودہ ماحول میں کام کیا یہ ان کی محنت و مشقت تھی کہ صنعتی ترقی پروان چڑھی ایک جگہ ا۔ لنگز لکھتا ہے کہ۔

"تاریخ کی دیوی سب سے زیادہ ظالم ہے اس کا فاتحانہ جلوس لاشوں کے ڈھیر پر سے گزرتا ہے صرف جنگ کے موقع پر ہی نہیں بلکہ اس پر امن معاشی ترقی کے زمانہ میں بھی۔"

اس لیے سوال صرف یہ ہے کہ تاریخ کو کس انداز میں لکھا جائے؟ واقعات کو کیسے بیان کیا جائے؟ روایتی تاریخ میں عوام کے کردار کو نظرانداز کرکے تاریخ کی تعبیر و تفسیر کی جاتی ہے مثلاً" جب یہ کہا جاتا ہے کہ "مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے یا سندھ دریائے سندھ کا تحفہ ہے" تو یہ کہہ کر بڑی خوبصورتی سے مصر کے فلاحین اور سندھ کے ہاریوں کی محنت و مشقت کو فراموش کردیا جاتا ہے جو انہوں نے مصر اور سندھ کو زرخیز و سرسبز بنانے میں کی۔ کیونکہ یہ انسان ہے یہ اس کا ذہن اور دماغ ہے یہ اس کی محنت و مشقت ہے جو تہذیبوں کو تخلیق کرتی ہے انہیں پروان چڑھاتی ہے اور ان کو کمال تک پہنچاتی ہے۔

روایتی تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ عوام کو ان کی قوت و طاقت کا احساس نہ ہونے

پائے ان کے شعور اور فکر کی ترقی نہ ہونے پائے اور ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہونے پائے کیونکہ صرف اس صورت میں ان کو بار بار دھوکا دیا جاسکتا ہے تاریخ کے عمل میں طبقاتی مفادات اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ عوام کو یہ تاریخی شعور ہو کہ ان استحصالی طبقوں نے نہ تو ماضی میں ان کا ساتھ دیا ہے نہ حال میں یہ ان کے ساتھ ہوں گے اور نہ ہی مستقبل میں یہ ان کے ہمدرد بن سکیں گے۔

پاکستان کی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ ہمارے عوام کو تاریخی شعور سے محروم کرکے حکمران اور استحصالی طبقے بار بار ان سے قربانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور اقتدار کی اس گردش میں عوام کے کوئی مسائل حل نہیں ہونے پاتے یہ گردش پنڈولم کی طرح ہے کہ اقتدار ادھر سے ادھر منتقل ہوتا رہتا ہے اور عوام اس کی کش مکش میں اپنی طاقت و قوت کھوتے رہتے ہیں اس گردش سے نجات اسی صورت میں ہوگی جب عوام میں تاریخی شعور آئے گا اور وہ ان استحصالی طبقوں کو ختم کرکے صحیح آزادی حاصل کریں گے۔

○

پائے ان کے شعور اور فکر کی ترقی نہ ہونے پائے اور ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہونے پائے کیونکہ صرف اس صورت میں ان کو بار بار دھوکا دیا جاسکتا ہے تاریخ کے عمل میں طبقاتی مفادات اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ عوام کو یہ تاریخی شعور ہو کہ ان استحصالی طبقوں نے نہ تو ماضی میں ان کا ساتھ دیا ہے نہ حال میں یہ ان کے ساتھ ہوں گے اور نہ ہی مستقبل میں یہ ان کے ہمدرد بن سکیں گے۔

پاکستان کی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ ہمارے عوام کو تاریخی شعور سے محروم کرکے حکمران اور استحصالی طبقے بار بار ان سے قربانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور اقتدار کی اس گردش میں عوام کے کوئی مسائل حل نہیں ہونے پاتے یہ گردش پنڈولم کی طرح ہے کہ اقتدار ادھر سے ادھر منتقل ہوتا رہتا ہے اور عوام اس کی کش مکش میں اپنی طاقت و قوت کھوتے رہتے ہیں اس گردش سے نجات اسی صورت میں ہوگی جب عوام میں تاریخی شعور آئے گا اور وہ ان استحصالی طبقوں کو ختم کرکے صحیح آزادی حاصل کریں گے۔

○

110

ابن خلدون

عبدالرحمٰن ابن خلدون 1332ء میں تونس میں پیدا ہوا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے مروجہ علوم میں دسترس حاصل کی۔ شمالی افریقہ اور اندلس کی مسلمان حکومتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ آخر زندگی میں اس کا قیام مصر میں رہا۔ 1400ء میں دمشق کے محاصرے کے موقع پر اس کی ملاقات امیر تیمور سے ہوئی۔ اس نے 74 سال کی عمر میں 1406ء میں مصر میں وفات پائی۔

عبدالرحمٰن ابن خلدون نے تاریخ کے واقعات و حوادثات کو سمجھنے کے لیے کچھ اصول و قوانین دریافت کئے اور ان کی روشنی میں ان تاریخ واقعات کی تاویل و تفسیر کی۔ ابن خلدون سے پہلے تاریخ میں ہونے والے واقعات' تغیرات اور انقلابات کو صرف اس حد تک سمجھا جاتا تھا کہ قوموں کے عروج و زوال سے عبرت حاصل کی جائے لیکن اب تک اس پہلو پر غور و فکر نہیں ہوا تھا کہ سلطنتوں اور تمدنوں کے اس عروج و زوال کے پس منظر میں کون سے عوامل ہیں۔ ابن خلدون کو اس لحاظ سے موجودہ مشرقی اور مغربی فلسفیوں اور مفکروں پر فوقیت حاصل ہے کہ اس نے اقوام کی زندگی میں ہونے والے ان تغیرات و انقلابات و حوادثات کے اصول دریافت کئے۔

ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ماحول اور اس کے ماخذ پر ایک نگاہ ڈالی جائے۔ فلسفہ تاریخ کے یہ اصول دریافت کرتے وقت اس کے سامنے اسلامی تاریخ اور اس میں ہونے والے انقلابات تھے خصوصیت سے مشرق و مغرب کی اسلامی سلطنتوں کی تبدیلیاں' حکمران خاندانوں کا عروج و زوال اور عرب و بربر قبیلوں کی زندگی کے تغیرات' ابن خلدون نے ان حالات کو پیش نظر رکھ کر تاریخ کی تشریح اور تاویل کی لیکن آج جب کہ دنیا کی تاریخ کے بہت سے تاریک پہلوؤں سے پردہ اٹھ چکا ہے اور دنیا کی تاریخ تحقیق کے ساتھ نئے سرے سے تدوین ہو رہی ہے اس پر ابن خلدون کے بہت سے اصول اور کلیہ شاید منطبق نہ ہوں کیونکہ اس کے سامنے صرف اسلامی تاریخ کا نمونہ تھا اور وہ دنیا کی دوسری اقوام اور ان کے تمدنوں کے ارتقاء اور زوال سے ناواقف تھا لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس کا مقام فلسفہ تاریخ میں اولیت کا ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں مختصراً" تاریخ اور تاریخ نویسی پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور اس بات پر بحث کی ہے کہ تاریخ میں مبالغہ آمیزی اور جھوٹی روایات کسی طرح داخل ہوجاتی ہیں۔ ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نے اپنے زمانے کے لحاظ سے جرات کرتے ہوئے مذہب کو سب سے زیادہ ذمہ دار ٹھہرایا ہے کیونکہ مذہب انسان کے ذہن کا اعتدال ختم کردیتا ہے جب تک اس ذہن اعتدال پر ہوتا ہے اور کوئی بات سنتا ہے تو اس کو پرکھنے کے اور اس کے جھوٹے اور سچے ہونے کے لیے پہلے اچھی طرح سے اس کی تحقیق و تصدیق کرتا ہے۔ لیکن زندگی پر مذہبی غلبہ ہو تو وہ ہر اس خبر اور واقعہ کو فوراً" صحیح تسلیم کرلیتا ہے جو اس کے مذہب و عقائد کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ مذہبی اثر سے اس میں تحقیق کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔

ایک دوسرا سبب جس کی وجہ سے تاریخ میں غلطیوں کا رواج ہوا۔ وہ بادشاہوں' سلاطین اور امراء کی خوشامد اور تعریف کی وجہ سے ہوا۔ ان کو خوش کرنے کے لیے مورخین نے بہت سی جھوٹی خبروں کو تاریخ میں لکھ کر بہت شہرت دی۔ اور یہ جھوٹ تاریخ کا ایک حصہ ہوگیا۔

ابن خلدون تاریخ میں مسلسل تغیر و تبدل پر یقین رکھتا ہے اس کے نزدیک ہر زمانے میں قوموں کی زندگی ان کے اخلاق و عادات و اطوار بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قوم یا معاشرہ ایک ہی حالت میں برقرار رہا ہو۔ معاشرہ کا یہ تغیر و تبدل حکومتوں کی تبدیلی کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ لوگ حکمرانوں کی تقلید کرتے ہیں اس لیے حکومتوں کے بدلنے سے لوگوں کے افکار' خیالات و نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں ہر حکومت اپنے ساتھ جداگانہ قدریں لاتی ہے اس لیے حکومتوں کے بدلنے سے تہذیب و ثقافت میں ہمیشہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔

ابن خلدون جب انسانی اجتماع یا معاشرے کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان مختلف انسانی اجتماعوں میں مشابہت و مخالفت دونوں عناصر ملتے ہیں۔ مشابہت کے عناصر میں سب سے اہم عنصر تقلید کا ہے۔ ہر معاشرے میں رعایا حاکم کی مفتوح فاتح کی فاتح مفتوح کی تقلید کرتا ہے۔ مشابہت کے یہ عناصر ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ چاہے ماضی ہو یا حال اور مستقبل۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ ماضی مستقبل کے ساتھ اس سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ جس قدر پانی پانی سے یہاں ابن خلدون ان مورخین پر کڑی تنقید کرتا ہے جو ماضی کے

انسانوں کے بارے میں مبالغہ آمیز کہانیاں بیان کرتے ہیں ان کے چھوڑے ہوئے آثار بلند و بالا عمارات اور پر شکوہ تعمیرات سے وہ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ زمانہ ماضی کا انسان بہت تیم سحیم' طاقتو اور زیادہ عمر پانے والا تھا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ ماضی کے انسان نے استعمال کی جن اشیاء کو چھوڑا ہے جیسے مکانات کھانے پینے کی برتن اور اوزار۔ ان کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی اپنے قدو قامت اور اطوار میں ہماری طرح ہی کا انسان تھا۔ ہاں اس کی تعمیر کردہ عظیم الشان عمارتوں اور آثاروں سے ہمیں اس کی ذہنی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ ابن خلدون انسانوں میں رنگ و نسل کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرتا۔ کیونکہ جلد کا رنگ آب و ہوا کی وجہ سے ہوتی ہے جو انسان کو سیاہ یا سفید بناتی ہے ورنہ انسان رنگت کے باوجود انسان رہتا ہے۔

تشابہت کے ساتھ ساتھ انسانی معاشروں میں مخالفت بھی پائی جاتی ہے اور ان کی عادتوں میں فرق بھی ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی توجہ جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا ہے۔ انسانی اجتماع گرم و سرد اور معتدل آب و ہوا سے متاثر ہوتا ہے۔ ابن خلدون انتہائی گرم اور سرد خطوں کے لوگوں کو غیر مہذب قرار دیتا ہے کیونکہ شدید موسمی اثرات انہیں جسمانی طور پر ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ معتدل آب و ہوا کے خطوں میں تہذیب و تمدن زیادہ ترقی کرتا ہے کیونکہ اس خطہ کے لوگ اپنے اخلاق میں کامل ہوتے ہیں۔ انہی خطوں میں پیغمبر آتے ہیں۔ یہیں شریعتیں پھیلی ہیں۔ علوم و فنون کی اشاعت ہوئی ہے اور تہذیب' تمدن و ثقافت نے ترقی کی ہے یہ لوگ شمالی افریقہ' شام و حجاز' عراق' ہند' سندھ' چین اور اندلس کے لوگ ہیں۔

ابن خلدون انسان کی اجتماعی زندگی میں پیدا ہونے والے واقعات' تغیرات اور حادثات کو حادثاتی تصور نہیں کرتا۔ یہ خود بخود پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ تغیرات ایک نظام کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ کچھ ایسے قوانین ہیں جو انسان کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی زندگی بسر کرے۔ انسان کے لیے یہ اجتماع اس لئے ضروری ہے کہ وہ بغیر دوسروں کی مدد اور شرکت کے تنہا زندہ نہیں رہ سکتا یہ انسان کی جبلت ہے کہ وہ مل جل کر رہے۔

سماجی و معاشرتی اجتماع کے علاوہ ایک اور اجتماع ہے جسے "سیاسی اجتماع" کہا جاتا ہے۔ یہ اجتماع فطری جبلت پر نہیں بلکہ انسان کی عقل و دانش اور فکر کے نتیجہ میں پیدا

ہوتا ہے۔ اور یہی چیز انسان و حیوان کو ایک دوسرے سے تمیز کرتی ہے۔ اس سیاسی اجتماع کی تشکیل کے بعد انسان چاہتا ہے کہ اس کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک طاقت ور شخصیت ہو جو معاشرے میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم رکھے۔ اس مرحلہ پر انسانی معاشرے میں حکومت کی بنیاد پڑی سیاسی اجتماع سے ابن خلدون ایک منظم سلطنت' قوم یا ریاست مراد لیتا ہے۔ اس سیاسی اجتماع کے تغیرات' انقلابات اور عروج و زوال کو اپنا موضوع بناتا ہے یہاں ابن خلدون روایتی اسلامی'انداز فکر سے ہٹ کر یہ بات کہتا ہے کہ سیاسی اجتماع کے لیے نبوت کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ ایسے بہت سے سیاسی اجتماعات ہیں جہاں کوئی نبی نہیں آیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا کہ زیادہ متمدن سیاسی اجتماع کے لیے نبوت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ انسانی معاشرے یا اجتماع پر جغرافیائی اور آب و ہوا کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے ابن خلدون اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ خوش حال اور فارغ البال قومیں زیادہ صحت مند نہیں ہوتیں کیونکہ جو خطے یا ممالک سرسبز اور شاداب ہوتے ہیں اور جہاں روزی حاصل کرنے کے لیے زیادہ محنت و مشقت نہیں کرنی پڑتی وہاں غذا کی کثرت اور وافر تعداد صحت کو خراب کردیتی ہے۔ آرام پسندی و عیش و عشرت نہ صرف جسمانی ضعف پیدا کرتا ہے بلکہ ذہن کو بھی کند کردیتا ہے ایسی قوم جنگی اوصاف اور خصلتوں سے محروم ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں جو قومیں بنجر علاقوں میں رہتی ہیں سادہ غذا استعمال کرتی ہیں اور محنت و مشقت سے روزی کماتی ہیں وہ زیادہ صحت مند' چاق و چوبند اور بہادر ہوتی ہیں۔

اسی طرح شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرے میں تہذیب کی ابتداء دیہات سے ہوتی ہے پھر یہ تہذیب شہروں میں اپنے کمال کو پہنچتی ہے کیونکہ جب دولت ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو عمدہ کھانے' آرام دہ مکانات اور بہترین لباس کی خواہش ہوتی ہے۔ شہروں میں رہنے والے جو صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اس میں وہ دیہات کی نسبت زیادہ کماتے ہیں۔ لذتوں کی فراوانی اور سامان آسائش برے اخلاق کو پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس دیہاتی زندگی سادہ ہوتی ہے اور ان کے اخلاق بھی سادہ ہوتے ہیں چونکہ شہری زندگی تمدن کے لحاظ سے کمال کا درجہ حاصل کرلیتی ہے اس لیے یہاں زوال کی علامتیں شروع ہوجاتی ہیں۔ زوال کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ شہری اپنی زندگی اور مال و دولت کی حفاظت اپنے حاکموں کے سپرد

کردیتے ہیں اور شہروں کے گرد فصیلیں بنوا کر اپنا دفاع کرتے ہیں۔ اس لیے اندرونی و بیرونی خطروں سے حفاظت کا احساس بہادری، حوصلہ و ہمت کا جوہر ختم کردیتا ہے جب کہ بدو جو کہ چٹیل میدان اور گھنے جنگل میں بغیر کسی حفاظت کے رہتے ہیں انہیں اپنے دفاع کے لئے ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان میں بہادری شجاعت اور خطرات سے مقابلہ کا حوصلہ باقی رہتا ہے۔

اس کے علاوہ شہری نہ تو ذہنی طور پر آزاد ہوتے ہیں اور نہ ان میں اظہار آزادی رائے کی جرات ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے حاکموں کے ماتحت محکومی کی زندگی گزارتے ہیں صرف امراء و روٴسا جو صاحب اقتدار ہوتے ہیں وہ خود مختار ہوتے ہیں۔

شہروں میں طرز حکومت بھی شہریوں میں تبدیلی لاتی ہے اگر حکومت آزاد خیال ہوتی ہے تو شہریوں میں بھی آزاد خیالی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن اگر حکومت استبدادی ہوتی ہے تو ان کی تمام آزادی سلب کر لی جاتی ہے حکومت کی سخت اور تعزیری سزائیں شہریوں کی خود داری اور حمیت کو ختم کردیتی ہیں جن کی پرورش تادیبی ماحول میں ہوتی ہے ان کی عزت نفس ختم ہوجاتی ہے اس لیے بدو عالی ہمت و عالی حوصلہ ہوتے ہیں جب کہ شہری قوانین اور آئین کی زنجیروں میں بندھے غلام ہوتے ہیں اس کی مثال ان طالب علموں سے دی جاسکتی ہے جو علماء و اساتذہ کی مجلسوں میں ادب و خوف سے علم حاصل کرتے ہیں اور ان کی ہیبت و خوف سے طالب علموں کی جرات و حوصلہ ختم ہوجاتا ہے۔

ابن خلدون مشرق و مغرب کی اسلامی سلطنتوں اور حکومتوں کے عروج و زوال میں جو سب سے زیادہ اہم عنصر دیکھتا ہے وہ "عصبیت" ہے عصبیت قبیلہ کی سیاسی معاشرتی اور سماجی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے اسلامی تاریخ کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچتا کہ اسلام کے ابتدائی چالیس سال چھوڑ کر باقی پوری تاریخ عصبیت کی تاریخ ہے یہ عصبیت کا جذبہ ہی ہوتا ہے جو ایک قبیلہ میں اتحاد و اتفاق برقرار رکھتا ہے اور اس اتحاد کی بدولت قبیلہ کی ترقی ممکن ہوتی ہے۔

ابن خلدون کہتا ہے کہ قبیلہ کے تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ ذہین ہوتے ہیں کچھ بہادر اور شجاع، بعض اوقات ایک فرد میں تمام اچھے اوصاف جمع ہوجاتے ہیں اور اس ایک فرد کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اس کا خاندان شرافت و عزت اور بہادری و شجاعت میں مشہور ہوجاتا ہے اور یہ اوصاف اسے دوسرے خاندانوں پر افضلیت عطا

کرتے ہیں۔

لیکن یہ افتخار اور شرافت ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہوتی ہے ایک خاندان میں یہ اوصاف زیادہ سے زیادہ چار نسلوں تک رہتے ہیں۔ خاندان کا بانی اپنے اوصاف کی ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتا ہے پھر اس کا بیٹا اس کے نقش قدم پر' اس طرح تیسری اور چوتھی نسل مقلد ہوکر رہ جاتی ہے ان میں ذاتی خوبیاں اور اچھے اوصاف پیدا نہیں ہوتے۔ وہ "پدرم سلطان بود" کے تصور میں محو رہتے ہیں اور اس مغالطے میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ یہ اوصاف انہیں ورثہ میں ملے ہیں۔ وہ خود کو معزز اور قابل احترام گردانتے ہیں اور احساس برتری کا شکار ہوکر دوسرے افراد کو حقارت سے دیکھتے ہیں اس مرحلہ پر لوگ ان سے بد دل ہوجاتے ہیں اور اس خاندان کے بجائے دوسرے خاندان کے کسی اہل شخص کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ اس طرح سے اقتدار ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ خاندان کے باعزت اور ممتاز ہونے کے لیے چار نسلوں کی شرط ضروری نہیں کیونکہ کبھی کبھی اس کا زوال تین نسلوں کے بعد ہی ہوجاتا ہے لیکن چار کے بعد یہ زوال یقینی ہوتا ہے یعنی پہلا بانی دوسرا عمارت کا نگران' تیسرا مقلد' اور چوتھا شرف و عزت کو کھونے والا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے ابن خلدون عصبیت کو قبیلہ کے اتحاد اور ترقی کے لیے ضروری سمجھتا ہے اگر ایک قبیلہ میں مختلف خاندان ہیں تو ان کے اتحاد کے لیے بالادست عصبیت کی ضرورت ہوتی ہے اگر یہ بالادست عصبیت نہ ہو تو قبیلہ میں اختلافات بڑھ جاتے ہیں لیکن بالادست عصبیت قبیلہ کو نہ صرف متحد کرتی ہے بلکہ ان میں اس خواہش کو بھی بیدار کرتی ہے کہ پڑوسی ملک پر حملہ کرکے لوٹ مار کی جائے۔ اگر پڑوسی ملک کی عصبیت کمزور ہوتی ہے تو وہ مفتوح ہوجاتا ہے۔ ورنہ حملہ آور قبیلہ ان سے مغلوب ہوکر ان کی سلطنت کا ایک حصہ بن جاتا ہے جیسے عباسی دور حکومت میں ترک ان سے مغلوب ہوکر ان کے حمایتی بن گئے۔ اس لیے کسی بھی سلطنت کی بقا کا دارو مدار اس کی عصبیت کی قوت یا کمزوری پر منحصر ہے۔ ہر سلطنت کا زوال اسی وقت ہوا ہے جب اس کی عصبیت کمزور ہوگئی۔ جیسے عباسیہ علویہ اور بنو حمدان۔

اگر قبیلہ کی عصبیت طاقتور ہوتی ہے تو وہ فاتح ہوکر سلطنت پر قبضہ کرلیتا ہے اور دشمن کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ سلطنت پر قبضہ کے بعد وہ متمدن زندگی اختیار کرلیتا ہے

اور آہستہ آہستہ آرام و آسائش و عیاشی کا دلدادہ ہوجاتا ہے اس کی بدویانہ زندگی اور سادگی ختم ہوجاتی ہے اس کے حسب و نسب میں ملاوٹ آجاتی ہے۔ متمدن زندگی کے زیر اثر شہر بستے ہیں۔ شہر اپنے ساتھ ضروریات زندگی کی فراوانی لاتے ہیں۔ آئین و قوانین شہریوں کو بزدل و پست ہمت بناتے ہیں اور یہی عوامل انہیں بالآخر زوال کی جانب لے جاتے ہیں ابن خلدون ان عوامل کی خاص طور سے نشاندہی کرتا ہے جو عصبیت کی کمزوری کا باعث ہوتے ہیں۔

1- ابتدا میں عصبیت کی اس قدر قوت ہوتی ہے کہ وہ اقتدار کے تحفظ کی خاطر حکمراں اور حکومت کی خاطر جان لڑا دیتے ہیں۔ لیکن جب شخصی حکومت تمام اقتدار کو اپنی ذات میں سمیٹ لیتی ہے تو ان میں ذلت و غلامی سرایت کرجاتی ہے اور آنے والی نسلیں اس غلامی کے ماحول میں پرورش پاکر بزدل بن جاتی ہیں۔

2- متمدن حکومتوں میں قبیلہ کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے چونکہ ٹیکس ادا کرنا باعث ذلت ہوتا ہے اس لیے اس کی عصبیت کمزور ہوجاتی ہے۔ زرعی پیشہ اختیار کرنے سے بھی اس میں غلامانہ اثرات پیدا ہوجاتے ہیں کیونکہ کاشتکاری کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی زمین پر رہنا چاہتا ہے جس کے باعث اس کی بدویانہ زندگی ختم ہوجاتی ہے۔

3- صاحب اقتدار طبقہ عیش و آرام کے تکلفات کو دن بدن بڑھاتا ہے ان کی آمدنیاں ان کے مصارف سے قاصر رہتی ہیں۔ لہٰذا جب حکمران انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ جنگی ٹیکس اور جرمانے دیں تو ان کی پوزیشن کمزور ہوجاتی ہے۔

ابن خلدون سلطنت کے قیام میں عصبیت کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب کوئی قوم اقتدار حاصل کرتی ہے تو حکومت کے عہدوں پر اپنے ہی لوگوں کو مقرر کرتی ہے لیکن قبیلہ کا ہر خاندان اقتدار میں شرکت نہیں کرسکتا۔ اور صرف چند با اثر خاندان اقتدار پر قابض ہوجاتے ہیں لیکن طاقت میں آنے کے بعد اور حکومت کی مراعات سے فائدہ اٹھا کر جب یہ لوگ عیش و عشرت میں پڑ جاتے ہیں تو حکومت پر بڑھاپا آجاتا ہے اور ان کی حالت ایسی ہوجاتی ہے جیسے ریشم کا کیڑا گھر بنا کر مرجاتا ہے۔ اس لیے ایک خاندان کے کمزور ہونے کے بعد دوسرا خاندان جس کی عصبیت طاقتور ہوتی ہے اقتدار میں آجاتا ہے اس طرح سے حکومت کچھ عرصہ تک ایک ہی قوم کے مختلف خاندانوں میں رہتی ہے یہاں تک کہ پوری قوم کی عصبیت ختم ہوجاتی ہے۔

عصبیت کی اہمیت کے بعد ابن خلدون سلطنت کے قیام اور اس کے عروج و زوال کے قوانین دریافت کرتا ہے وہ ہر سلطنت کی ابتدا اور بنیاد میں بدوی قبائل کی فتح دیکھتا ہے۔ ہر سلطنت کی ابتداء بدوی قبائل کی فتح سے ہوتی ہے۔ اور اس فتح میں ان کی عصبیت، سادگی، بہادری و شجاعت وہ عوامل ہوتے ہیں جن سے متمدن شہری حکومتیں شکست کھا جاتی ہیں۔

سلطنت کے قیام کے بعد یہ ایک ہی راستہ پر چلتی ہے اور مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی زوال پذیر ہوجاتی ہے ان ادوار کی نشاندہی ابن خلدون اس طرح سے کرتا ہے۔

1- پہلا دور جس میں فاتح قوم اقتدار میں پوری پوری شریک ہوتی ہے اس لیے حکومت کا دفاع بھی سب مل کر کرتے ہیں۔ اس دور میں بادشاہ قوم کے دوسرے افراد سے زیادہ منفرد نہیں ہوتا۔

2- دوسرے دور میں انفرادی و شخصی حکومت پیدا ہوتی ہے۔ اس دور میں بادشاہ اپنے خاص اور پسندیدہ افراد کو اعلیٰ عہدے دیتا ہے اور ان کی مدد سے اپنے اقتدار کی حفاظت کرتا ہے۔

3- تیسرا دور اقتدار کے استحکام کا ہوتا ہے اس میں بادشاہ کے خلاف مخالفت ختم ہوجاتی ہے اندرونی و بیرونی خطرات باقی نہیں رہتے۔ بادشاہ اپنی پوری توجہ ٹیکسوں کی وصول یابی اور آمدنی بڑھانے میں خرچ کرتا ہے۔ آمدنی کی وجہ سے عظیم الشان عمارتیں بنتی ہیں۔ وسیع شہر آباد ہوتے ہیں۔ بادشاہ اپنے پسندیدہ امراء اور غلاموں کو مال و دولت و عہدے دیتا ہے فوج کی تنظیم و اسلحہ کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔

4- چوتھا دور قناعت پسندی اور صلح جوئی کا ہوتا ہے اس میں بادشاہ اپنے اسلاف کی حاصل شدہ دولت و عزت پر قناعت کرتا ہے۔ اسلاف کے نقش قدم پر چلتا ہے اور حکومت کے ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا۔

5- پانچواں دور اسراف و فضول خرچی کا ہوتا ہے اس میں بادشاہ اپنے اسلاف کی دولت عیش و عشرت میں برباد کردیتا ہے اپنے خادموں کو بڑے بڑے عہدے دیتا ہے فوج میں افراتفری پھیل جاتی ہے اور انتظامی ڈھانچہ میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوجاتی ہے اس دور میں حکومت بڑھاپے سے دوچار ہوتی امراء کے گروہ پر ضعف طاری ہوجاتا ہے فوج کے مطالبات بڑھ جاتے ہیں اور صاحب اقتدار طبقہ عیش و عشرت میں ڈوب جاتا ہے۔ تقریباً

ہر سلطنت ان ادوار سے گزرتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ تاریخی قوت ختم نہیں ہوتی انسانیت ایک مقام پر نہیں ٹھہرتی۔ ایک سلطنت جب ختم ہوجاتی ہے تو اسی مقام سے دوسری سلطنت کی ابتدا ہوتی ہے۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ کے بعد ابن خلدون اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نئی سلطنت کا قیام جب ہی ہوتا ہے جب ایک قدیم سلطنت زوال پذیر ہو اگر زوال پذیر قوم پر ایک ہی قوم کی حکومت ہو تو اس کی فتح آسان ہوتی ہے لیکن اگر اس میں مختلف اقوام بستی ہوں تو فتح مشکل ہوجاتی ہے جیسے عربوں نے شام عراق اور مصر کو آسانی سے فتح کرلیا۔ لیکن شمالی افریقہ میں بربری قبائل کی عصبیت کی وجہ سے اس کی فتح میں مشکلات آئیں۔

بعض سلطنتیں اس قدر مضبوط ہوتی ہیں کہ پہلے ہی حملہ میں انہیں فتح نہیں کیا جاسکتا اور بعض سلطنتیں اس وقت تک مدافعت کرتی ہیں جب تک کہ دارالحکومت فتح نہیں ہوجاتا مرکز کے فتح ہونے کے بعد سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہے جیسے تاتاریوں نے بغداد کی فتح کے بعد عباسی حکومت کا خاتمہ کردیا۔

سلطنت کی بقا جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے عصبیت پر ہے لیکن کبھی کبھی عصبیت کی کمزوری کے نتیجہ میں سلطنتیں اپنے دفاع کے لیے غلاموں کی فوج پر اعتماد کرتی ہیں جیسے عباسی حکومت میں عربی عصبیت کی کمزوری نے ترک' دیلمی و سلجوقیوں کو موقع دیا کہ وہ عباسی سلطنت کی حفاظت کریں۔ لیکن پھر یہی حکومت پر قابض ہوگئے اور عباسی خلافت برائے نام باقی رہ گئی۔

ابن خلدون اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ حکومت و سلطنت کی حدود کا تعین اس کی قوت پر ہوتا ہے اگر اس کی حدود اس کی قوت سے زیادہ تجاوز کرجائیں تو پھر ان کی حفاظت کے لیے مزید فوج اور افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ سلطنت کا یہ پھیلاؤ و وسعت ملک کی مدافعت کو کمزور کردیتا ہے اس لیے جب حکومت پر بڑھاپا طاری ہوتا ہے تو اس کے دور دراز علاقے اس سے علیحدہ ہونے شروع ہوجاتے ہیں اور صرف مرکز باقی رہتا ہے۔ لیکن آخر میں مرکز بھی ختم ہوجاتا ہے۔

ابن خلدون سلطنت کے زوال کے جو اسباب دریافت کرتا ہے اس میں وہ اسے انسانی زندگی سے مشابہہ قرار دیتا ہے۔ اشخاص کی طرح سلطنت کی عمر بھی تین نسلوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نسل سے ابن خلدون کی مراد ایک شخص کی اوسط عمر ہے جو چالیس سال

ہوتی ہے اس اصول کی وضاحت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔

1- پہلی نسل بدویت کے زیر اثر جفاکش و بہادر ہوتی ہے۔ سلطنت کے قیام کے بعد اس کے اقتدار میں سب شریک ہوتے ہیں۔

2- دوسری نسل بدویت چھوڑ کر شہریت اختیار کرتی ہے۔ اس کی تنگ دستی خوشحالی میں بدل جاتی ہے اور اقتدار سمٹ کر ایک شخص کی ذات میں جمع ہوجاتا ہے۔

3- تیسری نسل سلطنت کے زیر سایہ ذلت و غلامی کی فضا میں پرورش پاتی ہے۔ اس دور میں عیش و عشرت شباب پر ہوتا ہے۔ معاشرہ اندرونی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ ان حالات میں سلطنت اپنا اندرونی و بیرونی دفاع دوسری قوموں یا غلاموں کی مدد سے کرتی ہے۔

4- چوتھی نسل میں سلطنت پر بڑھاپا چھا جاتا ہے اور وہ زوال پذیر ہو کر ختم ہوجاتی ہے۔ چونکہ تین نسلوں کی عمر 120 سال ہوتی ہے اس لحاظ سے حکومتوں کی عمر بھی اتنی ہی ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی خاص حالات ایسے ہوجائیں کہ حکومت تو شکست کے لیے تیار ہے مگر اس کے کوئی دعویدار نہیں۔

ابن خلدون سلطنت کے زوال کے اسباب کے ساتھ ساتھ تمدن کے زوال کے اصول بھی وضع کرتا ہے سلطنت کے قیام کے بعد شہروں کی بنیاد پڑتی ہے اور شہر تمدن کو پیدا کرتے ہیں چونکہ قبیلہ حصول سلطنت میں ایک طویل جنگ سے گزرتا ہے اس لیے فتح کے بعد اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آرام و سکون اور عیش و عشرت سے لطف اندوز ہو۔ اس مرحلہ پر شہروں کی بنیاد پڑتی ہے۔ جب انسان شہروں میں اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے تو ابتداء میں پیداوار اور وسائل کی ضروریات سے زائد ہوتے ہیں اس لیے وہ ان کا ایک حصہ خرچ کرتے ہیں اور باقی کا استعمال عیش و عشرت کے کاموں میں آتا ہے لیکن جب شہری آبادی میں اضافہ ہوتا ہے تو انسان کی تمدنی ضروریات بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سامان گراں ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ ضروریات زندگی کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں کاریگر و صنعت و حرفت کے پیشہ ور لوگ تو دولت مند ہوجاتے ہیں مگر عام فرد ان حالات سے متاثر ہوتا ہے یہی وہ مرحلہ ہے جہاں تمدن بھی سلطنت کی طرح زوال پذیر ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

ویچو

ژیام باتستا ویچو (1668ء - 1744ء) نیپلز میں پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر ہی سے ویچو کو رومی قانون' یونانی فلسفہ اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ 1699ء میں ویچو نیپلز یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ 1725ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب "جدید سائنس" شائع کی جس میں اس نے فلسفہ تاریخ پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی۔ ویچو مغرب کا پہلا فلسفی ہے جس نے فلسفہ تاریخ کو ایک ضابطے اور ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔

تاریخ کو سمجھنے کے لیے ویچو اس اصول کو مد نظر رکھتا ہے کہ جس طرح خالق اپنی مخلوق کو بہتر طریقہ سے سمجھتا ہے اسی طرح قوموں کی تاریخ جسے انسان نے بنایا ہے اسے انسان ہی کو بخوبی سمجھنا چاہئے۔

تاریخ کے مطالعہ سے انسانی ذہن کے ارتقاء اور ترقی کا پتہ چلتا ہے کیونکہ تاریخ میں وہ تمام درجے اور مراحل ہیں جن سے انسان مختلف زمانوں اور ادوار میں گزرا ہے اور مختلف ذریعوں اور طریقوں سے اس نے اپنی شخصیت اور کردار کو ظاہر کیا ہے۔ اس لیے انسان کے ذہن کو سمجھنے کے لیے تاریخ سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ کیونکہ تاریخ ہی اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ انسانی ذہن میں کس قدر تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اور وہ کبھی بھی جامد و ساکت نہیں رہا ہے۔ ابتدا میں اس کے سوچنے کا انداز شاعرانہ تھا۔ بعد میں اس کا انداز مفکرانہ ہوگیا۔ اس لیے تاریخ انسانی ذہن کی تبدیلیوں کا مطالعہ ہے۔

ویچو کی نظر میں ماہر لسانیات جن میں قواعد داں' مورخ اور نقاد آتے ہیں' صحیح معنوں میں تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور ترقی کو دنیا کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ کیونکہ فلسفی صرف دلیل کے ذریعے حقیقت کو تلاش کرتے ہیں جب کہ ماہر لسانیات انسانی خواہشات و جذبات اور ان کی طاقت کا مشاہدہ کرتے ہیں جس سے یقینی چیز کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ فلسفی اور ماہر لسانیات دونوں اپنے طریقوں کو متحد کریں اور پھر حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں پیش کریں۔

ویچو کے نزدیک انسانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاست' زبان اور

قانون کی ابتداء اور ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے اور مورخ اپنے تخیل' تحقیق و تنقید کی مدد سے ارتقاء کے مختلف مراحل کو سمجھے اور اسی ترتیب سے تاریخ کو تعمیر کرے۔ ویچو کی کتاب "جدید سائنس" میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قوموں کی فطرت کو سمجھتے ہوئے تاریخی پیچیدگیوں میں ربط ضبط اور سلسلہ ڈھونڈا جائے تاکہ اس کے ذریعے ماضی و حال اور مستقبل میں رشتہ قائم ہو۔

ویچو انسانی تاریخ میں جب معاشرے کے ارتقاء پر بحث کرتا ہے تو وہ معاشرے کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔

پہلا دور۔ دیوتاؤں کا۔ اس میں انسان فطرت اور اس کے مظاہر سے مرعوب ہوتا ہے وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ دیوتا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس دور میں پیشن گوئی کرنے والے پجاری معاشرے کی ہدایت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

دوسرا دور۔ سورماؤں کا دور ہوتا ہے۔ اس دور میں طاقتور' بہادر اور عظیم انسان اپنی صفات کی بنا پر عوام پر حکومت کرتے ہیں۔

تیسرا دور۔ عوامی ہوتا ہے اس دور میں معاشرے میں مساوات قائم ہوتی ہے اور عوامی حکومت تشکیل پاتی ہے۔

ویچو ان تین ادوار کی تشریح کرتے ہوئے ان کی ذہنی و شعوری خصوصیات بتاتا ہے پہلے دور کی خصوصیت مذہبی ہوتی ہے۔ اس دور کی فطرت و ماہیت' شاعرانہ ہوتی ہے۔ اس تصور کو تخیل کی مدد سے تخلیق کی جاتی ہے اور تخیل کے سہارے فطرت کے مظاہر کو خدا کی ذات سے ملایا جاتا ہے اپنے اسی تخیل کی وجہ سے وہ ان دیوتاؤں سے خوفزدہ ہوتا ہے جسے اس نے خود تخلیق کیا ہوتا ہے۔

دوسرے دور کی خصوصیت افسانوی ہوتی ہے۔ اس میں سورما اپنے آپ کو خدا کی اولاد بتاتے ہیں اور معاشرے میں اہم و ممتاز مقام حاصل کرلیتے ہیں اور اسی رشتہ کی بنا پر دوسرے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں۔

تیسرے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان ذہن و شعور کے لحاظ سے برابر ہوجاتے ہیں اور معاشرے میں قانون کی بالادستی قائم ہوجاتی ہے۔

ویچو زبان' قانون اور حکومت کو بھی تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ مثلاً" زبان میں پہلا دور جب آدمی اشاروں اور جسم کی حرکتوں سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔

تیسرے دور میں عوامی زبان بنی جس میں الفاظ تشکیل ہوئے اور سب نے انہیں تسلیم کیا۔

قانون کے پہلے دور میں مذہبی قوانین ہوتے ہیں جو معاشرے کو خدا کی جانب سے دیئے جاتے ہیں۔ جیسے موسیٰؑ کے قوانین' ان کی تشریح اور نفاذ کے لیے مذہبی پجاری ہوتے ہیں۔ دوسرے دور میں سورماؤں کے بنائے ہوئے قوانین ہوتے ہیں جیسے لکرگس کا قانون' تیسرے دور میں عوامی قانون ہوتے ہیں جو عوامی حکومتوں میں نافذ ہوتے ہیں ان قوانین کی بنیاد فطری مساوات پر ہوتی ہے۔

حکومت اپنے پہلے دور میں مذہبی ہوتی ہے اس میں حکمران کے نمائندے اس کی آواز ہوتے ہیں۔ دوسرے دور میں افراد اشرافیت قائم کرتے ہیں۔ جس میں تمام اختیارات افراد کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ حکومت کا تیسرا دور عوامی ہوتا ہے۔ اس میں قانون کی نظر میں سب برابر ہوتے ہیں۔ اس دور میں وہ بادشاہتیں اور جمہوری شہر آجاتے ہیں جن میں قانون کی بالادستی رہتی ہے اور ہر شہر کو برابر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ویچو اس تمام عمل کو تاریخی چکر (HISTORICAL CYCLE) کہتا ہے وہ اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ > یہ اس کی اصطلاح میں (RICORSI) یا تاریخ واپسی کا عمل ہے۔ متعدد سورماؤں کے زمانے میں معاشرہ "غیر مہذب احساسات" سے ابھرتا ہے اور ترقی کرکے ذہن و شعور کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ جسے وہ "غیر مہذب غور فکر" کہتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ایک تمدن ختم ہوجاتا ہے اس کے بعد دوسرا چکر شروع ہوتا ہے پھر معاشرہ مذہبی سورماؤں اور عوامی ادوار سے گزرتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس لیے ہر تمدن کی ابتداء عروج و زوال اس چکر میں آتے ہیں ہر نیا تمدن پہلے سے زیادہ وسیع ہمہ گیر اور جامع ہوتا ہے۔

ویچو جب انسانی تاریخ میں سیاسی ارتقاء کا ذکر کرتا ہے تو اس میں پہلے مذہبی حکومتیں' پھر اشرافیت' اس کے بعد جمہوریت اور آخر میں بادشاہت آتی ہیں۔ وہ جمہوری طرز حکومت کو معاشرے کے لیے مفید نہیں سمجھتا اس کے نزدیک جمہوریت ہمیشہ انتشار پیدا کرتی ہے۔ اس انتشار اور کش مکش کو روکنے کے لیے آمرانہ حکومتیں قائم ہیں۔ اس طرح جمہوریت ہمیشہ آمروں کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ اس لیے وہ بادشاہت کو بہترین طرز حکومت قرار دیتا ہے۔ جس میں معاشرے کو مکمل امن و امان اور حفاظت میسر آتی ہے اور یہ نظام کو اس سیاسی ہنگاموں اور انتشار سے محفوظ رکھتا ہے۔

ویچو آمریت کو معاشرے کے لیے انتہائی ضرر رساں اور نقصان دہ سمجھتا ہے کیونکہ آمریت کے قائم ہونے کے بعد معاشرہ انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔ اخلاقی گراوٹ عیاشی' آرام' سہل تنی' مردانہ خصوصیات کا خاتمہ و نسوانی انداز کی مقبولیت' دولت کا ارتکاز اور غریبوں و امیروں میں نفرت و عناد کا پیدا ہونا۔ جب معاشرہ ان حالات سے دو چار ہوتا ہے اور آمرانہ حکومتیں ان حالات کا مقابلہ کرسکتیں تو پھر کوئی طاقت ور قوم اسے مفتوح کرلیتی ہے کیونکہ یہ فطرت کا دستور ہے کہ کوئی فاسق و فاجر قوم جو اپنی خواہشات کے تابع ہو وہ کسی مضبوط اور طاقت ور قوم کی غلام بن جاتی ہے اس لیے جو قومیں اپنی حالت بہتر نہیں بنا سکتیں وہ حکومت کی اہل نہیں ان پر دوسروں کے ذریعہ حکومت کی جاتی ہے۔

جب کوئی قوم مفتوح ہوجاتی ہے تو پھر اس کی ساری ترقی اور نشوونما رک جاتی ہے جیسے رومی شہنشاہیت غیر مہذب قبائل سے شکست کھانے کے بعد پھر سے غیر مہذب ہوگئی جب ان کے ہاں تمدن کی ابتدا ہوئی تو پہلے مذہبی حکومت قائم ہوئی جو یورپ کا تاریک دور تھا۔ صلیبی جنگوں نے سورماؤں کے دور کی ابتدا کی اور پھر عوامی حکومتیں قائم ہوئیں ویچو کے ہاں یہ تاریخی واپسی کا عمل ہے۔

ویچو کے نزدیک آدمی کی پسند فطرت کے لحاظ سے بڑی محدود اور غیر یقینی ہوتی ہے اس کو یقینی بنانے کے لیے عقل سلیم' انسانی ضروریات اور فائدے ہوتے ہیں ضروریات اور فوائد کی بنیاد پر قوموں کے فطری قوانین بنتے ہیں۔ اس لیے تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی قسم کے خیالات و افکار و طریقہ زندگی اور نظام حیات مختلف قوموں میں پیدا ہوئے جو ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ خیالات و افکار آفاقی ہیں اور ان کی بنیاد حق و سچائی پر ہے اس لیے اس غلطی کا بھی ازالہ ہوجاتا ہے کہ قوموں کے فطری قوانین ایک قوم میں پیدا ہوئے اور وہاں سے دوسری قوموں نے انہیں اپنایا۔ اس غلط خیال کو پیدا کرنے والے مصری اور ایرانی تھے جن کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں تہذیب پھیلانے والے وہ ہیں۔ اس سے یہ غلطی پیدا ہوئی کہ "بارہ تختیوں والے قوانین' یونان سے روم آئے۔ حالانکہ مذہبی قوانین ہر قوم اور معاشرہ اپنی روایات و عقائد کی روشنی میں خود بناتا ہے۔ جس کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ دیوانی قوانین ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکتے ہیں لیکن "قوموں کے فطری قوانین

(NUTURAL LAWS OF NATIONS)

مختلف قوموں میں علیحدہ علیحدہ پیدا ہوئے اور بعد میں یہ قوانین جنگوں سفارتی تعلقات' معاہدوں اور تجارت کے ذریعہ مقبول ہوئے۔

جب آدمی فطرت کے قوانین اور واقعات کی وجوہات سے ناواقف تھا تو اس کے لیے یہ تمام کائنات سربستہ راز تھی۔ اس وقت وہ اپنے ذہن سے واقعات کی وجوہات پیدا کرلیتا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ چونکہ انسانی ذہن غور و فکر کی صلاحیت رکھتا ہے اس لیے جب وہ کسی چیز کو نہیں سمجھتا تو اسکے باوجود وہ کوئی رائے قائم کرلیتا ہے۔ مثلاً" علم طبیعات جاہلوں میں مابعد الطبیعات کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور وہ تمام راز اور واقعات جو اس کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں انہیں خدا کی مرضی قرار دیتا ہے یہ سوچے بغیر کی خدا کہ مرضی کیا ہوتی ہے؟ اور کس طرح عمل میں آتی ہے؟

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انسانی تصور طاقت ور ہے اور دلیل کمزور ہے کیونکہ شاعری اپنے زور بیان اور تخیلاتی بلندی سے بے جان اشیاء میں جان ڈالتی ہے اس کو اس طرح سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جب بچے بے جان کھلونوں سے کھیلتے ہیں تو ان کو زندہ تصور کرلیتے ہیں۔ اس اصول پر فرضی و بے بنیاد قصے کہانیوں لوگوں میں حقیقت بن جاتی ہیں۔

ویچو کی نظر میں الفاظ وہ ذریعہ ہیں جن سے انسانی ذہن اور روح کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ علم صرف اس کے اصول سے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ انسانی ذہن کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ' زبان کے معنی و اظہار میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی۔ مثلاً" اطالوی زبان کی ابتدا بڑی کھردری تھی۔ ابتداء میں "LEX" کے معنی گھونگے جمع کرنے کے تھے پھر یہ لفظ "LUEX" بنا' جس کے معنی شاہ بلوط کے درخت کے ہوئے اس کے بعد تبدیل ہوکر پھر یہ "LEX" بنا جس کے معنی اجتماع یا پارلیمنٹ کے ہوئے۔

اسی طرح ابتداء میں انسانی فطرت خام' کھردری اور بھونڈی تھی۔ پھر ذرا سخت ہوئی۔ اس کے بعد خوشگوار' نازک' حساس اور آخر میں بدچلن اور آوارہ جیسے ابتداء میں عظیم انسان پیدا ہوئے۔ جیسے سائیکلوپ (CYCLOPE) پھر عالی ظرف اور بلند حوصلہ جیسے اکیلیز (ACHILLES) پھر خطیب و انصاف پسند جیسے سسی پو افریکانس (SICIPOAFRICNUS) اور ارسٹائڈ (ARISTIDE) پھر بلند ہستیاں جن میں نیکی و بدی دونوں شامل تھیں۔ جیسے سکندر اور سیزر۔ آخر میں مایوس و دل شکستہ انسان جیسے تبریس

(TIBERIUS) اور سب سے آخر میں آوارہ اور بدچلن جیسے کالی گولا (CALIGULA اور نیرو (NERO)۔

ویکو تاریخ میں کچھ ایسے کلی واٹل اصول دریافت کرتا ہے جن پر تمام قوموں اور معاشروں کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً" تمام مہذب وہ غیر مہذب قوموں میں تین روایتیں عام نظر آتی ہیں۔ (1)۔ مذہبی طریقہ پر زندگی گزارنا (2) شادی بیاہ رسومات (3) اور مردہ کو دفن کرنا' کوئی قوم کسی قدر جاہل اور غیر مہذب ہو ان کے ہاں یہ تین روایات عام تھیں اس سے ثابت ہوا کہ ایک ہی قسم کی روایات پر ہر قوم کی تہذیب شروع ہوئی۔

ویکو آدمی کو فطری طور خود غرض بتاتا ہے اس لیے خود غرضی کی بنا پر انسان ہر کام اور ہر عمل میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے اس لیے یہ جذبہ اس پر قابو پالیتا ہے وہ اپنے جذبات کو انصاف کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان میں حیوانی جذبات غالب ہیں اور وہ اپنے فائدے کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیکن جب انسان معاشرے کے بندھنوں میں بندھتا ہے تو پھر اس کے جذبات میں تبدیلی آتی ہے شادی کے بعد جب اس کی خاندانی زندگی شروع ہوتی ہے تو وہ اپنی اور اپنے خاندان کی بہتری چاہتا ہے جب وہ شہری زندگی اختیار کرتا ہے تو اپنے اور شہر کے فائدہ کا خواہش مند ہوتا ہے پھر اس کا دائرہ دلچسپی بڑھتا ہے اور وہ اپنے ساتھ قوم کی فلاح چاہتا ہے۔ جب قومیں جنگ معاہدوں اور صلح ناموں کے بندھنوں میں جکڑ کر متحد ہوجاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے فائدے کے ساتھ پوری پوری انسانیت کا فائدہ چاہتا ہے لیکن ان تمام مراحل میں انسان بنیادی طور پر اپنے فائدے کا خواہش مند ہوتا ہے اس لیے صرف مافوق الفطرت طاقت و اثر سے اسے مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے خاندان ریاست اور انسانیت سے انصاف کرے۔ جو چیز انسانوں میں انصاف قائم رکھ سکتی ہے۔ وہ الہیٰ انصاف ہے جو خدا کی جانب سے قائم ہوتا ہے۔ اور معاشرے میں امن و امان برقرار رکھتا ہے۔

کانٹ

ایمانوئل کانٹ 1724ء میں کونگزبرگ کے مقام پر پیدا ہوا اور اسی شہر کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد ذریعہ معاش کے طور پر اعلیٰ خاندانوں میں ٹیوشنیں پڑھائیں۔ 1770ء میں اس کا کونگز برگ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر کے تقرر ہوا جہاں اس نے فلسفہ، منطق، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات اور دوسرے علوم پر لیکچر دیئے۔ 1774ء میں کانٹ نے تاریخ پر ایک مضمون لکھا جس میں اس نے اس نظریہ کو پیش کیا کہ آفاقی تاریخ کن اصولوں پر لکھنی چاہئے۔ یہ مضمون خیالات کی جدت اور فکر کی گہرائی کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے۔ 1804ء میں کانٹ کی وفات ہوئی۔

تاریخ قوانین کے دائرے میں عمل پذیر ہے اور انسان ان قوانین کے تحت فطرت کے سوچے سمجھے اور متعین منصوبے کو بغیر سوچے سمجھے پورا کررہا ہے۔ تاریخ کے ان قوانین کے پس منظر میں فطرت اپنی تمام قوتوں کے ساتھ موجود ہے اور انسان کو برابر آگے کی جانب دھکیل رہی ہے اور وہ لاشعوری طور پر اس کے تمام منصوبوں کی تکمیل کررہا ہے۔ اس لیے تاریخ کا موضوع "فطرت کے منصوبے ہیں" سائنسدان جب فطرت اور اس کے قوانین کا مطالعہ کرتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے فطرت کے قوانین کو دریافت کرلیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فطرت کوئی قانون داں ہے جو قانون بناتی ہے بلکہ اس قانون سے مراد فطرت کی ترتیب و تنظیم اور تدوین ہے۔ اس لیے مورخ جب فطرت کے منصوبوں کی بات کرتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ فطرت کسی دماغ، ذہن یا شعور کے ساتھ کوئی منصوبہ بناتی ہے اور پھر وہ منصوبہ تاریخی عمل میں پورا ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخی عمل ان منصوبوں پر اس طرح عمل کرتا ہے جیسے وہ کسی ذہن کے اشاروں پر چل رہا ہے۔

کانٹ تاریخ اور فطرت کے رشتے کو مستحکم رکھتا ہے کیونکہ اس نے تاریخی شعور کو ایک نئی فکر دی ہے وہ اس روایتی خیال سے اختلاف کرتا ہے کہ انسان خدا کے منصوبوں کی تکمیل کرتا ہے اور یہ کہ انسان محض آلہ کار ہے اور وہ ایک اعلیٰ ہستی کی راہنمائی میں

اس کے مقاصد کو پورا کررہا ہے۔ کانٹ کے اس نظریہ نے تاریخی شعور میں زبردست تبدیلی کی۔ اس نے نہج پر آفاقی تاریخ کی بنیاد رکھی جس سے انسان کے اعمال' اس کی ترقی اور فطرت کے منصوبوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کانٹ کے نزدیک فطرت کا مقصد مخلوق کی تشکیل سے یہ ہے کہ اس کا وجود برقرار رہے اور اس کی صلاحیتوں اور جوہر کی تکمیل ہو۔ فطرت کی یہ تبدیلی داخلی ہوتی ہے' خارجی نہیں۔ اس نے گھاس کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اسے گائے کھائے یا گائے کو آدمی کھائے بلکہ گھاس اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ گھاس ہونی چاہیئے۔

انسان کا جوہر اس کی عقل و فہم اور ادراک ہے۔ اس لیے فطرت نے انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ عقل کا پابند رہے۔ عقل و فہم اور ادراک کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کی زندگی میں تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ مثلاً" ایک شخص تمام علم ریاضی تخلیق نہیں کرسکتا بلکہ وہ اس علم سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس سے پہلے لوگ چھوڑ گئے ہیں۔ اس لیے انسان عقل و فہم کا نشوونما انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ تاریخی عمل میں پورا ہوتا ہے۔ انسان چونکہ عقل و فہم کا مالک ہے اس لیے اس کی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے لیے تاریخی عمل ضروری ہے۔ یہ تاریخی عمل عقل و ادراک کو ترقی دیتا ہے اس لیے انسانی تاریخ عقل' فہم اور ادراک کی تاریخ ہے۔

تاریخ اور فطرت کے اس رشتہ اور تاریخی عمل میں فطری قوتوں کے اثر کو ذہن میں رکھتے ہوئے کانٹ نے آفاقی تاریخ کے 9 اصول ترتیب دیے ہیں جن پر انسانی تاریخ گردش کررہی ہے۔

اول۔ فطرت نے اپنی مخلوق میں جو صلاحیتیں پیدا کی ہیں انہیں ظاہر ہونا چاہیئے جو انسانی عضو استعمال نہیں ہوتا یا اسے کسی مقصد کے لیے بروئے عمل نہیں لایا جاتا تو یہ فطرت کے خلاف ہوتا ہے اگر ہم اس نظریہ سے اختلاف کریں تو فطرت ایک ایسی شے کے طور پر ظاہر ہوتی ہے جو بغیر کسی مقصد کے متحرک ہے اور اس میں کوئی صلاحیت نہیں کہ وہ کسی قانون کو بنائے اور اس پر عمل کرائے اس صورت میں فطرت کے اندر "چانس" کا افسردہ اندھیرا ہے۔ فہم و ادراک کی روشنی نہیں۔

دوم۔ انسان جو فہم و ادراک کا مالک ہے اس میں فطری صلاحیتیں انفرادی طور

پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر پیدا کی گئی ہیں۔ فہم و ادراک کسی جذبہ کے تحت پیدا نہیں ہوتی یہ تجربات' ہدایات اور مشق کے بعد داخلی مرحلے سے گزر کر پیدا ہوتی ہے فطرت نے انسان کو زندگی کا تھوڑا وقت دیا ہے۔ اس لیے فہم و ادراک کے لیے اور اس کی ترقی کے لیے نسلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنی ذہانت اور تجربات کو دوسروں کے حوالے کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک اس کی تکمیل ہوجائے۔

سوم۔ فطرت نے انسان میں حیوانی خواہشات پیدا کیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اسے فہم و ادراک کی دولت سے مالا مال کیا ہے تاکہ انسان اس کے ذریعہ سے خوشی و مسرت کی تکمیل کرے فطرت اپنے نقطہ نظر سے کوئی بیکار کام نہیں کرتی اور اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ذرائع دریافت کرتی رہتی ہے۔ جب انسان کو اپنے ادراک اور اس کے استعمال کی آزادی دے دی گئی تو وہ اپنی خواہشات کا تابع نہیں رہا اور نہ ہی علم لدنی کو اس نے اپنا راہنما بنایا۔ وہ ہر شے خود تخلیق کرتا ہے اور خود ہی اسے اپنے حفاظت اور تباہی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ فطرت نے اسے نہ تو سینگ دیئے ہیں اور نہ پنجے کہ ان کے ذریعے اپنی حفاظت کرے اور نہ اس میں خوشی و مسرت کا جذبہ پیدا کیا کہ زندگی پر سکون رہے اس کی فہم دور رسی' احتیاط اور نیکی اس کی اپنی خواہش کی پیداوار ہیں۔ فطرت نے اس معاملہ میں انتہائی تحمل سے کام لیا ہے تاکہ انسان ابتدائی زندگی سے لے کر آخر تک فہم و ادراک کی تکمیل میں اپنی تمام صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لائے۔ اب تک انسان نے جو ترقی کی ہے اس کا انحصار اس کی اپنی انہی صلاحیتوں پر ہے۔ فطرت نے انسان کی بہبود سے زیادہ اس کی عقل کو اہمیت دی ہے۔ اس لیے اسے زندگی میں تلخ اور تکلیف دہ جدوجہد اور کوشش سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ فطرت کے اصول کے خلاف ہے کہ انسان آرام و سکون اور اطمینان کی زندگی گزارے۔ انسانی معاشرہ جب تک تاریخی گمنامی میں ہوتا ہے وہ ایک جگہ جامد و ساکت رہتا ہے اور فطری قوانین اسے اس طرح خاموش اور بے عمل نہیں دیکھ سکتے اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرے۔ اس سلسلہ میں تعجب خیز بات یہ ہے کہ پرانی نسل تھکا دینے والی محنت و مشقت اس لیے کرتی ہے کہ آنے والوں کو فائدہ ہو اور آنے والی نسل اس مشقت کے ذریعے فطرت کے منصوبوں کو ایک منزل اور آگے لے جاتی ہے۔ اب یہ آخری نسل کی خوش نصیبی ہوگی کہ وہ اس عمارت میں رہے گی' جسے ہزار ہا نسلوں نے قربانیوں کے بعد تعمیر کیا ہے۔ اس تعمیر

میں ان کا وہ جذبہ بھی شامل تھا کہ وہ اس سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسانی انفرادی طور پر فانی ہے اور مجموعی طور پر غیر فانی اور فطرت نے اسے یہ موقع دیا کہ وہ مجموعی طور پر اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح مکمل کرے۔

چہارم۔ فطرت انسان کو غیر متحرک اور ساکت نہیں رہنے دیتی اور وہ آپس کے اختلافات سے انسان کی صلاحیتوں کو ابھارتی اور ان کی پرورش کرتی ہے اس اختلاف سے مراد ان کی غیر سماجی سرگرمیاں اور فطری برائیاں ہیں جو انسانی معاشرے کو برابر تباہ و برباد کرنے کی دھمکی دیتی رہتی ہیں۔ ایک طرف تو انسان میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ آپس میں مل جل کر رہیں تو دوسری طرف اس میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے علیحدہ رہے کیونکہ وہ اپنے فائدے کو انفرادی اور ذاتی نقطہ نظر سے سوچتا ہے۔ اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرنے میں اسے مخالفت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ اس مخالفت کا جواب مخالفت سے دیتا ہے ہ مزاحمت اور مخالفت انسان کی صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت، عظمت، دولت، طاقت اور مرتبہ کے لیے جدوجہد کرے۔ اس جدوجہد کے نتیجہ میں صلاحیتیں ارتقائی طور پر ترقی کرتی ہیں اور اس کی وجہ سے تہذیب و تمدن اور ثقافت کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی سے فکر میں پختگی آتی ہے اور اسی سے اقدار و روایات بنتی ہیں۔

ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے بغیر جو انسان کی خود غرضانہ فانیت کی پیداوار ہیں۔ معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ ایک شخص چرواہا بن کر خاموش اور پر امن زندگی گزار سکتا ہے لیکن اس صورت میں اس کی تمام صلاحیتیں اس میں پنہاں اور پوشیدہ رہ کر ختم ہو جائیں گی۔ اور ایسا شخص اعلیٰ مقصد کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس لیے فطرت کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے انسان میں حسد، بغض، رشک، فخر و غرور اور طاقت و اقتدار کی ہوس پیدا کردی ہے ورنہ ان جذبات و خواہشات کے بغیر انسان کی تمام صلاحیتیں ہمیشہ کے لیے گہری نیند سو جاتیں اور انسانی زندگی بغیر کسی ترقی کے ختم ہو جاتی۔

انسان امن و سکون چاہتا ہے لیکن فطرت اس راز سے واقف ہوتے ہوئے کہ اس کی بہتری کے لیے کیا ضروری ہے فساد اور جھگڑے پیدا کرتی ہے۔ وہ خواہش کرتا ہے کہ آرام و اطمینان سے رہے لیکن فطرت اسے آرام سے نکال کر دکھ، تکلیف، مصیبت اور پریشانی میں ڈال دیتی ہے تاکہ اس کی صلاحیتیں ابھریں اور وہ ان سے چھٹکارہ پانے کے لیے

برابر جدوجہد کرتا رہے۔ فطرت انسان کی خواہشات و حسرت کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ اس نے انسان میں یہ جذبہ پیدا کردیا ہے کہ وہ اپنی حسرت کو بھی قربان کردے اور دوسروں کی خوشیوں کو بھی چھین لے۔ اس منصوبے پر وہ اندھا بن کر عمل کرتا ہے اور فطرت کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کے مظاہر حماقتیں لالچ' ظلم' درندگی اور ہوس ناکی ہیں۔ اور اس کی ترقی کی وجہ اس خواہشات جہالت اور اخلاقی کمزوریاں ہیں۔

پنجم۔ انسانی نسل کا سب سے بڑا مسئلہ جس کے حل کے لیے فطرت اسے مجبور کرتی ہے وہ ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جو آفاقی قدروں اور قوانین پر ہو اور جس میں صحیح آزادی کا استعمال ہو' ایک فرد دوسرے کو ختم نہ کرے اور فطرت انسان میں جن صلاحیتوں کو ابھارنا چاہتی ہے ان کا نشو و نما ہوسکے اور نسل انسانی ان صلاحیتوں کے ذریعے فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرسکے۔

فطرت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مکمل آزادی کے بجائے پابند اور محدود آزادی کو پسند کرے۔ جب انسان اپنی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے مل جل کر رہتا ہے تو وہ غیر قانونی اور لامحدود آزادی کو چھوڑ دیتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اس جذبہ سے چھٹکارہ نہیں پاتا کہ دوسروں کی آزادی میں دخل اندازی نہ کرے اور انہیں اس سے محروم کرکے خود تنہا فیض یاب نہ ہو۔ لیکن ان رجحانات کی وجہ سے معاشرے میں اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں اس طرح جیسے جنگل میں ہر درخت یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے درخت کو ہوا اور سورج کی روشنی محروم کردے۔ اس کوشش میں وہ برابر بلند ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہ بلندی انہیں خوبصورتی و شوکت ادا کرتی ہے۔ لیکن جو درخت جنگل سے دور تنہا علیحدہ اور آزاد پیدا ہوتا ہے اس کی شاخیں بے تکی اور نیچے کی طرف پھیلتی ہیں اس لیے ان میں نہ تو خوبصورتی ہوتی ہے اور نہ بلندی۔

ششم۔ انسان جب اجتماعی زندگی گزارتا ہے تو اسے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی سرگرمیوں اور حرکات پر نظر رکھے اور اسے اس بات کا موقع نہ دے کہ وہ دوسروں کی آزادی ختم کرکے اپنی آزادی کو ناجائز طور پر استعمال کرے۔ اس مقصد کے لیے قانون کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کی آزادی پر پابندی لگائے لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ انہیں توڑے اس لیے سربراہ یا اعلیٰ طاقت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی خواہش کو آفاقی خواہش میں تبدیل کردے چونکہ سربراہ یا اعلیٰ طاقت کا

حامل بھی انسان ہی ہوتا ہے اس لیے اسے بھی ایک اور اعلیٰ ہستی کی ضرورتی ہوتی ہے کہ جس کے خوف سے حق و انصاف سے کام کرسکے۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک اہم مسئلہ ہوتا ہے اور اسکا اب تک کوئی مکمل حل دریافت نہیں ہوا۔

ہفتم۔ دنیا میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ریاستوں کے آپس میں قانونی تعلقات ہوں جس طرح انفرادی طور پر غیر سماجی سرگرمیاں انسان کو ترقی پر مجبور کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر ریاست ایک دوسرے کے ڈر اور خوف سے بہتر تعلقات کی خواہش مند ہوتی ہے اور باہمی خوف کی وجہ سے ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہر ریاست ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے اور زمانہ امن میں بھی وہ اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کرتی رہتی ہے۔ تباہی' انقلاب اور داخلی خستگی کے باعث ایک ریاست دوسری ریاست پر قابو پالیتی ہے اس لیے چھوٹی ریاستوں کی حفاظت بین الاقوامی فیڈریشن پر مبنی ہے یہ خیال اگرچہ اس وقت محض ایک خواب اور تخیل معلوم ہوتا ہے لیکن یہ اسی طرح ممکن ہے جیسے ابتدائی زندگی میں انسان نے اپنی لامحدود آزادی کو حفاظت و آرام کی خاطر قربان کردیا تھا۔ اسی طرح ریاستیں امن و سکون کی خاطر ایک دوسرے سے مل کر رہنا پسند کریں گی۔

تمام جنگیں انسان کے ارادے سے نہیں ہوتیں بلکہ یہ فطرت کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہوتی ہیں تاکہ قوموں میں نئے تعلقات پیدا ہوں اور اس تباہی و بربادی سے نئے سیاسی نظام کی تشکیل ہو کوئی بھی سیاسی نظام ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا اسے بھی وقت کے ایک حصے میں انقلاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ شکست و ریخت اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک کہ ایک ایسا نظام نہیں آجاتا جسے مکمل کہا جائے۔

ہشتم۔ نسل انسانی کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فطرت کے چھپے ہوئے منصوبوں کی تکمیل کررہی ہے۔ انسان سیاسی دستور اور ریاست کو اس شکل میں تخلیق کرتا ہے تاکہ فطرت نے اسے جو صلاحیتیں دی ہیں وہ پوری طرح بروئے کار آسکیں اور ان کی نشوونما و ترقی ہوسکے۔

ریاستیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ صنعتی و تجارتی تعلقات انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آتے ہیں۔ اگر ان تعلقات میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو اس سے تمام ریاستیں متاثر ہوتی ہیں اگرچہ آج کل کے حکمراں عوامی بہبود کے لیے کچھ نہیں

کرتے۔ اور اپنے تمام ذرائع کو جنگ کی تیاریوں میں استعمال کرتے ہیں لیکن اگر عوام خود اپنی بہتری کے لیے جدوجہد کریں تو یہ حکمراں اسے روک بھی نہیں سکتے۔ جنگ کی صورت میں دوسری ریاستیں جو تجارتی و صنعتی رشتوں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہیں وہ بھی متاثر ہوتی ہیں یہ اپنی کوششوں سے بغیر کسی قانونی مدد کے' اس جنگ کو ختم کرانے کی کوشش کرتی ہیں اور ثالثی بننے کی پیش کش کرتی ہیں۔ یہ رجحان ایک ایسے ادارے کی تشکیل کی جانب پہلا قدم ہے جو اقوام عالم کو پور امن زندگی پر مجبور کرے گا۔ سیاسی انقلابات اور تبدیلیوں کے ذریعے فطرت اپنے منصوبوں کو مکمل کرے گی اور اس آفاقی ادارے کی سربراہی میں انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے عمل لائے گا اور یہ اس کی ترقی کی معراج ہوگی۔

نہم۔ تاریخ فطرت کے منصوبے کو تکمیل کی جانب جارہی ہے۔ مثلاً" یونانیوں کے علم کو رومیوں نے محفوظ رکھا' ان سے یہ علم غیر مہذب قبائل نے حاصل کیا اور ان سے یہ یورپ کی موجودہ اقوام تک پہنچا۔ اس روشنی میں اگر دوسری ریاستوں کی تاریخ کو دیکھا جائے ان کے قانون کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے خارجی تعلقات پر نظرڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ ایک خاص وقت تک قوم کو عظیم ترقی یافتہ بنانے میں مدد دیتی ہیں جب ان کی برائیاں وقت کے ساتھ بڑھ جاتی ہیں وہ اس نظام کو ختم کردیتی ہیں لیکن اس تباہی میں ترقی کی چنگاریاں ہوتی ہیں اس لیے ہر انقلاب تبدیلی' تباہی اور ترقی کی علامت ہوتا ہے۔

ہرڈر

ہرڈر 1744ء میں جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر "مہرن گن" میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم کوئنزبرگ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ جہاں اس نے کانٹ کے فلسفہ اور جغرافیہ پر لیکچر سنے اور ان سے بے انتہاء متاثر ہوا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے مختلف ملازمتیں اختیار کیں۔ اسی دوران اس کی ملاقات گوئٹے سے ہوئی۔ گوئٹے نے اسے 1776ء میں وائمر بلالیا۔ 1802ء میں اس کا انتقال ہوا۔ ہرڈر نے فلسفہ' الہیات' ادب' لسانیات اور تاریخ میں اس نظریہ کو پیش کیا کہ انسانی فطرت ایک جیسی نہیں ہے بلکہ مختلف ماحول اور حالات میں یہ بدلتی رہتی ہے۔

ہرڈر تاریخ کو سمجھنے کے لیے تین چیزوں کو لازمی خیال کرتا ہے "وقت' جگہ' اور قومی کردار" ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے سوالات سمجھ میں آسکتے ہیں۔ کہ سلطنتیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟ ختم ہوتی ہیں اور پھر دوسری شکل میں نمودار ہوتی ہیں یا یہ کہ ماضی میں کیوں خانہ بدوشوں کے درمیان بابل ونینوا کی تہذیب ابھری؟ اور کس طرح ساحل پر ٹائر (TYRE) آباد ہوا؟ کس طرح افریقہ میں مصر کی تہذیب پروان چڑھی؟ اور کیوں کر عربی صحرا میں یہودیوں کی ریاست قائم ہوئی؟ اور حقیقت ان تمام تاریخی واقعات کے پس منظر میں وقت' جگہ اور قومی کردار متحرک نظر آتا ہے۔

ہرڈر پہلا مفکر ہے جس نے اس جانب اشارہ کیا کہ انسان چونکہ مختلف نسلوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے آپس میں لاتعداد اختلافات ہیں۔ اس لیے انسانی فطرت ایک جیسی نہیں ہوتی بلکہ مختلف ہوتی ہے اس ضمن میں وہ دلیل دیتے ہوئے کہتا ہے کہ چینی تہذیب و تمدن جغرافیائی ماحول اور مخصوص آب و ہوا کی وجہ سے وجود میں نہیں آیا بلکہ یہ چینی قوم کی مخصوص فطرت اور مخصوص ذہن کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا اگر اس میں جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا میں کسی دوسری قوم کو رکھا جاتا تو یقیناً" وہ اپنے ذہن' کردار اور اپنی فطرت کے مطابق ان وسائل کو استعمال کرکے بالکل ہی دوسری تہذیب کو جنم دیتی۔ اس لیے تمام سیاسی و سماجی ادارے' روایات تاریخی تجربات سے نہیں بلکہ قوم کی

نفسیاتی خصوصیات کے نتیجہ میں وجود میں آتے ہیں۔

ہر نسل اور قوم کی اپنی ایک علیحدہ فطرت اور ذہن ہوتا ہے اور انسان جسمانی لحاظ سے مختلف نسلوں سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کے ذریعہ اس کی عادات رسومات اور اقدار کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہر نسل اپنی مخصوص نفسیاتی خصوصیات کے نتیجہ میں اپنی تہذیب و ثقافت کو پیدا کرتی ہے۔

چونکہ انسانی فطرت ایک نہیں ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہر نسل اور ہر قوم کی فطرت کو سمجھا جائے اور اس کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہر قوم کی نفسیاتی خصوصیات اس کی فطرت کو ٹھوس بنا دیتی ہیں۔ اس لیے مورخ کے لیے ضروری ہے کہ ایک معمولی فطرت کے بجائے مخصوص، ٹھوس اور مکمل فطرتوں کا مطالعہ کرکے ان کو دریافت کرے۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ہرڈر کہتا کہ تاریخ میں نسلی جذبہ بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ ہر آدمی کا تعلق کسی نہ کسی نسل سے ہوتا ہے اس لیے اس کی شکل و صورت، رہن سہن، غور و فکر، ایک ہی طریقہ، ترتیب اور ماحول میں تشکیل ہوتی ہیں اور انہیں بنیادوں پر "قومی کردار" کی تعمیر ہوتی ہے۔ کیونکہ اجداد کے طریقہ اور روایات گہری جڑ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اور پوری نسل کی رگ و پے میں سرایت کرجاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہودیوں کی مثال سب سے زیادہ درخشاں ہے۔ ان کی غور و فکر اور سوچنے کا انداز اور عمل ہر جگہ یکساں رہتا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری نسل سے خلط ملط ہوئے تب بھی ایک عرصہ تک انہوں نے اپنی روایات کو برقرار رکھا۔ یہی مثال مصری چینی، عرب اور ہندو قوم پر صادق آتی ہے جس قدر کوئی قوم علیحدہ رہتی ہے اور اپنے ماحول و روایات کی چار دیواری میں بند رہتی ہے اسی قدر اس کا قومی کردار پختہ ہوتا ہے۔

لیکن انسان درخت کی طرح ایک جگہ مضبوطی سے اپنی جڑیں جمائے ہمیشہ نہیں رہتا بلکہ یہ ایک متحرک اور بے چین شے کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا ہے۔ فطرت کی سختیاں، قحط، جنگ، وبا اور زلزلہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ دیس دیس پھرے۔ لیکن جب وہ اپنے ابائی وطن کو چھوڑ کر دوسری جگہ جاتا ہے تو اپنے ساتھ روایات و اقدار کو بھی لے کر جاتا ہے اور سختی سے ان پر کاربند رہتا ہے نئی سرزمین پر پرانے ناموں کو رواج دے کر ماضی سے اور وطن سے اپنا ذہنی تعلق قائم رکھتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں

کے باوجود سرزمین کی آب و ہوا اس کے کردار اور عادت کو متاثر کرتی ہیں۔ جیسے فونیسقی بحر احمر سے بحر روم میں منتقل ہوئے اور اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰؑ کی راہنمائی میں وطن چھوڑ کر نئی سرزمین کی تلاش کی۔ تاریخ میں قوموں کا یہ سفر اور ہجرت ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کوئی قوم اور نسل ایک جگہ مستقل آباد نہیں رہتی۔ وہ ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے نسلیں ایک دوسرے سے خلط ملط ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے آج کوئی قوم خود کو خالص نہیں کہہ سکتی۔ قدرت نے انسان کو یہ صلاحیت اور طاقت دی ہے کہ وہ جس جگہ چاہیں پیدا ہوں۔ جس جگہ چاہیں پروان چڑھیں اور ترقی کریں اس لیے دنیا کی تمام نسلیں ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہیں۔

ہرڈر سلطنت کی ترقی اور زوال کو بھی وقت اور جگہ سے منسوب کرتا ہے خانہ بدوش قبائل جو اپنی روایات پر قائم رہتے ہیں ان کے ہاں بادشاہت کی مدت کم ہوتی ہے۔ اگر کوئی سلطنت دور شباب میں بڑے شہروں پر قبضہ کرلے تو اس کی وسعت حکمرانی میں اضافہ ہوجاتا ہے لیکن اس میں مضبوطی و استحکام پیدا نہیں ہوتا اور ایک بادشاہ کی موت پورے نظام کے خاتمہ کا باعث ہوجاتی ہے۔ یہی بابل' نینوا اور پرسی پولس کے ساتھ ہوا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک درخت سر اٹھاتا ہے اور پھیلتا ہوا اردگرد کے علاقہ پر چھا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں تو ہوا کا ایک طاقتور جھکڑ اسے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اسی طرح سلطنت ایک غلام کی غداری یا گورنر کی بغاوت پر ختم ہوجاتی ہے۔ مطلق العنان اور مضبوط حکمران تخت و تاج سے محروم ہوجاتے ہیں اور کمزور ان کی جگہ لے لیتے ہیں جیسے بخت نصر' جس سے ایشیا لرزتا تھا موت کے بعد اس کے جانشینوں نے پوری سلطنت کو تباہ کردیا۔

ہرڈر انسانیت کی تاریخ کو انسان کی طاقت' عمل اور رجحانات کی فطری تاریخ بتاتا ہے جو جگہ اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے تاریخ کے مطالعہ کے بعد بار بار ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ اور ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس لیے جب مورخ اس سوال پر غور کرتا ہے کہ آخر یونان کیوں تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا؟ تو اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ "کیونکہ یونان کا وجود تھا اور اس ماحول میں رہتے ہوئے وہ ترقی کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔" یا دوسرا سوال کہ سکندر نے ہندوستان پر کیوں حملہ کیا؟ تو اس کا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ "سکندر فلپ کا لڑکا تھا۔ باپ کے عزائم' قوم کے

کارنامے' ماحول کے اثرات وغیرہ اس کے کردار کو بنانے والے تھے اور اس بات کے ذمہ دار تھے کہ سکندر کو فاتح بنائیں۔" اب اگر اس کے کارناموں کو کسی مافوق الفطرت طاقت سے منسوب کردیں یا اس کی بہادری و شجاعت کو تقدیر سے ملادیں تو یہ تاریخ کے ساتھ بے انصافی ہوگی اور اس کے سپاہیانہ کارناموں جنگی تدابیر اور منصوبوں کی اہمیت کو ختم کردے گی۔

قومیں دوسروں سے مل جل کر اور خلط ملط ہو کر بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ یونان نے اپنے آپ کو ایشیا والوں کے حملوں سے محفوظ رکھا لیکن بعد میں وہ رومیوں' گوتھوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اس عمل میں تہذیب و تمدن کی روایات ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئیں اور وقت اور طاقتوں کے عمل میں مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے متاثر کیا۔ تاریخ میں ایسی ہزار ہا مثالیں ہیں۔ مثلاً" یہ فونیقیوں نے یونانیوں کو الفاظ سکھائے اور جب یونانیوں نے بیکٹریا ہجرت کی تو انہیں ہومر کی شاعری سے روشناس کرایا۔ حالانکہ ہومر نے ان کے لیے نہیں لکھا تھا۔

ہرڈر اسے تقدیر کا کرشمہ سمجھتا ہے کہ وہ جس جڑ کو چاہے محفوظ کردے اور جس کو چاہے فنا۔ ہوسکتا ہے کہ ہومر سے اچھا کسی اور شاعر کا کلام ہو جو تقدیر کے ہاتھوں گمنامی میں روپوں ہوگیا ہو۔

ہرڈر جستجو اور علم کی خواہش کو انسان کی سب سے بڑی خواہش سمجھتا ہے کیونکہ ہر انسان اس تگ و دو میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ فطرت کے راز سے واقف ہو لیکن اس کا دائرہ عمل' فطرت' وقت اور جگہ ہے وہ زندگی کے محدود چکر ہی میں رہتے ہوئے کچھ کرسکتا ہے یہی اصول قوم' ملک اور سلطنت کے عروج و زوال پر بھی صادق آتا ہے۔

ہرڈر اس بات کا قائل ہے کہ سازگار ماحول اور حالات میں زندگی کی تکمیل حاصل کی جاسکتی ہے اس میں پھر نہ تو اضافہ ہے اور نہ ہی اسے آگے بڑھایا جاسکتا ہے بلکہ اس کی صرف تقلید کی جاسکتی ہے۔ مثلاً" ہومر نے شاعری میں زور بیان کو کمال تک پہنچایا۔ اس کے بعد اور کوئی ہومر پیدا نہیں ہوا۔ ہومر کے رزمیہ پھول ہیں جن میں اضافہ کرنے والوں نے دو چار پتیوں کا اضافہ ضرور کیا لیکن کوئی بھی اس بلندی کو نہیں چھو سکا۔ اسی طرح یونانی ادیبوں نے المیہ کا تمام مواد ختم کردیا اور اب آنے والے انہیں مختلف پہلوؤں سے بدل بدل کر لکھ رہے ہیں۔ قدیم آرٹ و ادب کی مثال اس درخت کی مانند ہے جو

خزاں کا شکار ہوگیا ہو لیکن اس کے زرد اور بکھرے ہوئے پتے زمین کو زرخیزی اور تازگی دیتے ہیں اور اس سے دوسرے درخت پیدا کرتے ہیں۔ شیکسپئر' سوفوکلس' ملٹن' بولنگ بروک' اور پیر یکلس ایک ہی سلسلہ کی کڑایں تھے جنہوں نے ادب کے گلستان میں خوشبو بکھیر دی۔

ہرڈر تاریخ میں ہر چیز اور شے کو فانی قرار دیتا ہے اس کے نزدیک کوئی ادارہ قدر یا روایت لازوال اور ابدی نہیں۔ اس لیے جب کبھی کسی سیاسی نظام کو استحکام ہوتا ہے یا اس کے انتظام سلطنت میں مضبوطی آتی ہے تو آنے والی نسل کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ مٹا دیا جائے۔ کیونکہ وہ پرانی اقدار اور روایات کے اندھیروں میں محدود زندگی گزارنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے ذہن کی وسعتوں سے نئی دنیا آباد کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان کی صحت مند اور جوان خواہشات نحیف و کمزور ڈھانچہ کو گرادیتی ہیں لیکن وقت کے ساتھ یہ روایات بھی پرانی ہوجاتی ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لیے دوسری نسل تیار ہوجاتی ہے زندگی اور موت عروج و زوال کا یہ سلسلہ اسی طرح بغیر خاتمہ کے چلتا رہتا ہے۔

ہرڈر کے نزدیک آدمی فطرت کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اس کی جسمانی ساخت اس قسم کی ہے کہ کمزور ہونے کے بعد دوا اسے صحت مند نہیں بنا سکتی ہے۔ انسان اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ آزاد ہے لیکن اس کی زندگی کا ہر لمحہ تقدیر کے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا ہے اور وہ مجبور ہے کہ نپے تلے اور متعین راستے پر چلے یہ اس کی قسمت اور تقدیر ہے کہ وہ زندہ رہے اور پھر مرجائے۔ ایک دانشمند جب اپنی زندگی کے دن پورے کرکے قبر میں سوجاتا ہے تو اس کا جانشین بچہ کی حیثیت سے اس کی جگہ لے کر اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ اسی طرح سال پر سال گزرتے ہیں۔ سورج غروب ہوتا ہے رات آتی ہے اور انسانیت نئے چاند کی روشنی سے فیض اٹھاتی ہے۔ یہ ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ ایک فرد کے بعد دوسرا فرد' ایک نسل کے بعد دوسری سلطنت آتی ہے اور تاریخ کے اس سلسلہ میں کوئی خلا اور شگاف پیدا نہیں ہوتا۔ قومیں پھلتی پھولتی اور زوال پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن تہذیب کی بالیدگی بڑھتی رہتی ہے۔ نئی صورتیں نئی جگہیں نیا ماحول اور زندگی کی نئی قدریں اسے رعنائی بخشتی رہتی ہیں۔

لیکن المیہ انسان کی تقدیر پر چھایا ہوا ہے انسان کو اکزین کے پہیہ کے گرد باندھ دیا گیا ہے کہ وہ مسلسل مشقت کئے جائے وہ سسی فس (SISY PHUS) کی طرح مسلسل پتھر

توڑ رہا ہے۔ انسان پیہم جدوجہد کوشش اور سعی کرتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ اس کی خواہش پوری ہو وہ مر جاتا ہے۔ اس کی تمام محنت لا حاصل ثابت ہوتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک سخت چٹان کاٹ رہا ہے یا سمندر کی موجوں پر لکھ رہا ہے یہ موجیں پھیلتی گرداب بناتی آگے چلی جاتی ہیں اور انسان کی محنت و کوشش و خیالات و تصورات کے عظیم محلات پاش پاش ہوجاتے ہیں۔

تو انسان کیوں یہ لاحاصل اور بے کار محنت کرتا ہے؟ یہ کس کی بددعا ہے کہ وہ اپنی مختصر زندگی میں محدود ایام میں روزانہ اپنے تلے کام کئے جاتا ہے؟ وہ آخر کس مقصد کے لیے اپنی کمر پر بوجھ لادے ہوئے ہے؟ جسے وہ اپنے ساتھ اپنی قبر تک لے جاتا ہے' جب کہ اسے یہ تک نہیں پوچھا جاتا کہ کیا وہ اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار ہے؟ اسے یہ تک آزادی نہیں کہ وہ کس جگہ اور کس وقت پیدا ہونا چاہتا ہے۔ تمام انسانی زندگی اور انسانی تاریخ گناہوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ خراب دستور' ظالم حکمراں اور بری حکومتیں یہ سب انسان کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں ایشیا افریقہ اور دنیا کے مطلق العنان حکمرانوں کے زمانے کو دیکھو' ان ظالموں کے کارناموں کا جائزہ لو جو روم کے تخت پر بیٹھے اور جن کے دور حکمرانی میں صدیوں انسانیت سسکتی رہی۔ بروٹس کا زوال ہوا' انٹونی فتح یاب ہوا۔ جرمینکس (GARMANICUSS) مرتا ہے ٹبریس' کالی گولا اور نیرو حکومت کرتے ہیں ارسٹائڈ جلا وطن ہوتا ہے۔ کنفیوشس آوارہ پھرتا ہے۔ سقراط اور سینکا کو مروا دیا جاتا ہے۔ تمام تاریخ درد' الم' دکھ اور تکلیف کے المیہ میں لپٹی ہوئی ہے۔ خون ریزی' مکاری' منافقت اور جھوٹ ہر جگہ فتح یاب اور کامران ہے۔

ہیگل

جارج ولہم فریڈرش ہیگل 1770ء میں اسٹٹ گارڈ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم ٹیوبن گن یونیورسٹی میں حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں کانٹ اور روسو کے نظریات سے متاثر ہوا تعلیم کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ برلن اور فرینکفرٹ یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے بعد ینیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگیا۔ نپولین کی فتوحات نے جرمن کو بری طرح متاثر کیا جس کی وجہ سے ینیا یونیورسٹی کچھ عرصہ کے لیے بند ہوگئی۔ اس لیے ہیگل وہاں سے بیوریا چلا گیا 1816ء میں وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ پھر 1831ء میں فشٹے کی جگہ برلن یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ جہاں آخر وقت تک پڑھانے میں مصروف رہا۔ 1831ء میں اس نے وفات پائی۔

ہیگل کی تصانیف نے انیسویں صدی کے فلسفہ' سیاست اور عمرانی علوم کو بڑا متاثر کیا۔ اس کے خیالات و نظریات کی چھاپ اس دور کے ہر فلسفی کے نظریات میں پوری طرح نمایاں ہیں۔ آخری عمر میں ہیگل نے فلسفہ تاریخ پر لیکچر دیئے۔ جنہوں نے نظریہ تاریخ میں انقلابی اضافہ کیا۔

تاریخ میں واقعات کا انبار' ان کی تراش خراش' کتر بیونت کانٹ چھانٹ اور ترتیب معلومات کا ایک ذریعہ تو ہوسکتے ہیں لیکن محض واقعات کوئی تاثر اور کوئی شعور و احساس پیدا نہیں کرتے۔ اس لیے شعور و احساس کو پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ واقعات کے پس منظر میں جو اسباب' وجوہات اور حالات ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ ان پر تنقید و رائے زنی کی جائے ان کی اصل روح کو سمجھا جائے اور پھر واقعات کے سلسلہ اور ترتیب کو دیکھا جائے تو اسی صورت میں تاریخ افادیت کی حامل ہوسکتی ہے۔

ہیگل تاریخ کا مقصد یہ نہیں سمجھتا کہ صرف اور صرف واقعات کا تعین کیا جائے اور انہیں خاص ادوار میں بیان کیا جائے بلکہ تاریخ کا اولین فرض یہ ہے کہ ان اسباب و علل اور دلائل پر غور کیا جائے۔ جنہوں نے یہ واقعات پیدا کئے ہیں۔ اسی لیے فلسفہ تاریخ انسانی تاریخ کو سمجھنے میں بڑا مددگار ہوتا ہے اور اس کی مدد سے انسانی تاریخ کو ابتدا سے

لے کر موجودہ ترقی یافتہ زمانہ تک سمجھا جاسکتا ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے ذہن جو سوال آتا ہے وہ یہ کہ انسان نے دور وحشت و بربریت سے اس مہذب زمانہ تک یہ ترقی کیوں کی؟ انسانی ڈرامہ جو اس اسٹیج پر کھیلا جارہا ہے اس کا پلاٹ کیا ہے؟ انسان جس مقصد کے لیے جدوجہد کرہا ہے وہ کیا ہے اوراس میں اسے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

ہیگل انسانی جدوجہد کوشش' ترقی اور انسانی عروج بلندی کے پس منظر میں عمل پذیر جذبہ کو "آزادی" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی تایخ اور انسانی ڈرامہ کا پلاٹ "آزادی کی ترقی ہے۔" آزادی سے مراد وہ حقوق اور قانون لیتا ہے جس کے نتیجہ میں ریاست وجود میں آتی ہے۔ آزادی روح کا جوہر ہے۔ اور تاریخ فلسفہ روح فلسفہ کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے تاریخ کا موضوع سائنس سے جدا ہے۔ کیونکہ فلسفہ تاریخ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ ریاست کس طرح وجود میں آئی؟ چونکہ انسانی آزادی اور احساس آزادی ایک چیز ہے لہٰذا آزادی کا ارتقاء شعور و ذہن کا ارتقاء ہے۔ اس عمل میں ہر قسم کے افکار تشکیل پاتے ہیں۔ اس لیے فلسفہ تاریخ صرف انسانی عمل ہی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ وہ کائناتی عمل سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔

ہیگل روح (SPIRIT) اور مادہ (MATTER) کی خصوصیات بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ مادہ کا جوہر کشش ثقل ہے اور روح کا جوہر آزادی ہے اور یہ آزادی روح کی مکمل حقیقت ہے یہ آزادی کن ذرائع سے ترقی کرتی ہے؟ دراصل یہی تاریخ کا موضوع ہے۔ تاریخ کا مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی عمل کی بنیاد اس کی ضرورتوں اور خواہشات پر ہے۔ انسانی جذبات' کردار اور صلاحیتیں معاشرے میں حرکت پیدا کئے رکھتی ہیں۔ ان خواہشات و ضروریات میں چند اعلیٰ و ارفع جذبات بھی شامل ہیں۔ مثلاً" سخاوت یا حب الوطنی' لیکن ان کی اہمیت دوسروں کے مقابلہ میں کم ہے۔ ذاتی مقاصد اور خود غرضی سب سے زیادہ انسان میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ ان کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ قانون اور اخلاق کو جو ان پر پابندی عائد کرتے ہیں انہیں توڑ کر اور نظرانداز کرکے اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کراتے ہیں۔

ہیگل کے نزدیک ریاست وہ شے ہے جس میں فرد پوری طرح آزادی سے فیض یاب ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ چند افراد تمام آزادی پر

قابض نہ ہوجائیں۔ اس لیے اس اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہر فرد کو اپنا حصہ مل سکے۔ معاشرے میں پابندیاں ضروری ہیں تاکہ تمام افراد باہم میں میل جول سے آزادانہ زندگی گزار سکیں۔

تاریخ میں ریاست کا وجود انسانی مقصد کی انتہائی تکمیل ہے۔ انسان جن خصوصیات کا مالک ہے وہ سب اسے ریاست کی بدولت ملتی ہیں۔ ریاست ایک الہیاتی دستور ہے جو اس سرزمین میں عملی شکل میں موجود ہے اس لیے ریاست میں تاریخ کے مقصد کو پایا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں آزادی اپنا مقصد پورا کرتی ہے اور قانون روح کی مقصدیت بنتا ہے۔ اس لیے وہ خواہش جو قانون کے تابع ہو وہ آزاد ہے کیونکہ اس طرح وہ خود کی فرماں بردار ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردیتا ہے تو آزادی اور ضرورت دونوں ختم ہوجاتی ہیں۔ ریاست کا وجود افراد کو سرگرم عمل رکھتا ہے اور معاشرے کا نظام اخلاق بناتا ہے۔ قوانین' انتظام اور ریاست کے ارکان کے حقوق مل کر ریاست کا دستور پیدا کرتے ہیں جب کہ فطری پہلو مثلاً" پہاڑ' آب و ہوا اور پانی ایک ملک کا تصور بناتے ہیں' جائداد' آباؤ اجداد کی تاریخ اور ان کے کارنامے' ماضی کا ورثہ اور اس ورثہ میں ان کا وجود' یہ سب وطن کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے جو قوم ان حالات میں ارتقاء کرتی ہے اس کی ذہانت کو انہیں حالات میں سمجھنا اور دیکھنا چاہیے۔

ہیگل اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ تاریخ ایک سلسلہ ہے اور تاریخ کا ہر دور ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ ماضی حال سے پیوست ہے ہر قوم اپنی ترقی و عروج کے بعد اپنا ورثہ چھوڑی دیتی ہے جو تاریخ ترقی کے عمل میں کام آتا ہے۔ اسی لیے قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مرجاتی ہیں۔ لیکن مرتے وقت وہ اپنے افکار و خیالات چھوڑ جاتی ہیں۔ جو آنے والی نسل کے تازہ اور نوخیز ذہن و شعور میں جذب ہوجاتے ہیں۔ اس جدلیاتی عمل میں انسانی ذہن زندگی کی نت نئی تبدیلیوں اور تجربات میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔

ہیگل جب تبدیلی و ترقی' عروج و زوال' تراش و خراش' تعمیر و تخریب اور شکست و ریخت کے موضوع پر بحث کرتا ہے تو وہ اس تبدیلی و ترقی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک فطری' جس میں تبدیلی و ترقی اندھی اور غیر شعوری احساس کے ساتھ ہوتی ہے۔ دوسری تاریخی' جس میں یہ ترقی اور تبدیلی عقل و ذہن کے ساتھ شعوری اور قطعیت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس طرح فطرت اور تاریخ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ فطرت کوئی تاریخ نہیں

رکھتی بلکہ وہ ایک چکر میں گردش کرتی رہتی ہے اور اس بار بار کی گردش سے جو کچھ سامنے آتا ہے۔ اس سے نہ تو کچھ تعمیر ہوتا ہے اور نہ کچھ بنتا ہے۔ ہر روز سورج کا طلوع ہونا' بہادر کا آنا اور ہر اونچی لہر کا روپوش ہوجانا فطرت میں یہ سب اپنا آخری اور قطعی کردار ادا کرتے ہیں اور پھر ان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ فطرت کی گردش کے قانون اٹل ہیں یہ کبھی نہیں بدلتے چاہے وہ اپنے آپ کو کتنی ہی بار کیوں نہ دہرائیں۔

اس کے برعکس مورخ صرف واقعات کو ہی جمع نہیں کرتا بلکہ ان کی وجوہات و اثرات کو بھی بیان کرتا ہے ان مقاصد اور نصب العین کو بھی دیکھتا ہے۔ اس لیے اس کا طریقہ کار فطرت سے جدا ہوتا ہے۔ تاریخ اس وقت تک تاریخ نہیں ہوتی جب تک اس میں عمل نہ ہو۔ اس لیے سوائے انسانی تاریخ کے اور کوئی تاریخ نہیں اور یہ انسانی تاریخ کبھی اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔ کیونکہ تاریخ کی حرکت چکر (CIRCLE) میں نہیں بلکہ مخروطی (SPIRAL) شکل میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ضرور ہوتا ہے کہ واقعات اپنے آپ کو دہرارہے ہیں لیکن ان کے اثرات اور نتائج مختلف ہوتے ہیں مثلاً" جنگ ہوتی رہتی ہے۔ مگر ہر جنگ دوسری جنگ سے بدلی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اس کے نتائج اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

ہیگل کے نزدیک تمام تاریخ انسانی فکر کی تاریخ ہے کوئی مورخ فکر کے بغیر تاریخ میں ہونے والے واقعات کی روح تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً" اگر پہلی صدی میں رومی شہنشاہوں اور سینٹ کے جھگڑوں کی تاریخ کو بیان کیا جائے تو مورخ سب سے پہلے یہ دیکھے گا کہ ان دو مخالف جماعتوں نے کیا سیاسی صورت حال پیدا کی اور پھر ان کے جھگڑوں نے معاملات کو کس طرح آگے بڑھایا وہ اسی سیاسی پس منظر کو دیکھے گا جو ان دو جماعتوں سے متعلق ہوگا اس لیے ایک مورخ کا کام "لوگوں نے کیا کیا سے زیادہ جاننا ہے کہ انہوں نے کیا سوچا؟"

تاریخ کے عمل کی اصل حقیقت فہم و ادراک ہے کیونکہ تاریخ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان کی مرضی سے ہوتا ہے اسی لیئے تاریخی عمل انسان کی حرکت پر مبنی ہے اور انسان کی مرضی اس کے سوا اور کچھ نہیں جو حرکت و عمل سے ہوتی ہے۔ انسان میں عقل اور جذبات دونوں موجود رہتے ہیں اور کوئی بھی شخص صرف جذبات یا عقل سے کام نہیں کرسکتا اس کے جذبات عقل سے اور عقل جذبات سے ملی ہوتی ہے۔ اس لیے بغیر جذبہ کے کوئی

عمل نہیں ہو سکتا۔ ایک منصف مجرم کو فیصلہ دیتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جذبات سے مبرا ہے لیکن انصاف اور دانش مندی کے جذبات اس میں موجود ہوتے ہیں۔ تاریخ میں ہمیشہ عقل جذبات پر حکومت کرتی ہے۔ وہ انہیں جس طرف چاہتی ہے موڑ دیتی ہے۔ اور اپنی کامیابی کے لیے استعمال کرتی ہے۔

ہیگل تاریخ میں شخصیتوں کے عمل کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ افراد یا شخصیتیں اگرچہ اپنی ذاتی خواہشات کے تحت عمل کرتی ہیں لیکن ماحول اور حالات انہیں غیر شعوری طور پر وہ کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں جو تہذیب وہ تمدن اور تاریخ انسانی میں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ سیزر نے دستور' قانون اور اپنے مخالفوں کو ختم کر کے آمریت و شہنشاہیت کو فتوحات کے ذریعے وسعت دی' یہ اس کی ذاتی خواہش تھی لیکن ایک غیر شعوری عمل جو سازگار ماحول میں پیدا ہوا وہ رومی شہنشاہیت کا استحکام اور عظمت تھی یہی صورت حال تمام شخصیتوں کے ساتھ ہوئی۔ ان کی ذاتی خواہش ان عظیم مقاصد سے مل گئی جو آفاقی روح (WORLD SPIRIT) کی مرضی تھی' ان شخصیتوں نے غیر شعوری طور پر اس کے مقاصد کی تکمیل کی جبکہ درحقیقت ان کے سامنے اپنے مقاصد تھے۔

اگر تاریخ میں ان شخصیتوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ خوشی و مسرت سے دور' آرام و پرسکون زندگی سے محروم' محنت و مشقت سے تندہی و سرگرم عمل زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔ انہوں نے سختی سے اپنے مقصد کی تکمیل کی جب انہوں نے یہ مقصد حاصل کرلیا تو وہ ایک خالی اور سوکھے چھلکے کی طرح جس کا گودہ ختم ہوگیا ہو گر کر ختم ہوگئے۔ جیسے سکندر جو عین جوانی میں مرگیا' یا سیزر جو قتل کردیا گیا یا نپولین جسے جلا وطن کردیا گیا۔ ان شخصیتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عظیم تاریخی شخصیتں تھیں کیونکہ انہوں نے کچھ حاصل کرنے اور پانے کی خواہش کی اور پھر اسے تکمیل تک پہنچایا۔

انسان کن مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے انسان خدا کے منصوبوں کو پورا کرتا ہے۔ کانٹ کے نظریہ کے تحت انسان فطرت کے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچا رہا ہے اور غیر شعوری طور پر اس کا آلہ کار ہے ہیگل ان دونوں نظریوں سے اختلاف کرتے ہوئے انسان کے مقاصد کو فہم و ادراک کی تکمیل قرار دیتا ہے۔ فہم و ادراک انسان کی منزل متعین کرتے ہیں جسے انسان عقل اور جذبات کی مدد سے پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے عقل اور جذبات جو دو متضاد عناصر ہیں آپس میں مل جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں

منطق و غیر منطقی عناصر کا ملنا تحریک کا باعث ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان خاموش اور جامد نہیں رہتا۔ بلکہ برابر عمل اور حرکت کی حالت میں رہتا ہے اسی لیے انسانی ذہن ان تبدیلیوں سے تجربات حاصل کرتا رہتا ہے۔

ہیگل تمام تاریخ کو فکری تاریخ کہتا ہے' جو عقل کے ارتقاء کو ظاہر کرتی ہے لٰہذا تاریخ عمل دراصل منطقی عمل ہے۔ تاریخ میں جو تبدیلی اور ترقی ہوتی ہے وہ اچانک نہیں ہوتی بلکہ حالات کے تحت اسے ہونا پڑتا ہے اس لیے ہماری معلومات تاریخی عمل کے بارے میں صرف تجرباتی نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ ہیں جس کی وجہ سے ہم تاریخی تبدیلی کی ضرورت کو سمجھ سکتے ہیں۔

تاریخ انسان کے عمل' طریق اور افعال کا نام ہے' یہ داخلی اور خارجی پہلو رکھتی ہے۔ خارجی پہلو وہ واقعات ہیں جن زمان و مکاں میں ہوتے ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ داخلی پہلو وہ افکار ہیں جو ایک دوسرے سے منطقی طور پر ملے ہوتے ہیں۔

ہیگل نے اپنے نظریہ جدلیاتی عمل کو تاریخی عمل پر منطق کیا ہے جس میں ایک نظام اپنا مخالف نظام پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کے ملاپ سے تیسرا نظام پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً" یونان نے اپنا مخالف روم پیدا کیا اور اس دعویٰ کے خلاف دعویٰ نے امتزاج کے بعد عیسائیت کے غلبہ کو پیدا کیا لٰہذا یہ جدلیاتی عمل' دعویٰ' ضد دعویٰ اور امتزاج تاریخ میں ملتا ہے اور تاریخی تبدیلی و تغیر اسی جذبہ کے تحت ہوتی ہے۔

ہیگل کے نزدیک تاریخ زمانہ حال پر ختم ہوتی ہے کیونکہ مورخ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ واقعات کا تعین شہادتوں کی بنیاد پر کرتا ہے اس لیے مستقبل کا تعین کرتے وقت کسی کتاب یا شہادت کا حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے مورخ کے لیے مستقبل ایک بند کتاب اور روپوش افق ہے جس کے واقعات کا تعین اس کی طاقت سے باہر ہے۔ اس لیے تاریخ زمانہ حال پر ختم ہوجاتی ہے کیونکہ اس وقت تاریخی عمل اس کی نگاہوں میں مکمل ہوتا ہے جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوچکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حال میں ساری ترقی آکر ٹھنک جاتی ہے اور مستقبل اندھیرے میں چلا جاتا ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ حال ایک قطعی چیز ہے اور مستقبل ایک غیر مرئی شے جس میں معلومات اور واقعات نہیں ہوتے بلکہ امید' خوف اور ڈر کے جذبات ہوتے ہیں اور امید و بیم کے جذبات کبھی تاریخ نہیں ہوتے۔

مارکس

کارل مارکس 1818ء میں ترائر کے مقام پر پیدا ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے قانون کے طالب علم کی حیثیت سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہ ہیگل کے نظریات سے متاثر ہوا۔ اور قانون چھوڑ کر فلسفہ پڑھنا شروع کردیا۔ تعلیم کے بعد اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اپنے نظریات کی وجہ سے اس نے تمام عمر جلاوطنی میں گزاری۔ 1883ء میں بمقام لندن اس کا انتقال ہوا۔ مارکس کا نظریہ تاریخ اس کی مختلف تصانیف میں ملتا ہے۔ جن میں خصوصیت سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

THE GERMAN IDEOLOGY

POVERTY OF PHILOSOPHY

THE COMMUNIST MANIFES TO

انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کس جذبہ کے تحت ہو رہی ہے؟ تاریخ عمل میں کون سے عوامل ہیں جو ہر انسان کو آگے کی جانب لے جا رہے ہیں؟ وہ کن مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے؟ اور کیا ان مقاصد کی تکمیل شعوری ہے یا غیر شعوری۔

ان سوالات کا جواب فلسفہ تاریخ میں مختلف نظریات کے تحت دیا گیا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے انسان خدا کے مقاصد پورے کر رہا ہے۔ کانٹ ان مقاصد کو فطرت سے منسوب کرتا ہے۔ ان دونوں نظریات میں انسان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ خدا اور فطرت کا آلہ کار ہے اور غیر شعوری طور پر ان قوتوں کے لیے کام کر رہا ہے ان دونوں نظریوں سے ہٹ کر تیسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان عقل و شعور، غور و فکر اور علم و دانش کا پیکر ہے، اس میں سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی صلاحیت ہے اس لیے وہ کسی قوت کا آلہ کار نہیں بلکہ ایک خود مختار ہستی ہے جو اپنی مرضی اور خواہش کی مالک ہے۔ اس نے جذبہ جستجو کے تحت باعمل ہو کر آسمانوں، زمینوں، سمندروں، پہاڑوں اور دریاؤں کے سربستہ راز معلوم کئے اور اسی جذبہ کے تحت اس نے فطرت کی بند کتاب کو کھولا اور فطرت پر قابو پایا۔

مارکس ان تمام نظریوں سے اختلاف کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخی عمل انسان کی سرگرمیوں اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں انسان کی معاشی ضروریات اور اقتصادی احتیاجات بنیادی طور پر سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تاریخ ارتقاء کا راز اسی میں ہے کہ آدمی اپنی بنیادی معاشی ضرورت کس طرح بہم پہنچاتا ہے۔ ایک وقت میں وہ ہتھیار بنا کر اور شکار کرکے اپنے ضروریات پوری کرتا تھا تو دوسرے وقت میں کھیتی باڑی کرکے اور غلہ اگا کر لہٰذا ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک ترقی میں اسکی معاشی ضروریات رہیں۔ پیداوار کا عمل اس کی سرگرمیوں میں اور ایجادات کا باعث رہا اور یہی عمل معاشرے کے قیام اور پھر قانون و سیاست' اخلاق و مذہب' فلسفہ و فکر کے تخلیق ہونے کا باعث ہوا۔ مارکس ایک جگہ کہتا ہے کہ

"صنعت و حرفت کی تبدیلی کے ساتھ انسان اپنے سماجی تعلقاب بھی بدلتا رہتا ہے۔ ہینڈمل (HANDMIL) جاگیرداری کا معاشرہ پیدا کرتی ہے تو بھاپ کا انجن صنعتی سرمایہ داری کو جنم دیتا ہے انہیں مادی ذرائع کے ساتھ ساتھ انسان اپنے سماجی تعلقات بدلتا اور قائم کرتا رہتا ہے۔ اور انہیں تعلقات کی بنا پر وہ افکار و نظریات تخلیق کرتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔

"کیا وہ لوگ تاریخ کا ایک لفظ بھی سمجھ سکتے ہیں جو صنعت و حرفت کو یکسر خارج کردیتے ہیں؟ کیا کسی دور کو اس صنعت و حرفت کے بغیر سمجھا جاسکتا ہے؟ پیداوار کے ذرائع جو حقیقت میں حقیقی زندگی ہیں ان کو خارج کرنے کا مطلب ہے کہ روح کو جسم سے نکال دیا جائے اس لیے جو لوگ فطری سائنس اور صنعت و حرفت کو علیحدہ سمجھتے ہیں اور تاریخ کو مادی پیداوار میں نہیں پاتے' ایسے لوگ تاریخ کو آسمان کے دھندلے بادلوں میں تلاش کرتے ہیں۔"

مارکس ہیگل کے نظریہ تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ مجرد اور روح مطلق کے مفہوم کو پیدا کرتی ہے۔ ہیگل تجرباتی اور عام فہم ڈھانچہ میں تخیلاتی اور خفیہ تاریخ پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے انسانیت کی تاریخ' انسانیت کی مجرد روح کی تاریخ ہو جاتی ہے وہ روح جو انسانی پہنچ اور دسترس سے بہت آگے ہے۔

مارکس اس کے برعکس تاریخی عمل میں انسان اس کی حقیقی زندگی' اس کی سرگرمیوں اور اس کی مادی ضروریات کو دیکھتا ہے۔ تاریخ میں انسان کی تمام زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ اس لیے تاریخ میں انسان کی قطعی ضروریات کو دیکھا جاتا ہے تاریخ کی ابتداء ان فطری بنیادوں پر ہونا چاہئے جنہیں انسان عملی طورپر تشکیل دیتا ہے۔ انسان خود کو حیوانات سے اسی وقت ممتاز سمجھتا ہے جب وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ پیدا کرتا ہے۔ اس عمل کو وہ جسمانی طاقت کے ذریعہ کرتا ہے اس لیے پیداوار کا مطلب ہے کہ انسان اپنی مادی زندگی کا سامان فراہم کررہا ہے۔ تاریخ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ پیداوار کے طریق عمل کو دیکھا جائے کیونکہ اسی بنیاد پر انسانی زندگی میں تغیر و تبدل ہوتا ہے اور اسی کی روشنی میں معاشرہ کا ارتقاء سمجھ میں آتا ہے۔ ابتدا میں جب پیداوار کے ذرائع سادہ اور سہل تھے تو معاشرہ بھی اسی طرح سادہ اور غیر پیچیدہ تھا۔ اس میں سادگی اور صفائی تھی۔ لیکن پیداوار کے طریقوں اور ذریعوں کے ساتھ ساتھ معاشرہ مختلف مراحل سے گزرا اور اسی ارتقائی دور میں مذہب فلسفہ' اخلاق اور نظریات تشکیل پائے۔

تاریخ عمل میں سیاست' ریاست' مذہب حکمرانوں کی سرگرمیوں' فتوحات' شان و شوکت و عظمت' ریاست کی بڑائی اور اخلاق کی بلندی اس قدر اہم کردار ادا نہیں کرتیں جس قدر کہ معاشی ضروریات اس لیے ان کو کسی بھی دور کی محرک قوت سمجھنا غلطی ہے کیونکہ یہ محرک قوت نہیں بلکہ محض اس کی پرچھائیاں ہیں۔

مارکس اس بات سے کسی چیز کا تعین نہیں کرتا کہ انسان کیا کہتا ہے' سوچتا ہے یا تصور کرتا ہے؟ یا اس نے کیا کہا' سوچا اور تصور کیا؟ اس کے بجائے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ انسان نے کیا مادی ترقی کی اور اس مادی ترقی کے نتیجہ میں اخلاق' مذہب' سیاست اور دوسرے نظریات پیدا کیے۔ افکار و نظریات مادی ترقی کی پیداوار ہوتے ہیں اس لیے یہ خودمختار نہیں ان کی ہیئت اور ساخت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے زندگی شعور و ادراک سے متعین نہیں ہوتی بلکہ شعور زندگی کے عمل سے بنتا ہے اس لیے انسان محرک اور باعمل ہے اس لیے انسانی تاریخ مبالغہ آمیزی کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ انسان کی حقیقی زندگی کا عکس اور تصویر ہے۔

تاریخ کے مطالعہ کے بعد مارکس اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جو جماعت ذرائع پیداوار پر قابض ہوگی' حکومت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس جماعت کے خیالات

معاشرے پر حاوی ہوں گے اور ذہنی طور پر معاشرہ ان کی بنائی ہوئی روایات اور اقدار کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا۔ جو طبقہ اقتصادی طور پر بدحال اور مادی ذرائع سے محروم ہوتا ہے وہ کبھی بھی ذہنی یا جسمانی طور پر معاشرہ پر تسلط حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کے خیالات و افکار ہمیشہ حکمران طبقہ کے ماتحت ہوں گے اقتدار پر قابض طبقہ اسے ہمیشہ ذہنی طور پر غلام بنائے رکھے گا۔ حکمران طبقہ کا فرد جب فلسفی بن کر افکار تخلیق کرتا ہے تو حکومت ان کی تشہیر میں حصہ لیتی ہے۔ اور یہی خیالات معاشرہ کے اعلیٰ خیالات بن جاتے ہیں۔ جب مطلق العنانیت' امراء اور زمینداروں میں اقتدار حاصل کرنے کی کش مکش شروع ہوئی تو اس وقت طاقت کی علیحدگی کا نظریہ پیدا ہوا تاکہ ہر جماعت کو کچھ حقوق مل جائیں اور طاقت تقسیم ہوجائے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد اسے آفاقی قانون کہا گیا۔

اسی طرح جب امراء کا اقتدار ہوا تو امراء نے اپنی طاقت کے استحکام کی خاطر عزت و وفاداری کے جذبات کو فروغ دیا۔ جب بورژوا طبقہ اقتدار پر قابض ہوا تو اس نے مساوات اور آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ اس عمل میں ہر طبقہ نے اپنے اقتدار کی بنیاد جن اقدار پر رکھی اسے آفاقیت کا درجہ دیا اور لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ یہی افکار اور اقدار حقیقی ہیں اور ان ہی سے ہمارے معاشرے کی فلاح و بہبود ہوسکتی ہے۔

جب معاشرہ اس طبقاتی اقتدار کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو ان کی یہ آواز اور صدائے احتجاج کسی ایک گروہ یا جماعت کی نہیں ہوتی بلکہ پورے معاشرے کی ہوتی ہے جو بااقتدار طبقہ سے لڑتا ہے اور ان تمام افراد' گروہوں اور جماعتوں کو شامل کرلیتا ہے۔ جو اقتدار سے محروم ہوتے ہیں جنگ کی کامیابی کے بعد محروم طبقہ بھی فیض یاب ہوتا ہے مثلاً" انقلاب فرانس میں بورژوا طبقہ کی کامیابی سے بہت سے پرولتاری بھی بہرہ مند ہوئے اور انہوں نے اپنا رتبہ بڑھا کر بورژوا طبقہ کے برابر کرلیا۔ ہر نیا فاتح طبقہ جب اقتدار قائم کرتا ہے تو اس کا اقتدار پہلے والے طبقے سے زیادہ وسیع بنیادوں پر ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بااقتدار اور اقتدار سے محروم طبقوں میں مخالفت باقی رہتی ہے۔ اس لیے ایک جماعت کا بااقتدار ہونا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک کرنا پھر اس کی مخالفت اور خاتمہ اس عمل سے معاشرہ میں اقتدار زیادہ سے زیادہ وسیع بنیادوں پر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

مارکس تاریخ کو طبقاتی کش مکش کہتا ہے ہر دور میں دو طبقہ کش مکش اور تصادم میں مصروف رہتے ہیں۔ مثلاً" قدیم روم میں امراء اور غریب عوام قرون وسطیٰ میں جاگیر دار

کسان یا سرف، موجودہ صنعتی دور میں سرمایہ دار اور مزدور یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ مظلوم و ظالم حکمران و رعیت، بااقتدار اور اقتدار سے محروم طبقوں میں تصادم رہا ہے۔

اس طبقاتی جنگ میں ہر مرحلہ پر بااقتدار طبقہ کو شکست دیکھنا پڑی اور محروم طبقہ برابر اپنا اثر و رسوخ اور طاقت کو بڑھاتا رہا۔ مثلاً" قرون وسطیٰ میں برگر (BURGHER) پیدا ہوئے اور پھر ان سے موجودہ بورژوا طبقہ ابھرا، امریکہ کی دریافت، راس امید کا راستہ، نو آبادیاتی نظام کی ابتدا نے بورژوا طبقہ کو نئے میدان اور منڈیاں فراہم کیں۔ جس نے اس کی دولت اور طاقت میں بے انتہا اضافہ کردیا۔ دور جاگیرداری میں صنعت و پیداوار پر گلڈ کا قبضہ تھا۔ لیکن محدود پیداوار بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے ناکافی تھی۔ اس لیے جب پیداوار کے ذرائع میں اضافہ ہوا تو گلڈ ماسٹر کا زمانہ ختم ہوا اور اس نے اس کی جگہ درمیانہ درجہ نے لے لی۔ لیکن جب منڈیاں زیادہ ہوئیں اشیا کی مانگ بڑھی اور فنی ماہرین ان بڑھتی ہوئی ضرویات کو پورا نہ کرسکے تو ان کی جگہ بھاپ اور مشین نے لے لی اور فنی ماہرین کی جگہ صنعتی سرمایہ دار قابض ہوگئے۔ درمیانی درجہ کا تسلط ختم ہوا اور کروڑ پتی تمام صنعت و حرفت پر قابض ہوگئے۔ بورژوا طبقہ نے تاریخ میں ترقی کے ہر مرحلہ پر سیاسی حقوق حاصل کیے۔ زمانہ جاگیرداری میں یہ طبقہ مظلوم تھا۔ قرون وسطیٰ کے فرانس میں اس نے کمیون قائم کیے۔ اٹلی اور جرمنی میں اس نے جمہوری حکومتوں کی داغ بیل ڈالی۔ پھر فرانس میں تھرڈ اسٹیٹ بن کر ابھرا جدید صنعتی دور میں بورژوا طبقہ فتح یاب ہوا اور اس نے سیاسی معاشی طاقت حاصل کی۔

بورژوا طبقہ جب بھی طاقت و استحکام حاصل کرتا ہے تو یہ زمانہ جاگیرداری کی تمام روایات توڑ دیتا ہے۔ یہ انسان اور انسان میں کسی اعلیٰ مقصد کو نہیں بلکہ ذاتی غرض اور نقد ادائیگی کی روایت کو قائم کرتا ہے۔ یہ مذہب کی تمام اعلیٰ اقدار، مثلاً" شجاعت بہادری کے جذبات کو ذاتی غرض کے ٹھنڈے پانی میں ڈبو کر سرد کردیتا ہے۔

بورژوا طبقہ اقتدار میں آنے کے بعد تمام ذرائع پیداوار پر تسلط جما لیتا ہے اور اس طرح دولت سمٹ کر ایک ہی طبقہ میں آجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرہ کے دوسرے طبقہ تمام حقوق اور بنیادی ضروریات سے محروم ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک پرولتاری طبقہ دولت و طاقت اور مراعات سے محروم ہوجاتے ہیں۔ بورژوا طبقہ سے نبرد آزما ہوجاتا ہے۔

اس طبقاتی کشمکش میں پرولتاری طبقہ مسلسل اپنی طاقت بڑھاتا رہتا ہے کیونکہ درمیانی درجہ اور چھوٹے دکاندار و تاجر جو نہ تو سرمایہ کے مالک ہوتے ہیں اور نہ فنی صلاحیتوں میں سرمایہ دار سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ دولت و سرمایہ سے محروم پرولتاری طبقہ میں شامل ہوجاتے ہیں۔ دولت سمٹ کر محدود سے محدود طبقہ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ معاشرہ میں سرمایہ داروں کی اقلیت ہوجاتی ہے۔ جو دولت' طاقت اور اقتدار پر قابض ہوتے ہیں۔ دوسری طرف محروم پرولتاری طبقہ ہوتا ہے جو اپنی بقاء اور زندگی کے لیے اجتماعی طور پر متحد ہو کر بورژوا طبقہ کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔

تاریخ کی طبقاتی کش مکش میں یہ آخری کش مکش ہوگی جس میں پرولتاری فتح یاب ہوں گے اور ایک معاشرہ وجود میں آئے گا جو طبقاتی تفریق سے آزاد ہوگا۔

بورک ہارڈٹ

جیکب کرسٹوف بورک ہارڈٹ 1818ء میں باسل میں پیدا ہوا۔ جرمنی اٹلی' ہالینڈ اور بلجیم میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں باسل یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوا۔ فلسفہ تاریخ پر اس کی مندرجہ ذیل کتابیں ہیں۔

REFLECTION OF HISTROY

THE GREAT MEN OF HISTORY

ON FOTUNE AND MISFORTUNE OF HISTORY

1897ء میں اس کا انتقال ہوا۔

واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی رہتی ہیں۔ تاریخ کی زنجیر طویل تر ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ ان واقعات کے دباؤ سے آگے بڑھتا رہتا ہے یہ ایک عظیم پرشکوہ اور محیر العقول سلسلہ ہے جس میں انسانی زندگی و موت کے محدود دائرے ہیں جدوجہد کرتا ہے نظر آتا ہے۔ اس کی جدوجہد کے اس وسیع و عریض سلسلہ کے تین پہلو ہیں' جن کے دائرے میں انسانی تاریخ برابر گھومتی اور چکر کھاتی ہے۔ یعنی ریاست' مذہب اور کلچر' بورک ہارڈٹ کے نزدیک تاریخ کا سلسلہ ان تین دائروں میں مقید اور گرفتار رہتا ہے ان تین عناصر میں کوئی شے مشترک نہیں اور نہ ہی ان میں یک جہتی ممکن ہے۔ ان میں سے ہر ایک علیحدہ خصوصیت اور اقدار کا مالک ہے۔ اگر ریاست اور مذہب کو جبریہ ملا بھی دیا جائے تو پھر بھی کلچر ان سے علیحدہ رہے گا کیونکہ ریاست اور مذہب سیاسی و الہیاتی ضروریات کو پورا کرتا ہے جب کہ کلچر مادی اور روحانی ضروریات کے دائرے میں رہتے ہوئے افراد کو تسکین و فرحت بخشتا ہے۔ یہ معاشرے اور انسانی زندگی کے تمام مادی وسائل د ان کی ترقی' روحانی اقدار' سماجی اثرات' ٹیکنالوجی' ادبیات اور سائنس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں زندگی اپنی

تمام رعنائیوں کے ساتھ سمٹ آتی ہے۔ یہ ایک متنوع' آزاد لیکن محدود دائرہ اور شعبہ ہے۔ جو کبھی آفاقی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی طاقت و قوت سے اپنا اقتدار قائم کرسکتا ہے۔

بورک ہارڈٹ کے نزدیک کوئی ریاست ایسے حقیقی معاہدے کے تحت وجود میں نہیں آسکتی جس میں تمام جماعتیں خوشی سے داخل ہوں۔ تاریخ میں ایسے معاہدے ضرور ملتے ہیں کہ جب کوئی جماعت مجبوری سے اس پر تیار ہوئی ہو جیسے رومی شہنشاہیت کے آخری دور میں کمزور اور کانپتے ہوئے رومیوں نے فاتح ٹیوٹونوں سے کیا تھا۔ لیکن یہ حقیقی معاہدہ نہیں ہوسکتا اس لیے اگر اس قسم کے معاہدے سے کوئی ریاست وجود میں آتی ہے تو وہ انتہائی کمزور اور نحیف ہوتی ہے۔

بورک ہارڈٹ دو قسم کی ریاستوں کا نظریہ پیش کرتا ہے ایک عظیم یا بڑی ریاست جو خارجی لحاظ سے اعلیٰ مقاصد کو پورا کرتی ہے اور کچھ ثقافتوں کی حفاظت و نگہداشت کرتی ہے یہ ریاست معاشرے کے غیر متحرک طبقہ کو آگے بڑھاتی ہے اور مجموعی طور پر معاشرے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر اسے فعال معاشرہ بناتی ہے۔

اس کے مقابلے میں چھوٹی ریاستیں صرف اس جگہ اور ماحول میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہیں جہاں آبادی کے بڑے حصے کو شہری حقوق ملے ہیں۔ یہ درجہ یونانیوں کی ریاستوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں تقریباً" حاصل کرلیا تھا اور غلامی کے نظام کے باوجود آج کل کی جمہوری حکومتوں سے بہتر تھیں۔ چھوٹی بادشاہتیں بھی ان شرائط کو پورا کرلیتی ہیں۔ لیکن چھوٹی آمرانہ حکومتیں جو اٹلی میں تحریک نشاۃ ثانیہ کے وقت تھیں وہ ریاست کی سب سے غیر محفوظ طریق حکومت ہوتی ہیں۔

چھوٹی ریاستیں ہمیشہ بڑی ریاست میں ضم ہونے پر تیار رہتی ہیں' کیونکہ چھوٹی ریاستیں، جو حقیقی و صحیح آزادی حاصل کرلیتی ہیں اس لیے بڑی ریاست کی طاقت انہیں اپنے میں رکے آزادی و طاقت کا توازن پیدا کرتی ہے۔

ریاست کی ابتداء کیسے ہی ہوئی ہو لیکن وہ اپنی زندگی صرف اسی وقت برقرار رکھ سکتی ہے جب اس کی بنیاد اور قوت میں استحکام ہو۔ ہر قوت جب استحکام کی خاطر خارجی و داخلی طور سے تکمیل چاہتی ہے تو وہ کمزور کے حقوق کا کوئی پاس نہیں کرتی۔ اس عمل میں "عوام" اور "خاندان" ایک ہی طریقہ پر چلتے ہیں۔ عوام کی صورت میں ان کی خواہشات فیصلہ کن صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور خاندان کی صورت میں اس کی خواہشات ریاست

کی ضرورت ہوتی ہیں۔ اس لیے ریاست کی وسعت کو فتوحات کی لالچ نہیں بلکہ ضرورت کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال کارو لنجین شہنشاہیت کی ہے۔

داخلی امور میں "طاقت" حقوق کو ختم کر کے اپنا اثر رسوخ بڑھاتی ہے۔ اور اس کا جواز عوام کی بہبود بتایا جاتا ہے جیسے "ریاست میں خود ہوں" کا فقرہ اس ذہن کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے اور اسی قسم کا طرز عمل پرانے بادشاہوں میں مکمل طور پر جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جنہوں نے فتوحات کیں، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور تباہی کی ہولناک مثالیں قائم کیں اور جب یہ غلاموں کی طویل قطاریں اور مال غنیمت کے بوجھ سے لدی ہوئی گاڑیاں اور جانور لائے اور اس شان سے تھیبس یا نینوا میں داخل ہوئے تو لوگوں نے انہیں خدا کا پسندیدہ بندہ کہا۔

جب مورخ لوئی شاز وہم، نپولین اور مقبول انقلابی حکومتوں کا مطالعہ اور تجزیہ کرتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے "طاقت" برائی اور شر ہے کیونکہ یہ افراد کی خودداری اور انا کو چھین کر ریاست کو دے دیتی ہے اور حکومت ریاست کی انا کی تسکین کی خاطر کمزور ہمسایہ ریاستوں کو غلام بناتی ہے اور انہیں آزادی سے محروم کرتی ہے۔ اس کا جواز یہ دیا جاتا ہے کہ دوسری ریاستوں کو ابھرنے کا اور طاقتو بننے کا موقع نہیں دیا جائے، اگر دوسری ریاستوں کو یہ موقع مل گیا تو وہ اپنی سیاسی ضروریات کے تحت دوسروں کو غلام بنائیں گی۔ جب فتوحات کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور مستقل فتوحات کی بھوک ہر چیز کو ہڑپ کرلیتی ہے جو آسانی سے اس کے قبضہ میں آجائے۔ چھوٹی ریاستیں جو آزادی کے بغیر ہوتی ہیں وہ اتحاد کی خواہش میں فاتح ریاست میں مل جاتی ہیں کیونکہ اس طرح ان کی صنعتی و فنی و معاشرتی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ "برے عمل معصومیت سے کیے جاتے ہیں۔" اور آدمی اس طاقت سے شرمندہ ہوتا ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے تمام جرائم کیئے ہوں، اس لیے وہ قانون کی بالادستی قائم رکھنا چاہتا ہے۔ فریڈرک دوم نے پہلی سلیشین جنگ میں جو کچھ کیا اس عمل سے "غیر قانونی وجود" کی تھیوری پیدا ہوئی۔

بورک ہارڈٹ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ریاست کے داخلی نظام ریاست میں ضروری ہے کہ ہر فرد اپنی خواہش اور رائے کو اس میں ضم کردے۔ اس صورت میں شہریوں میں فرائض کا احساس ہوگا اور ان میں جذبہ حب الوطنی پیدا ہوگا۔

اس کے نزدیک جب کبھی ریاست اخلاقی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ اس کی کمزوری کی نشانی ہوتی ہے کیونکہ ریاست حق اور خیر کا معیار تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ اگر وہ اخلاقی قدروں کو عمل میں لانے کی کوشش کرے گا تو یقیناً" وہ صدمات سے دوچار ہوگی کیونکہ اخلاق کا شعبہ ریاست کی حدود سے باہر ہے۔ ریاست کا فرض یہ ہے کہ وہ قانون کی بالادستی قائم رکھے اور اس بات کو دیکھے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں۔

ریاست کو جماعتوں سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اس حقیقت کو باوجود کہ ہر جماعت ریاست کو اپنی طاقت میں لانا چاہتی ہے۔

تاریخ کے عمل کا دوسرا پہلو مذہب اس پر بحث کرتے ہوئے کہ مذہب کی ابتدا کس طرح سے ہوئی، بورک ہارڈٹ مختلف نظریات پیش کرتا ہے۔ مثلاً" ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ خوف نے دیوتاؤں کو جنم دیا۔ اس کے ثبوت میں وہ قدیم قبائل ان کی زندگی اور پوجا و پرستش کے طریقوں سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انسان نے فطرت کے مظاہر سے ڈر کر دیوتاؤں کو تخلیق کیا۔ اس لیے فطرت کے مظاہر، اجداد اور اشیاء کی پرستش، یہ سب اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ انسان اپنے جذبات کو اس شے سے ظاہر کرتا ہے جس سے اس کا ذاتی تعلق ہوتا ہے۔

یہ انسانی ذہن کی مجبوری ہے کہ وہ ایک عظیم قوت کے تابع ہونے کے جذبات رکھتا ہے اور ڈر اور خوف کی وجہ سے قربانی، نذر نیاز اور بھینٹ کا سہارا لیتا ہے تاکہ وہ اس عظیم قوت کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

مذہبوں کی پیدائش میں ایک چیز یقینی ہے کہ اس کی تخلیق کسی سازگار لمحہ میں کسی ایک فرد کی کوششوں کی وجہ سے ہوئی۔ دوسرے لوگوں نے مذہب کو اس لیے قبول کیا کہ اس کا بانی یا مذہب کی تعلیمات ان کی اس الہیاتی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ جو انسانی روح میں بے قرار رہتی ہے اور عوام اس شدید ضرورت کی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ یقینی چیز ایک غیر یقینی ہیجان پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لیے عوام مذہب کی ظاہری شکل و صورت کو برقرار رکھتے ہیں جب کہ اس کی روح ان کے لیے ایک بند کتاب کی سی ہوتی ہے یہ اس حالت میں اس وقت تک رہتے ہیں جب کہ کوئی دوسرا مذہب، جو پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو، ان کے لیے پناہ گاہ نہ بنے۔

بورک ہارڈٹ مذہب کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے قومی اور عالمی مذاہب' قومی مذہب کی ابتداء پہلے ہوتی ہے اور اس کی بنیادی ثقافت' تاریخ اور معاشرتی اقدار ہوتی ہیں۔ اس کے دیوتا اپنی قوم کو محفوظ رکھتے ہوئے دوسری قوموں کے لیے عذاب کا باعث ہوتے ہیں۔ جب تک قوم میں ترقی کے جذبات ہوتے ہیں' مذہب کا لب و لہجہ بلند ہوتا ہے اور یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ایک دن تمام قومیں اس سے دائرے اثر میں آجائیں گی۔ جیسے یہودی کہتے ہیں کہ

تمام قومیں موریا کے پہاڑ پر یہود کی عبادت کریں گی۔

لیکن یہ مذہب ایکً قوم میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی مقدس زبان اپنے دائرے کو گھٹا لیتی ہے۔ جس کی وجہ سے دوسری قوموں سے کوئی رشتہ قائم نہیں ہوتا۔

اس کے مقابلہ میں عالمی مذاہب جن میں بدھ مت' عیسائیت اور اسلام قابل ذکر ہیں قومی مذاہب کے مقابلہ میں ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں۔ ان کا دائرہ عمل بھی وسیع ہوتا ہے - یہ سماجی و طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور غریبوں و غلاموں کے حقوق کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ یہی خصوصیت انہیں بین الاقوامی بناتی ہے۔

بورک ہارڈٹ کے نزدیک مذہب کے زوال کی وجہ مقدس قانون ہوتا ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہو کر ریاست کے برابر اپنا اقتدار حاصل کرلیتا ہے۔ جب مذہبی اقدار' سیکولر اقدار سے ملتی ہیں تو مذہب کی ظاہری شکل باقی رہ جاتی ہے اور اس کی روح ختم ہوجاتی ہے ایک قدیم درخت جو پتیوں میں گھرا ہوا' گھنا اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن اندر سے یہ کھوکھلا ہوتا ہے۔

جس وقت مذہب یہ شکل اختیار کرتا ہے تو اس وقت ایک طبقہ الہیاتی ضروریات کے شدید اثرات کے تحت اصلاحی مذہبی تحریک شروع کرتا ہے روح کی یہ انفرادی اور تخلیقی جدوجہد تاریخ میں ناکام رہی ہے۔ جیسے ساسانی دور میں مزدک کی تحریک' جب کبھی معاشرے میں یہ اصلاحی تحریک ابھرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذہب میں وہ روح زندگی اور اقدار باقی نہیں رہیں جو معاشرے کی الہیاتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

مذہب کے دائرے عمل میں قتل و غارت گری بھی آتی ہے۔ ان میں سب پہلے منکر آتے ہیں کیونکہ مذہب کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا سے انکار کے معنی خدا کو قہر اور غضب کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ اس لیے منکر اور مرتد کا قتل

ضروری ہے تاکہ معاشرہ خدا کے عذاب سے بچ سکے۔ مذہب نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ ژند مذہب میں اگرچہ کسی کو داخل نہیں کیا جاتا' لیکن ہر اس شخص سے اور ہر اس اقدار سے نفرت کی جاتی تھی جو اس مذہب کے دائرے سے باہر تھی۔ یہ نفرت اس قدر بڑھتی ہے کہ مختلف مذاہب ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آراء ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنا باعث برکت اور دیوتاؤں کی خوشنودی گردانتے ہیں کم بے سس نے مصر کے مندروں کو تباہ و برباد کرڈالا ان سب کے پیچھے اپنے مذہب سے محبت اور دوسرے مذہبوں سے نفرت تھی۔

مذہب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں باغیوں' بدعتیوں' مشرکوں اور منکروں کو سخت سزا دی جاتی ہے۔ "لوگ دنیا میں انہیں زندہ جلا دیتے ہیں' جو دوسری دنیا میں بھی جلیں گے۔" مذہب کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انہیں سزا دینی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے اعمال سے اور ان کی باتوں سے معصوم ذہن متاثر نہ ہوں۔ اس لیے سینٹ آگٹس نے جب ڈوناٹس کے قتل کا فیصلہ کیا تو کہا "تمہیں ہم نہیں تمہارے اعمال قتل کررہے ہیں۔ جنھوں نے چرچ سے باغی کیا" اسی جذبہ کے تحت انوسینٹ دوم نے تمام عیسائی حکمرانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ کافروں کے خلاف جہاد کریں۔

لیکن اس مذہبی جنون اور نفرت نے اپنا انتقام لیا۔ چرچ کی حیثیت پولیس تھانہ کی ہوگئی اور اس کے عہدیدار پولیس افسر' اس کے ردعمل کے طور پر مذہبی اصلاح کی تحریکیں ابھریں اور اٹھارویں صدی کی مختلف ذہنی تحریکوں اور ریاست کے نئے نظروں نے اس کی جڑیں کھوکھلی کردیں۔

مذہب کے زوال میں جو دوسرے عناصر عمل پذیر ہوتے ہیں ان میں داخلی تفرقات اور تعلیم یافتہ طبقہ کی علیحدگی قابل ذکر ہیں۔ وہ مذہب جس نے ارتقائی منازل کو طے کیا ہو وہ دوسرے مذاہب کی نسبت ابدی ہوتا ہے۔ ابدی ان معنوں میں کہ جب تک لوگ اسے مانتے رہیں۔ جب مذہب کے مخالف ریاست کی طاقت کو اس کے خلاف صف آراء کردیتے ہیں تو مذہب اس طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ اگر یہ طاقت نہ ہو تو مذہب اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ اگر مذہب سیکولر طاقت کی مدد حاصل کرے تو اس کی مدد سے وہ دوبارہ اقتدار حاصل کرلیتا ہے۔ جیسے ہندوستان میں برہمن مت نے بدھ مت کو ختم کرکے اپنا اثر پھر سے قائم کرلیا۔

بورک ہارڈٹ مذہب کے استحکام اور قیام میں ریاست کی طاقت اور حکمرانوں کے شاہی قوانین کو انتہائی اہم سمجھتا ہے اگر کانسٹائن سے لے کر تھوڈوسس تک شاہی قانون نہیں ہوتے تو یونانی و رومی مذاہب زندہ رہتے۔ اسی طرح اگر تحریک اصلاح مذہب (Reformation) کے پیچھے حکمرانوں کی مدد نہیں ہوتی تو اس کا بھی وجود نہیں ہوتا۔

تاریخ کا تیسرا پہلو کلچر ہے بورک ہارڈٹ کلچر کی تخلیق کو انسانی ذہن کی "اچانک تخلیقات" کہتا ہے' کیونکہ اس کی ابتدا اچانک ہوتی ہے اس میں نظم و ضبط اور ترتیب جب آتی ہے جب سائنس اور فلسفہ میں ترقی ہوتی ہے ریاست اور مذہب کی طرح کلچر کا بھی ہر پہلو نشوونما اور شباب کے بعد زوال پذیر ہوجاتا ہے۔ اور آخر میں روایات کے ذخیرے میں اس کا نام باقی رہ جاتا ہے۔

کلچر کی ابتدا ذہن سے ہوتی ہے جو غور و فکر کرتا ہے اور اس فکر کو زبان میں ڈھالتا ہے۔ زبان کے وسیلہ سے فکر کا اظہار کیا جاتا ہے اس لیے زبان کسی قوم کی روح کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے کیونکہ زبان ہی میں قوم کی تاریخ' بزرگوں کے اقوال' شاعروں اور فلسفیوں کے افکار ہوتے ہیں۔ جو زبان سب سے پرانی ہوگی اسی قدر زرخیز ہوگی کیونکہ ہر زبان کے دور انحطاط میں بہترین ادب تخلیق ہوتا ہے لاسا کے نظریہ کے تحت کلچر کے ارتقا میں یہ درجات ہوتے ہیں' کان کنی' دھات سے ہتھیار بنانا' جانور پالنا' زراعت جہاز رانی' تجارت' صنعت' مادی ترقی اس کے بعد آرٹ دستکاری میں ظاہر ہوتا ہے۔ پھر آرٹ سے سائنس پیدا ہوتی ہے۔

آرٹ سائنس سے زیادہ پیچیدہ اور روح کی سب سے حیرت ناک تخلیق ہے۔ آرٹ' شاعری اور موسیقی یہ سب مذہبی رسومات کی شکل میں ظاہر ہوئے اور پھر ان میں ترقی ہوئی اس کے مقابلہ میں سائنس عملی ضروریات کا رومانی پہلو ہے۔ اور لامحدود اشیاء کی ترتیب و تدوین کا ذریعہ ہے۔ سائنس اشیاء کے راز سے پردہ اٹھاتی ہے اور ان کے عمل کو ظاہر کرتی ہے جب کہ فلسفہ تمام اشیاء کے قانون کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔

آرٹ نہ تو کسی شے کا کوئی قانون دریافت کرتا ہے اور نہ اشیاء کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیتا ہے بلکہ یہ ایک اعلیٰ زندگی کی تخلیق کرتا ہے جس کا وجود اس کے بغیر ممکن نہیں۔ آرٹ پر اسرار لہروں کے ذریعہ روح سے تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ اس دنیا' وقت اور فطرت سے خیالات و تصورات حاصل کرتا ہے اور انہیں آفاقی شکل میں ڈھال کر ابدی بنا

دیتا ہے۔ یہ خیالات جو اپنے زمانہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ہر آنے والے زمانہ کو متاثر کرتے ہیں۔ فن تعمیر میں صلاحیتیں اپنی تخلیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور اس کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح آرٹ کیا ہے؟ اگرچہ فن تعمیر میں مقصدیت کو پورا پورا دخل ہوتا ہے اور اس میں آرٹ کی ایک شکل بار بار روایتی انداز میں دھرائی بھی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں زمانہ کی پوری اقدام ضم ہوجاتی ہیں۔

ابتدا میں آرٹ مذہب کے زیر اثر رہا لیکن آرٹ نے مذہب کی زیر نگرانی کبھی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کیا۔ کیونکہ مذہب انسان کی ایسی ضرورت پیدا کرتا ہے جو آرٹ کی محسوسات کے بغیر بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے آرٹ کے بارے میں مذہب کا معاندانہ رویہ رہا ہے۔

آرٹ ہر شکل میں تحریک پیدا کرتا ہے لیکن جو آرٹ محسوسات اور خیالات سے زیادہ واقعات میں جکڑ جاتا ہے وہ ختم ہوجاتا ہے۔ مثلاً" شاعری ایک نئی دنیا پیدا کرتی ہے وہ موجودہ واقعات کو بیان نہیں کرتی۔ اسی لیے شاعری اور فلسفہ میں تضاد ہے۔

بورک ہارڈٹ کلچر کے اثر و نفوذ کا ذریعہ تجارت کو بتاتا ہے۔ ایک انتہائی ترقی یافتہ معاشرہ اپنی صنعت و حرفت کے ذریعہ کلچر کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ جیسے اٹرسکن اور پونٹک یونان کی خوبصورت چیزوں کو خریدتے تھے۔ انہیں اپنے پاس رکھنے کی وجہ سے ان کا یونان سے ذہنی تعلق پیدا ہوا۔ کلچر کے اس اثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری اقوام میں اس سے کوشش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ "ایسا ہم بھی کرسکتے ہیں" اس باہمی تعلق سے مختلف مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے ایک ہی معیار اور سطح کی اشیاء تخلیق کرتے ہیں۔ کلچر ذہنی بلندی پر پہنچ کر کسی مرکز پر جمع ہوجاتا ہے۔ جیسے ایتھنز اور فلورنس۔ یہ مرکز کلچر میں علاقائی تعصب کو پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں یہ تفخر پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ ہر کام کرسکتے ہیں۔ اسی جذبہ کے تحت وہ دوسروں سے علیحدگی اختیار کرلیتے ہیں اگرچہ وہ ٹکنالوجی اور صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرلیتے ہیں لیکن روحانی اعتبار سے وہ جمود اور تنگ نظری کی جانب چلے جاتے ہیں۔

کلچر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ معاشرے کے تمام افراد کی سرگرمیوں کو ایک زنجیر میں جکڑے رکھتا ہے چاہے وہ اعلیٰ ذہن کی تخلیق ہوں یا معمولی کاریگری اور دستکاری کے کام کوئی بھی ایجاد چاہے وہ ذہنی ہو یا روحانی' معاشرے کے ہر فرد کو متاثر کرتی ہے۔

بورک ہارڈٹ ایک عظیم کلچر کی یہ خصوصیت بتاتا ہے کہ اس کا دوبارہ احیا ہو سکتا ہے۔ اور آنے والی نسلیں اسے یا تو ورثہ کے طور پر یا اس کے قابل قدر اوصاف سے متاثر ہوکر اسے پورا یا تھوڑا بہت اختیار کرلیتی ہیں۔ عام طور سے سیاسی اور مذہبی کلچر کا احیاء ساتھ ساتھ نہیں ہوتا۔ لیکن شارلیمین کے زمانہ میں ان دونوں کا احیاء ہوا۔ رومی شہنشاہیت اور قدیم رومی آرٹ و ادب دوبارہ سے مقبول ہوئے اس کے علاوہ تاریخ میں مختلف کلچروں کا احیاء ہوا۔ مثلاً" جلاوطنی کے بعد یہودیت کا احیاء اور ساسانیوں کے زمانہ میں ایرانی شہنشاہیت کا احیاء لیکن اس کی زندہ مثال تحریک نشاۃ ثانیہ ہے' جس نے اٹلی کے محدود میدانوں سے نکل کر یورپی شکل اختیار کی۔

بورک ہارڈٹ اپنے زمانہ کے کلچر کو یعنی انیسویں صدی کو اس لحاظ سے فوقیت دیتا ہے کہ اس میں تمام زمانوں' قوموں اور کلچروں کی روایات' اقدار اور افکار ذخیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ اس لیے انیسویں صدی کا ادب دنیا کا ادب ہے۔ دنیا کا ہر شخص آزاد ہے کہ وہ دنیا کے ہر علاقے کی روایات کو اختیار کرے کیونکہ ریاست اور چرچ (مذہب) اب اس کی راہ میں حائل نہیں۔

دنیا کی تاریخ پرسکون اور خاموش نہیں اس میں تلاطم و شور' ہنگامہ و انقلاب' تراش و خراش اور شکست و ریخت ہے۔ فطرت بے چین ہے اور فطرت کی بے چینی قوموں میں تبدیلیاں لاتی رہتی ہے۔ نظریات و خیالات' مقصد زندگی' مسلک حیات' طریقہ کار و عمل' انتظام حکومت و اخلاقی اقدار ہر چیز ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ کی جانب رواں دواں رہتی ہیں۔ قومیں نئے نئے بحرانوں کا شکار ہوتی ہیں۔ انقلابات آتے ہیں اور اس انتشار و خلفشار سے ایک نئی زندگی' نیا ماحول اور نئی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔

بورک ہارڈٹ کے نزدیک یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی ذہنی ترقی کو اسی وقت تکمیل کی جانب لے جاسکتا ہے۔ جب وہ دوسروں سے اپنا تقابل کرے۔

قوم میں طاقت کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب وہ حالت جنگ میں ہو کیونکہ اس کی طاقت اسی وقت وجود میں آتی ہے۔ اس لیے قوم کی زندگی میں جنگ اہمیت کی حامل ہے۔ ہیراک لی ٹس جنگ کو تمام چیزوں کا بانی قرار دیتا ہے اور لاسا (LASULX) مخالفت کو تمام ترقی کی بنیاد سمجھتا ہے۔ جنگ دراصل ایک فطری اور عالمی قانون ہے.جو ہر شے میں ہر جگہ اور ہر ماحول میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اس لیے بورک ہارڈٹ جنگ کو ایک

صحت مند معاشرے کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہ قوم بہادری' حق گوئی اور اتحاد پیدا کرتی ہے۔ لیو (LEO) جنگ کو ایک وہ فرحت بخش ذریعہ بتاتا ہے جو گھٹیا اور کمزور کو ختم کردیتی ہے۔ طویل امن ہمیشہ جسمانی کمزوری کا باعث ہوتی ہے اور اس دور میں خوف زدہ سہمے ہوئے اور دہشت زدہ افراد پیدا ہوتے ہیں جو اپنے وجود سے چمٹے رہتے ہیں۔ اور اپنے حقوق کی باتیں کرتے ہیں۔ لائق اور ذہین افراد کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور درحقیقت پوری قوم کے خون کو فاسد کردیتے ہیں۔ اسی لیے جنگ ضروری ہے تاکہ یہ ناتواں اور منحوس زندگیاں ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں۔

جنگ قوم میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہے اس بحران پر افراد اور جماعتیں اپنے اختلافات کو ختم کرکے ایک عظیم مقصد کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف طاقت کے ذریعے امن برقرار رکھا جاسکتا ہے اور صرف جنگ کی صورت میں اس طاقت کا لوہا منوایا جاسکتا ہے۔ اس لیے امن جنگ میں پوشیدہ ہے۔ اگر جنگ انصاف پر مبنی ہو تو تاریخ میں ہمیشہ انقلاب لاتی ہے۔ جیسے ایرانیوں کی جنگ نے یونانیوں کو متحد اور طاقتور بنا دیا یا اسپین سے جنگ کے بعد نیدر لینڈ نہ صرف آزاد ہوا بلکہ اس میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی۔

معمولی جھگڑے تاریخ میں کوئی بحران پیدا نہیں کرسکتے یہ انتہائی بے کسی اور گمنامی کے ساتھ ختم ہوجاتے ہیں۔ موجودہ زمانے (19 صدی) کی جنگیں بھی صحیح بحران پیدا نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ ان جنگوں کے باوجود شہری زندگی متاثر نہیں ہوتی۔ دوسرے اب جنگ بہت مختصر وقت کے لیے ہوتی ہے اس لیے تباہی کی پوری طاقتیں عمل میں نہیں آتیں۔ جب کہ یہی طاقتیں پرانے نظام کو ختم کرکے نیا نظام پیدا کرتی ہیں۔

بورک ہارڈٹ قوم اور معاشرے کے دوسرے بحران کی نشاندہی کرتے ہوئے معاشرے کی طبقاتی کشمکش اور ذات پات کی تفریق کو انتہائی اہمیت دیتا ہے جب معاشرہ ظالم و مظلوم میں بٹ جاتا ہے تو مظلوم طبقہ ہمیشہ ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے یہ احتجاج مقصد قانون اور اس امتیاز کے خلاف ہوتا ہے جس کا وہ شکار ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر مذہب دونوں جانب سے ساتھ دیتا ہے اور نئے مذاہب و قوانین اسی بحران سے پیدا ہوتے ہیں۔

یونان کی ریاستیں جن بحرانوں سے گزریں ان میں بادشاہت' امراء کا اقتدار'

جمہوریت اور مطلق العنانیت کے مرحلے تھے۔ چونکہ یونان میں ان بحرانوں کا دائرہ عمل بہت تنگ تھا۔ اس لیے یہ مقامی تھے' یہاں تک کہ پے لی پونیشن جنگ بھی ایک بڑا قومی بحران ثابت نہیں ہوئی روم میں تمام انقلابات کے باوجود اس بات کی کوشش کی گئی کہ حکومتوں غلاموں کے ہاتھوں میں نہ جائے اور روم ہمیشہ ایک طاقت سے دوسری طاقت کے ہاتھوں منتقل ہوتا رہے۔ کانسٹائن اور اس کے جانشینوں نے چرچ کے ارتقاء کے دوران شہنشاہیت کو محفوظ رکھا' لیکن جب عیسائیت کا پوری طرح غلبہ ہوگیا تو شہنشاہیت ختم ہوگئی اور ریاست چرچ کے اقتدار میں چلی گئی۔

معاشرے میں بحران کیوں پیدا ہوئے ہیں؟ بورک ہارڈٹ اسے "ماضی کے خلاف احتجاج کہتا ہے" کسی بحران کے پیچھے صرف ایک وجہ نہیں ہوتی بلکہ کئی وجوہات اور تلخیاں اکٹھی ہوتی رہتی ہیں' پھر اس مخالف تحریک میں ہر وہ شخص شامل ہوجاتا ہے جو تبدیلی کا خواہشمند ہوتا ہے یہ تحریک اس مرحلہ پر پہنچ کر بحران پیدا کرتی ہے جہاں ایک نظام موت کے لیے اور دوسرا وجود میں آنے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔

اس تحریک میں کچھ شخصیتیں اپنی فصاحت و بلاغت اور ذاتی صلاحیتوں سے ایک نئی روح پیدا کردیتی ہیں اور تحریک کو صحیح شکل دیتی ہیں۔ اس کے بعد ہی امید کے چہرے سے پردہ اٹھتا ہے اور عوام اس میں شامل ہوجاتے ہیں وہ ماضی کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں اور مستقبل سے پرامید بھی ہوتے ہیں۔ مستقبل کا یہ درخشاں تصور 1789ء فرانسیسی انقلاب کے انتخابی منشوروں میں پوری طرح نمایاں ہے اور روسو کا یہ قول کہ انسان فطرتاً نیک ہے ان کے لیے راہنمائی کا باعث تھا لیکن خوشی مسرت کا پیغام لانے والا یہ بحران 1795ء میں شاں دومار (CHAMPS DEMARS) کے قتل عام پر ختم ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کی فطرت ایسے موقعوں پر اپنی ساری امیدیں طاقت کے سپرد کردیتی ہے۔

بحران پہلے مخالفت کی شکل میں ابھرتے ہیں' یہ مخالفت ان کی کسوٹی ہوتی ہے کیونکہ یہاں کمزور اور کم طاقت والی تحریکیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اور صرف وہ تحریکیں ابھرتی ہیں جن میں شدت اور مخالفت ہوتی ہے۔ اگر کسی سازگار لمحہ کے وقت بحران ٹل جاتا ہے۔ اور عمل میں نہیں آتا تو تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے کیونکہ اس کی مخالف قوتیں اسے تباہ کرنے کا ارادہ کرتی ہیں۔ اگر کسی تحریک کی زیادہ مخالفت کی جائے تو اسے اور مضبوط اور طاقتور بناتی ہے۔ سرکاری تحریک کے میدان قومی اسمبلیاں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بہت جلد بیکار

ہوجاتی ہیں یہ یا تو کسی طاقتور شخصیت کے ہاتھوں غلام بن جاتی ہیں۔ جیسے 1815ء میں نپولین نے فرانس کی اسمبلیوں کو اپنا تابع بنا لیا تھا یا یہ پھر بااقتدار جماعت کے مفاد کا تحفظ کرتی ہیں۔

تحریک جب پرانے نظام کو ختم کرکے نیا نظام قائم کرتی ہے تو پرانے نظام کے حامی ختم کردیئے جاتے ہیں۔ تحریک کے وہ راہنما جنھوں نے اسے کامیابی تک پہنچایا تھا انہیں تحریک کی قیادت سے محروم کردیا جاتا ہے کیونکہ ان کے خیالات رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لیے تحریک ہر لمحہ اور موڑ پر اپنے صحیح نمائندے منتخب کرتی ہے بعض اوقات تحریک کے بانی اپنے ذہن میں بعض تصورات کو لیے اپنی فصاحت سے عوام کی جذبات کو بھڑکا کر اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں' جس کے وہ اہل نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ یہ لوگ تحریک کا تیزی سے ساتھ نہیں دے سکتے اور اسی تیزی کے ساتھ انہیں بدل دیا جاتا ہے اور دوسری نسل ان کی جگہ لے لیتی ہے۔

تحریک کی مخالف قوتوں میں وہ تمام اقدار و قانون ہوتے ہیں جو اخلاقی اور ثقافتی لحاظ سے معاشرے میں گہری جڑیں رکھتے ہیں۔ اس لیے ان اقدار کے قیام اور استحکام کے لیے معاشرہ پوری جدوجہد کرتا ہے۔ یونان میں پے لی پونیشن جنگ کے بعد سیاسی زوال ہوا تو اس نے انتشار اور بے چینی پیدا کی۔ کورے را (CORYRA) کے مظالم نے رد عمل کے طور پر تمام یونان کو بیدار کردیا۔ جس کی وجہ سے دو مخالف قوتوں کا تصادم لازمی ہوا۔ عوام نے خفیہ جماعتیں بنا کر قانون کی مخالفت کی' رقابت' دشمنی نفرت و عداوت دونوں طرف سے شدید صورت میں ظاہر ہوئیں۔ اس میں بیٹوں اور وارثوں تک کا خیال نہیں کیا گیا۔
جب کوئی معاشرہ اس بحران سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت وہاں دہشت پسندی کا دور دورہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس میں ایک طرف تو خاص خاص لوگوں کو چن کر قتل کیا جاتا ہے جو معاشرے کے استحکام کو متاثر کرتا ہے اور دوسری جانب اچانک عوام کا قتل عام ہوتا ہے۔ جیسے یونان اور اٹلی کی ریاستوں میں ہوا۔ اس موقع پر سب سے زیادہ غصہ وطن سے بھاگ جانے والوں پر ہوتا ہے۔ جب "گرانڈ ڈیوک کو سی مو" اور "فرانسکو میڈیشن" نے ان لوگوں کو زہر دلوایا تو تمام دنیا نے ان کے اس ظالمانہ رویہ پر احتجاج کیا لیکن جب جمہوری ریاستوں نے ان کے رشتہ داروں کو قتل کرایا تو اسے سیاسی مصلحت قرار دیا گیا۔
اس دہشت خیز بحران کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بحران اپنی شدت اور اپنے ہی ظلم کی

آگ میں جل کر ختم ہوجاتا ہے۔ بحران کے ہر موڑ پر لیڈروں کو "اعتدال پسند" کہہ کر انہیں ختم کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح بحران اپنے ہی رد عمل کا شکار ہوکر صدمہ اٹھاتا ہے۔ بحران میں جو شدید زیادتیاں کی جاتی ہیں۔ وہ اعتدال پسند افراد کو تھکا دیتی ہیں۔ عوام جو ابتدا میں پرجوش ہوتے ہیں آہستہ آہستہ لاتعلقی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ چونکہ دیہاتی آبادی کو اس تحریک میں شریک نہیں کیا جاتا اس لیے وہ وہ اس کے مقاصد سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جیسے چوتھی صدی میں رومی نو آباد دیہات والوں سے نہیں پوچھا گیا کہ کیا وہ عیسائی ہونا چاہتے ہیں؟ اور نہ ہی چھٹی صدی میں پولینڈ والون سے یہ کہا کہ وہ کیتھولک مذہب اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ ہر موقع پر ان کے جاگیرداروں نے ان کی جانب سے فیصلہ منظور کرلیا۔

تحریک جب ایک بار تباہی و بربادی کے ہتھیاروں کو استعمال کرتی ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام خفیہ قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں جو اس انتشار میں اپنا حصہ بٹورتی ہیں۔ اور تحریک کو معہ اس کے آئیڈیل کے ہڑپ کرجاتی ہیں۔ تحریک کے تمام رہنما ہر مرحلہ پر تختۂ دار پر چڑھا دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے والی جماعت کم حیثیت اور کم مرتبہ ہوتی ہے۔ آخر میں تحریک کے رہنما بھی بدل جاتے ہیں۔ کچھ عیش و عشرت کو اختیار کرلیتے ہیں۔ اور کچھ اپنی زندگی بچانے کی خاطر خاموشی اختیار کرلیتے ہیں۔ ان تمام وجوہات کی وجہ سے تحریک کی رفتار مدہم ہوجاتی ہے۔ مثلاً" تحریک اصلاح مذہب 1524ء تک مقبول عام تھی۔ کسانوں کی جنگ نے اسے مزید طاقت ور بنایا؟ لیکن اس جنگ کی تباہی نے تحریک کو نقصان پہنچایا۔ جنوبی جرمنی میں جہاں یہ تحریک کامیاب رہی اس کا فائدہ وہاں کی حکومتوں نے اٹھایا۔ شمالی جرمنی میں اس کی وجہ سے کیتھولک مذہب کو استحکام ملا۔

تحریک کے خاتمہ کے بعد جب معاشرہ مایوسی کا شکار ہوجاتا ہے تو وہ حکومت کے ان مظالم کو خاموشی سے برداشت کرتا ہے جنہوں نے بحران پیدا کیا تھا۔ انگلستان میں پریس بائٹرین نے چارلس کی مدد کی تھی لیکن اس کی حکومت میں ان ہی پر ظلم کیے گئے اور انہوں نے یہ برداشت بھی کئے۔

بحران کا ایک مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں دولت کی تقسیم اور جائیداد کا مسئلہ آتا ہے۔ کیونکہ کچھ باصلاحیت اور ذہین افراد بحران کے دوران دولت جمع کرتے ہیں۔ اور پھر اس دولت سے کسی ایسی جماعت کو طاقتور بناتے ہیں جو ان کی جائیداد کی حفاظت کرے۔

چنانچہ ہر تحریک کے پس منظر میں وہ طبقہ ہوتا ہے جو جائیداد حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ تحریک اصلاح مذہب کے پیچھے بھی چرچ کی جائیداد کا چکر تھا۔ جب یہ طبقہ جائیداد پر قابض ہوجاتا ہے تو پھر اس کے استحکام کی کوشش کرتا ہے اسی لئے 5-1794ء میں فرانس کے نئے جاگیر دار انقلاب کے خاتمہ کے حامی تھے اور ایک مطلق العنان حکومت کے خواہش مند تھے جو ان کے مال غنیمت کو بچائے رکھے۔ یہی کچھ البی جینیشن (Albigension War) جنگ میں ہوا جبکہ 34- جاگیرداروں نے اپنے مفاد کی خاطر کونٹ ٹیومن کو طاقت حاصل نہیں کرنے دی۔ جو بدعت کے خلاف اٹھ رہا تھا کیونکہ وہ اس بات سے قطعی لاتعلق تھے ان کے کسان البی جینیشن رہیں یا کیتھولک' وہ صرف اپنی جائیداد کا تحفظ چاہتے تھے۔

تحریک کی کامیابی کے بعد معاشرے کے کچھ طبقوں یا ملک کے کچھ حصوں سے اس کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔ تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان باغیوں کو کچلا جائے۔ اس لیے کرام ویل نے آئرلینڈ سے جنگ کی اور فرانس نے انقلاب کے دوران باغیوں سے انتقام لیا جب ملک پر بیرونی حملوں کے خطرہ ہوتا ہے تو فوج کو دفاع کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے 1792ء میں اتحادیوں کے خلاف فرانس نے فوج تیار کی لیکن اندرونی اور بیرونی خطرات بحران کو دہشت پسند بنا دیتے ہیں۔ اس کا شکار سب سے پہلے فوج کے جنرل ہوتے ہیں۔ جیسے 94-1793ء میں فرانس میں ہر اس جنرل کا گلا کاٹ دیا جاتا ہے جو ناکام ہوتا تھا۔ دہشت پسندی اور انتشار کو ختم کرنے کے لیے ایک اور بحران پیدا ہوتا ہے۔ اس موقع پر جو انقلاب آتے ہیں وہ دستوری اور عوام کی حکومت کو ختم کردیتے ہیں۔ قوم یا تو اس انقلاب کو خوش آمدید کہتی ہے یا اس سے لاتعلق رہتی ہے۔ جیسے 49- ق م میں سیزر کا انقلاب 1653ء میں کرام ویل کا اقتدار' اور دونوں نپولین کے انقلاب' ایسی حکومت ابتدا میں دستور کو تبدیل کرتی ہے۔ جیسے سیزر نے سینٹ کو زیادہ نشستیں دیں اور نپولین سوم نے عوام کو حق رائے دہی دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ حکومت بادشاہت میں بدل جاتی ہے۔ اور ریاست کو بھی اپنے نظریات میں ڈھال لیتی ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ امراء کی حکومت یا جمہوریت خود دستبردار ہوجاتی ہے اور مطلق العنانیت کو قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یونان کی ریاستوں میں ایسا ہی ہوا۔ ہیبرس (HYBREAS) نے ایتھوڈیموس سے کہا۔ ایتھوڈیموس تم ایک لعنت ہو' نہ تو ہم ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ تمہارے

بغیر" اسی لیے کرام ویل نے اپنے جنرلوں کی مدد سے حکومت کی۔ اس موقع پر اگر کوئی ملک کو دستور دینے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ آزادی نہیں آتی بلکہ کوئی دوسرا شخص طاقت حاصل کرلیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عوام خود بھی آزادی حاصل کرنا نہیں چاہتے۔

افراد اور قوموں کی زندگی خوشی و مسرت اور رنج و الم سے آلود ہوتی ہے۔ خوش قسمتی و بدقسمتی پہلو بہ پہلو اور شانہ بشانہ ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بورک ہارڈٹ انسانی تاریخ کے عظیم سلسلہ میں بھی خوش قسمتی و بدقسمتی کے لمحات کو ایک دوسرے سے چمٹا ہوا دیکھتا ہے۔ ایک قوم کے لیے جو لمحہ خوش قسمت ہوتا ہے وہی دوسری قوم کے لیے بدقسمتی کا باعث بن جاتا ہے۔ مثلاً"

1- یہ خوش قسمتی تھی کہ یونانیوں نے ایران کو فتح کرلیا اور رومیوں نے کارتھیج کو۔

2- یہ بدقسمتی تھی کہ پے لی پونیشن جنگ میں اسپارٹا نے ایتھنز کو شکست دے دی۔

3- یہ بدقسمتی تھی کہ سیزر رومی شہنشاہیت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے سے پہلے قتل کردیا گیا۔

4- یہ بدقسمتی تھی کہ جرمن قبیلوں کی ہجرت میں انسانی ذہن کی اعلیٰ تخلیقی قوتیں ختم ہوگئیں لیکن یہ خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے ایک صحت مند نسل دنیا کو دی۔

5- یہ بدقسمتی تھی کہ جرمن شہنشاہ پاپائیت کے مقابلہ میں شکست کھا گئے اور چرچ نے آمرانہ نظام قائم کرلیا۔

6- یہ بدقسمتی تھی کہ تحریک اصلاح مذہب آدھے یورپ میں کامیاب رہی اور پروٹسٹنٹ دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔

تاریخ میں کسی خاص دور یا زمانہ کو بہترین اور سنہرا کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہر جماعت و فرد کی رائے میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً" پیرکلس کے زمانہ کو یونان کی تاریخ کا سنہرا دور کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں آرٹ و شاعری اعلیٰ درجہ کو پہنچ گئی تھی۔ رینان کے نزدیک 1815ء سے لے کر 1848ء تک کا زمانہ فرانس کا بہترین زمانہ تھا۔ بورک ہارڈٹ کے نزدیک زمانہ کو اچھا یا برا سمجھنا افراد کے اپنے خیالات و تصورات اور ماحول پر ہوتا ہے کچھ جمہوریت کو اچھا سمجھتے ہیں' کچھ بادشاہت کو اور کچھ سیاسی انتشار کو لیکن ان سب سے زیادہ جس کی خواہش ہر فرد کو ہوتی ہے وہ یہ کہ معاشرے میں تحفظ ہو اور خصوصیت کے

ساتھ مال و جائیداد کی حفاظت کی جائے۔ ہمارے زمانہ میں تمام اخلاقی اقدار جائیداو کی حفاظت کے لیے تخلیق کی گئیں اور جو چیز ریاست کی حدود سے باہر ہے اسے انشورنس کے ذریعہ پورا کیا گیا۔

بورک ہارڈٹ قوم و ملک کو ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ یہ عظمت خوشگوار راستوں سے گزر کر نہیں بلکہ اس کے جلو میں قتل و غارت گری اور مظالم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان تمام دکھوں اور تکالیف کو یہ کہہ کر نظر انداز کردینا کہ یہ وقتی بدقسمتی تھی' انصاف نہیں۔ تباہی و بربادی کے بعد خاموشی کو خوشی و مسرت سے تعبیر کرنا اور اسے عظیم بتانا' حقیقت سے انکار ہے۔ تاریخ میں اس قسم کے فیصلے دینے والے فخر و غرور سے یہ کہتے ہیں کہ "یہ ہمارا فیصلہ ہے" حالانکہ ان کا فیصلہ ہمیشہ ان کی اپنی پسند یا ناپسند میں محدود ہوتا ہے۔

مسرت کا یہ تصور کہ وہ کسی خاص ماحول اور حالات میں ہوتی ہے غلط ہے۔ جب معاشرہ قدیم طریق زندگی سے نکل کر جس میں اس کے ہر دن اور ہر صدی برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخی دور میں آتا ہے تو اس کے بعد وہ ایک مستقل حالت میں نہیں رہتا کیونکہ جمود اس کے لیے موت کا باعث بن جاتا ہے۔ صرف حرکت تمام دکھوں اور تکالیف کے باوجود اس کی زندگی برقرار رکھتی ہے اس لیے مسرت کا یہ تصور غلط ہوجاتا ہے کہ مسرت نام ہے اس حالت کا کہ جس میں تکلیف نہ ہو۔

لیکن جب معاشرہ اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے جو تہذیب و تمدن کی معراج ہوتا ہے تو اپنی تمام روحانی و مادی اقدار کو مقدس سمجھ کر ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس وقت معاشرہ عوام اور زمانہ کا یہ جمود روحانی' ذہنی اور مادی اقدار کے لیے تحفظ ہوتا ہے تاکہ وہ انہیں بحفاظت مستقبل کے حوالے کردے۔ اس لیے اس وقت کی یہ خاموشی' موت کی نہیں بلکہ اس نیند کی مانند ہوتی ہے جو ذہن و جسم کو تازگی و شگفتگی بخشتی ہے۔

'بورک ہارڈٹ تاریخ میں طاقت کو سب سے زیادہ باعمل اور موثر دیکھتا ہے۔ فطرت کے ہر پہلو میں طاقت کمزور کو ہراساں و دہشت زدہ کیے ہوئے اپنے آہنی پنجہ میں جکڑے ہوئے ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں طاقتور ہمیشہ کمزور کو نیست و نابود کرتا یا انہیں اپنا غلام بنایا کرتا ہے۔ کمزور نسل کی خدمت میں غلامی مقسوم ہے۔ اسی طرح ایک ہی نسل میں کمزوروں کے فرائض میں ہے کہ اپنے سے طاقتور کی خدمت کریں۔

بورک ہارڈٹ اس نظریہ کا قائل نہیں کہ ہر تباہی کے بعد تعمیر ہوتی ہے اور ہر خاکستر سے ایک نیا جہان پیدا ہوتا ہے جس طرح ایک سر سبز کھیت کو اگر بری طرح سے پامال کردیا جائے تو ہمیشہ کے لیے بنجر ہوجاتا ہے اسی طرح اگر افراد کو سختی و تشدد سے پوری طرح تباہ و برباد کردیا جائے تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اور وہ کبھی صحت مند قوم کی شکل میں دوبارہ سے پیدا نہیں ہوتے۔ ایشیا میں اس کی مثال تیمور کی ہے جس نے ایک لشکر جرار کے ہمراہ فتوحات کا سلسلہ شروع کیا' دشمنوں کے سروں کے مینار تعمیر کیے' لوٹ مار' قتل و غارت گری' تباہی و بربادی' آگ و خون' ظلم اور تکالیف اس کے ساتھ ساتھ چلیں' جہاں جہاں اس کے قدم گئے وہاں آگ کے شعلوں اور سسکتی ہوئی لاشوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان تمام ملکوں میں جہاں اس نے فتوحات کیں' لوگ انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبات سے خالی ہوگئے۔ تیمور اور بایزید کا تصادم تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ تیمور کی فتح اور عثمانیوں کی شکست نے ان کی قوت و طاقت کو پاش پاش کرکے رکھ دیا۔ وہ جس تیز رفتاری سے یورپ کو فتح کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے وہ اچانک رک گئی اگرچہ اس کے بعد بھی سلاطین عثمان یورپ کے لیے ڈر اور خوف کا باعث رہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اپنی اس طاقت کو حاصل نہیں کرسکے جو بایزید کے زمانہ میں تھی۔

بورک ہارڈٹ مورخوں کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ تاریخ میں روپوش اور گمنام آرٹ' ادب اور شاعری کو تلاش کریں کیونکہ تاریخ ایک سلسلہ ہے اور انسانی تاریخ کے ذہنی سلسلہ میں جو جگہ جگہ خلا ہیں انہیں بھرنا مورخ کا کام ہے۔ کیونکہ یہ تسلسل انسانی ذہن کو ترقی کی جانب رواں دواں رکھتا ہے اس لیے کھوئی ہوئی چیزوں اور نوادرات کی تلاش' ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنا' انسان کی شدید خواہش ہے۔

قدیم آرٹ کی گمنامی میں شاید ایک خوبی یہ بھی ہو کہ مستقبل کا آرٹ آزادی کے ساتھ تخلیق ہو۔ اگر پندرھویں صدی میں یونانی سنگ تراشی کے تمام نوادرات اصل حالت میں دستیاب ہوجاتے تو شاید لیونارڈو' رافیل' ٹی ٹاں اور کوریگو شاندار مجسمہ اور تصاویر نہیں چھوڑتے کیونکہ یونان کی قدیم تخلیقات انہیں حوصلہ نہیں دیتیں اور ان کے ساتھ موازنہ کرتے وقت ذہنی طور پر وہ پیچھے رہ جاتے۔ اسی طرح اگر اٹھارویں صدی میں یونان کی نغمیہ شاعری ظاہر ہوجاتی تو یہ جرمنی کی شاعری کو ماند کردیتی اس لیے قدیم آرٹ و شاعری کا ایک خاص لمحہ پر ظاہر نہ ہونا۔ آرٹ و ادب کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

دینی لوسکی

نکولائی دینی لوسکی روس کا سیاست داں اور مورخ تھا۔ اس نے 1869ء میں روس اور یورپ کے تعلقات پر ایک کتاب لکھی۔ اس میں اس نے جائزہ لیا کہ کن وجوہات کی بنا پر صدیوں سے روس اور یورپ کے تعلقات کشیدہ رہے۔ اس کشیدگی کی تہہ میں اسے روس اور یورپ کے تمدنوں میں اختلاف نظر آیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یورپ کا تمدن بے جان' بس حس اور زوال پذیر ہے۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں روس کا تمدن قوت و طاقت' نئی زندگی اور ولولہ سے آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔

نکولائی دینی لوسکی یورپ کے تمدن کو آفاقی نہیں سمجھتا اور نہ ہی یورپی تمدن کو متحرک جاندار اور ترقی یافتہ تسلیم کرتا ہے۔ دوسرے تمدنوں کا دائرہ اثر بھی محدود ہے اور ان حدود سے باہر اس کا اثر و دخل نہیں۔ روسی تمدن بذات خود ایک جداگانہ تمدن ہے۔ جس کی اپنی علیحدہ خصوصیات اور عناصر ہیں۔ اس کی اپنی انفرادی حیثیت ہے۔ اس لیے روسی تمدن نے یورپی تمدن سے اور اس کے تجربات سے کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔

دینی لوسکی نے تاریخ کے اس اہم سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ تمدن کی زندگی اور موت کا کیا راز ہے؟ اور وہ کون سی قوتیں اور عوامل ہیں جو تمدن کے عروج و زوال میں حصہ لیتے ہیں؟ اور کیوں ہر تمدن زندگی کے مرحلوں سے گزرتا ہوا فنا کی وادیوں میں گم ہوجاتا ہے؟ ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ دنیا کی تاریخ مختلف تمدنوں پر مشتمل ہے اور ہر تمدن نے اپنے دائرے اور حدود میں رہتے ہوئے انسانیت کی ترقی میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ اس لیے کوئی تمدن آفاقی ہونے کا دعویدار نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی تاریخ میں 12 تمدن مشہور ہیں۔ جنھوں نے انسانیت کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور اپنے اپنے دائرے میں انقلابی تبدیلیاں لائے ہیں۔ یہ مشہور 12 تمدن یہ ہیں۔

مصری' چینی' اشوری و بابلی' قدیم سمیری' فونیقی' چالدی' ہندو' ایرانی' یہودی' یونانی' عربی اور یورپی۔

امریکہ میں دو تمدن پیدا ہوئے۔ ایک میکسیکو اور دوسرا پیرو میں۔ لیکن یہ دونوں

تمدن شباب پر پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگئے۔

نکولائی دینی لوسکی تمام انسانی قبیلوں اور نسلوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

1- وہ جماعت جو تخلیقی افراد پر مشتمل ہوتی ہے یہ اپنی صلاحیت اور ذہانت سے تمدن کو ترقی پذیر بناتے ہیں۔

2- دوسری جماعت ان لوگوں پر تشکیل پاتی ہے جنہوں نے معاشرے میں منفی کردار ادا کیا اور دنیا میں تباہی و بربادی لائے جیسے منگول' ہن اور ترک (ابتدائی زمانہ میں)

3- تیسری جماعت میں وہ لوگ آتے ہیں جنہوں نے نہ تو تمدن میں کوئی مقام حاصل کیا اور نہ تباہی و بربادی میں کوئی حصہ لیا۔ اس جماعت کے لوگوں نے تاریخ میں نہ تو منفی کردار ادا کیا اور نہ مثبت۔ لیکن یہ لوگ دوسری مثبت و منفی طاقتوں کے ذریعے استعمال میں لائے گئے۔ اور ان کی ہدایت و رہنمائی میں انہوں نے تاریخ میں کردار ادا کیا۔

اس سے دینی لوسکی نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی تمدن کی تاریخ میں یہاں مثبت قوتیں ہیں وہاں منفی قوتیں بھی برسرپیکار رہتی ہیں۔ منگول' ہن اور ترکوں نے تباہی و بربادی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور ایک مرتے ہوئے تمدن کو مرنے میں مدد دی اور اس کے بعد پھر خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کرلی جس کا کوئی مقصد نہیں تھا اور آخر اسی حالت میں روپوش ہوکر گمنامی میں ختم ہوگئے۔ جرمن اور عرب قبیلے جو اسی خانہ بدوشی کی حالت میں تھے ان سے بھی تعمیری اور تخریبی دونوں کام لیے گئے۔

تاریخ میں ایسے قبائل بھی ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتیں ابتدائی درجہ میں روک لی گئیں ایسی صورت میں نہ تو وہ تعمیری بن سکے اور نہ تخریبی' انہوں نے نہ تو مثبت کردار ادا کیا اور نہ منفی ان لوگوں کی حیثیت اور تشکیل سیرت کے مواد کی ہوتی ہے۔ جو معاشرہ اور تمدن کو سہارا دیتے ہیں۔ اور اس کی قوت و طاقت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ قبائل بذات خود تمدن میں کوئی اضافہ نہیں کرتے لیکن اس کی ترقی میں مدد ضرور دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی اپنی نہ تو کوئی تاریخ ہوتی ہے اور نہ ہی نمایاں حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ یہ پس منظر میں کچھ دیر باعمل رہ کر ختم ہوجاتے ہیں۔

کبھی کبھی بے جان اور زوال پذیر تمدن ان خانہ بدوش قبائل تک پہنچ جاتا ہے۔ جو تہذیب و تمدن سے مبرا ہوتے ہیں۔ لیکن جب تک کوئی تخلیقی نظریہ پرانے اور نئے تمدن کے افکار و خیالات کو متحد کرکے ان میں نئی زندگی اور جذبہ پیدا نہ کرے اس وقت تک وہ

ابھرنے نہیں پاتے۔ اس کی مثال ان لوگوں کی ہے جو جنہوں نے مغربی یورپی شہنشاہیت قائم کی' یہ لوگ رومی تمدن کے لیے "تشکیل سیرت کا مواد" ثابت ہوئے اور شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد ایک نئی شکل میں دوبارہ ابھرے۔ اس کی دوسری مثال منگولوں اور ترکوں کا قبول اسلام ہے جس کی وجہ سے اسلام کی گرتی ہوئی طاقت سنبھل گئی۔

دینی لوسکی کے نزدیک تمدن ایک وسیع اور جامع شے ہے جو ایک خاص علاقہ میں اپنا اثر رکھتی ہے۔ مثلاً" یونانی تمدن کا جب ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد پورا یونان جس میں ایتھنز اور اسپارٹا شامل ہیں' آجاتے ہیں۔ مغربی تمدن میں جرمنی اٹلی اور دوسرے یورپی ممالک آجاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمدن ان تمام ملکوں کی تاریخ کو ایک دامن میں سمیٹ لیتا ہے جو ملک ان تمدنوں کے دائرے اور اثر میں نہیں آتے ان کی تاریخ آزاد ہوتی ہے۔

دینی لوسکی تمدن کو انسانی زندگی سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ بھی اسی طرح مرحلوں سے گزرتا ہوا آخر میں مرجاتا ہے۔ اس لیے ہر تمدن کا انجام یقینی موت ہوتا ہے۔ لیکن تمدن کی زندگی میں اس کا دور شباب اور عروج دوسرے ادوار کے مقابلہ میں سب سے مختصر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں تمدن زندگی کی تمام قوت و طاقت نچوڑ لیتا ہے اور اس کے بعد اس کا جسم طاقت سے محروم ناتواں و لاغر ہوجاتا ہے۔ ذہن و دماغ تخلیقی صلاحیتیں کھو دیتا ہے اور وہ گھسٹے ہوئے موت کی جانب رواں دواں ہوجاتا ہے۔

1- جب تمدن کی حیثیت "تشکیل سیرت کے مواد" کی ہوتی ہے یہ اس شکل میں ہزاروں برس قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن جب یہ ایک خاص شکل اختیار کرلیتا ہے تو اس وقت تک ایک منظم معاشرے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ منظم معاشرے کی تشکیل کے بعد اس کی پہلی حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔

2- تمدن کی زندگی کا دوسرا دور درمیانی ہوتا ہے اس دور میں ثقافت و سیاست کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور تخلیقی قوتیں جمع ہوتی ہیں تاکہ آنے والی زندگی میں کام آسکیں۔

3- تیسرا دور "دور شباب" ہوتا ہے - اس میں معاشرہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ترقی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ دور سب سے مختصر ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کی مدت چار سے چھ صدیاں ہوتی ہے۔

تیسرے دور میں معاشرے یا قوم کی تمام تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد تمدن تخلیقی طور پر خستہ اور مضمحل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ یہ خستگی زوال کو

دعوت دیتی ہے جس کے بعد تمدن ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ تمدن کی زندگی اور موت کا یہ عمل عین فطرت کے مطابق ہے جس طرح موسم گرما جب اپنی شدت پر پہنچتا ہے تو دن چھوٹے ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اور سخت گرمی اس وقت شروع ہوتی ہے جب سورج اپنی بلندی سے گزر جاتا ہے۔ جس طرح انسانی زندگی میں درمیانی عمر میں ذہن کی زرخیزی و جولانی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح تمدن کا زوال بھی اس کے عروج کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے۔ اس لیے ہر تمدن زندگی کی بھرپور رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور آخر میں تھکا ماندہ، خستہ، مضمحل اور بے جان ہوکر دم توڑ دیتا ہے۔

اشپنگلر

اوسوالڈ اشپنگلر 1880ء میں بلاخن برگ کے مقام پر پیدا ہوا' اعلیٰ تعلیم جرمنی کی تین مشہور یونیورسٹیوں' میونک' برلن' اور ہال میں حاصل کی۔ اس کے بعد اسکول میں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ 1911ء میں اس کے ذہن میں "زوال مغرب" لکھنے کا خیال آیا۔ اس لیے اس نے ملازمت چھوڑ کر اس کتاب کی تصنیف کی۔ 1914ء میں اس نے یہ مشہور کتاب مکمل کرلی۔ اشپنگلر کی کتاب نے تاریخ کے نظریہ میں ایک انقلابی تبدیلی کی اور فلسفہ تاریخ میں گراں بہا اضافہ کیا۔

ماضی کے وسیع و عریض اور گنجلک پس منظر میں جب ایک فلسفی مورخ تمدن کے عروج و زوال کی ایک متحرک تصویر دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر زندگی اور موت کا یہ لامتناہی سلسلہ تمدن کے عروج و زوال کا یہ المیہ کن قوانین کے تحت ہے؟ وہ کون سا نظام ہے جو اس عروج کے پیچھے سرگرم عمل ہے؟ کیا اس عمل میں کوئی طاقت پوشیدہ ہے؟ اور انسان کو اس پر کوئی اختیار ہے؟ اشپنگلر نے ان سوالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے دنیا کے وسیع و عریض اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کو دیکھا اور ان پراسرار قوتوں اور محرکات کی کھوج لگانے کی کوشش کی جو پردے کے پیچھے سے اس ڈرامہ کی ہدایت کاری میں مصروف ہیں۔ اس نے اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ انسان باوجود محنت' کوشش اور عمل پیہم کے ناکام ہے۔ اس کی تعمیر کردہ اور بنائی ہوئی نشانیاں کیوں ویرانی میں خاموشی کا لبادہ اوڑھے افسردگی کے ساتھ کھڑی ہیں؟

یہ عروج و زوال' یہ زندگی و موت' یہ شگفتگی و تازگی اور اس کے بعد مردنی و خزاں' اداسی و مجبوری' آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ دنیا کے ہر حصے اور ہر دور میں کھیلا جانے والا یہ ڈرامہ آخر کیا ہے؟ کیا انسان قدرت کی پراسرا طاقتوں کے ہاتھوں مجبور بے بس ہے؟ کیا وہ شطرنج کے بے جان مہرے کی طرح ہے؟ کیا وہ جس راستے پر چل رہا ہے وہ اس کے لیے پہلے سے متعین کیا جاچکا ہے؟ یہ جو کچھ ہورہا ہے کیا اس کا فیصلہ پہلے سے مرتب ہوچکا ہے؟

کیا انسان کی اپنی کوئی خواہش و مرضی نہیں؟ کیا وہ تقدیر کے اٹل قوانین کو تبدیل نہیں کرسکتا ہے؟ کیا وہ تقدیر کا مالک نہیں؟ بلکہ تقدیر کی بھاری زنجیروں میں بندھا و جکڑا ہوا' حرکت و آزادی سے محروم' مستقل ایک نپے تلے راستے پر چلا جارہا ہے۔ کیا تقدیر اور تاریخ لازم و ملزوم ہیں؟ کیا تاریخ بھی تقدیر کے بندھنوں میں بندھی' ماضی کے انبار کو اٹھائے ایک ہی راستے پر رواں دواں ہے؟

اشپینگلر سوالات کا جواب اثبات میں دیتا ہے وہ تقدیر اور تاریخ کو ایک مضبوط رشتہ میں جکڑا ہوا دیکھتا ہے۔ ایک ایسا مضبوط اور آہنی رشتہ جسے توڑنا انسان کی قوت و طاقت سے باہر ہے۔ تقدیر قوموں اور تمدنوں کو متعین اور طے شدہ راستہ پر لے کر چلتی ہے۔ پیدائش' ارتقاء' شباب' ضعیفی اور موت اس دائرے اور چکر سے فرار ممکن نہیں۔ تمدن کی زندگی اور موت اسی چکر میں گھومتی ہے۔ ہر تمدن کی پیدائش کے بعد ایک لازمی امر ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ جس میں کوئی ترمیم اور تنسیخ نہیں جب ایک تمدن فنا کی وادی میں روپوش ہوجاتا ہے تو پھر اس کا احیاء اور دوبارہ اس کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکنا اسے موت کی گہرائیوں سے واپس لانا اور اس کے بے جان ڈھانچہ کو آراستہ و پیراستہ کرنا ایک سعی لاحاصل ہوتی ہے۔

اشپینگلر تاریخ میں ہونے والے واقعات جو قوموں کی زندگی میں انقلاب لاتے ہیں یا کسی تحریک کی ابتداء' فن و آرٹ میں کمال ان سب کو عقل سے بالاتر سمجھتا ہے انسانی عقل مجبور ہے کہ وہ ان کی تہہ میں کام کرنے والے عوامل سے باخبر ہو۔ کوئی انسانی ذہن اس سے پردہ نہیں اٹھا سکتا کہ آخر چینی تہذیب دو ہزار قبل مسیح میں کیوں پیدا ہوئی؟ مصر میں اہراموں کی تعمیر کیوں اور کس طرح ہوئی؟ اور گوتھک طرز تعمیر کس طرح سے تشکیل پذیر ہوا؟ اور نہ ہی انسانی ذہن اس کا کوئی جواب دے سکتا ہے کہ آخر ہر تہذیب موت سے ہمکنار کیوں ہوتی ہے؟ اس کے نزدیک تاریخ کے اس عمل میں پراسرار طاقتیں کام کر رہی ہیں جن کا احاطہ انسان کی فہم سے بالاتر ہے۔

اشپینگلر کے نقطہ نظر سے ہر تہذیب کی اپنی علیحدہ روح ہوتی ہے اور اس کی علیحدہ شکل و صورت ہوتی ہے سیاسیات' اقتصادیات' فلسفہ' آرٹ اور مذہب وہ ذرائع ہیں جن سے ہر تہذیب اپنی ہیئت و صورت کو تشکیل دیتی ہے کیونکہ ہر تہذیب انفرادی خصوصیت کی حامل ہے اس لیے ایک تہذیب دوسری تہذیب پر اثر انداز نہیں ہوتی' ہر تہذیب اپنے

ماحول' حالات' خصوصیات اور اقدار کے دائرے میں محدود رہتی ہے۔ اس کی اپنی علیحدہ روح ہوتی ہے۔ اس کا اپنا جدا وطن اور خانہ ہوتا ہے۔ وہ اس میں مقید اور گرفتار رہتی ہے۔ ہر تہذیب کے ارد گرد بلند و بالا دیواریں ہیں اور ان سے نکل کر وہ دوسرے سے کوئی رشتہ اور تعلق قائم نہیں کرسکتی۔

اشپنگلر اس روایتی نظریہ کا مخالف ہے کہ "تاریخ کا ایک سلسلہ ہے" اور ایک تہذیب اپنا ورثہ دوسری تہذیب میں منتقل کردیتی ہے اس طرح انسانی تہذیب کے خزانے میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ نظریہ سطحیت پر مبنی کیونکہ ایک تہذیب کا دوسری تہذیب پر اثر بڑا سطحی و ظاہری ہوتا ہے کیونکہ کوئی تہذیب اپنی روح کو دوسری تہذیب کے قالب میں منتقل نہیں کرسکتی ہے۔ اس کی روح بھی اس کے ساتھ ہی مرجاتی ہے۔ یورپ میں تحریک نشاۃ ثانیہ کو یونانی و رومی تہذیبوں کا احیاء سمجھا جاتا ہے جو غلط ہے۔ مغربی تہذیب نے اس کے ظاہری اور معمولی مشابہت اختیار کی۔ ہر تہذیب کی اپنی علیحدہ روح ہے۔ اسی لیے مغربی تہذیب میں نہ توڈروک طرز کے مندر نظر آتے ہیں اور نہ ایونک طرز کے ستون اور نہ ہی مصوری موسیقی اور ڈرامہ میں یونان و روم کی روح نظر آتی ہے۔

چونکہ ہر تہذیب جداگانہ ماحول میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا ارتقاء و ترقی بھی جداگانہ ماحول میں ہوتی ہے اس لیے ہر تہذیب اپنی علیحدہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً" یونانی و رومی تہذیبوں میں علم ہندسہ اور شماریات' عربی تہذیب میں الجبراء' علم نجوم اور کیمیا اور مغربی تہذیب میں علم الاحصاء (CALCALUS) اور گلیلیو کا قوت محرکہ کا نظریہ یا یونانی تہذیب میں برہنہ مجسّمے' عربی تہذیب میں نقش و نگار اور بیل بوٹے اور مغربی تہذیب میں ریمبراں کی تصویروں میں دھوپ و چھاؤں کا تصور اور باخ کی موسیقی۔

اشپنگلر نے تہذیبوں کی زندگی اور موت (MORPHOLOGY OF CULTURE) کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہر تہذیب پیدائش' ارتقاء اور شباب کے بعد زوال پذیر ہوتی ہے۔ ہر تہذیب کا انجام ایک ہی ہوتا ہے ہر تہذیب تقریباً" ایک ہزار سال کی مدت میں ان مقررہ درجوں سے گزرتی ہے ہوئی فنا ہوجاتی ہے۔ یہ تہذیبوں کے عمل اور اختیار سے باہر ہے کہ وہ فنا سے بچ سکیں۔ تقدیر کی زنجیریں اس قدر وزنی اور مضبوط ہیں کہ ان کو توڑنا اور ان سے آزاد ہونا ممکن نہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ اشپنگلر کے ہاں جب تمدن کا لفظ آتا ہے تو اس کی مراد تہذیب کا آخری دور ہوتا ہے اس نے تہذیبوں کے مطالعہ کے بعد ان کی پیدائش' ارتقاء' شباب اور موت کے مندرجہ ذیل درجہ متعین کیے ہیں۔

1- تہذیب کا ابتدائی زمانہ۔

یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں تہذیب کوئی خاص شکل اختیار نہیں کرتی' اس زمانہ میں معاشرے کے افراد سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں' محبت کرتے ہیں' کام کرتے ہیں۔ اور مرجاتے ہیں۔ اس زمانہ میں معاشرہ منظم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس دور میں مذہب' آرٹ اور سائنس کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس لیے معاشرے کا یہ دور "تاریخ گمنامی" کا شکار ہوجاتا ہے لیکن یہ معاشرہ تہذیب کی پیدائش کے لیے مواد فراہم کرتا ہے۔ مغربی تہذیب میں یہ ابتدائی زمانہ میروونجین (MEROVINGION) اور کارولنجین (CAROLIGION) کا زمانہ ہے جس کی مدت 900 سے لے کر 500 ق م تک ہے۔

تہذیب اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرے میں آرٹ' سائنس اور مذہب کی تشکیل سادہ انداز میں ہوتی ہے۔ یونان میں اس دور میں ڈورک طرز کے مندر بنے اور مغربی تہذیب میں گوتھک طرز تعمیر اختیار کیا گیا۔ اسی زمانہ دیومالائی اور مذہبی عقائد پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ہندوستان میں وید' یونان میں ہومر کے دیوتا اور مغربی تہذیب میں قرون وسطیٰ کے جرمن اساطیر' اس لحاظ سے مغربی تہذیب کی پیدائش کا زمانہ 900 قرار دیا جاسکتا ہے۔

2- موسم بہار

تہذیب کے اس دور کو اشپنگلر موسم بہار سے تشبیہ دیتا ہے اس دور کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔ اس دور میں جاگیرداری نظام ایک سیاسی طاقت اور نظام بن کر ابھرتا ہے۔ زمین پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتی ہے' اسی لیے زمین کے ذریعہ قوت و طاقت حاصل کی جاتی ہے۔ جو زمین پر قابض ہوتے ہیں وہ ذرائع پیداوار کے مالک ہوتے ہیں اور اس حیثیت سے وہ حکمران کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ روحانی اعتبار سے یہ زمانہ بہادری' مذہبی عقائد کی پختگی اور تصوریت (Idealism) کا ہوتا ہے اس دور کی معیشت زراعت پر ہوتی ہے اس دور کے خاتمہ کی ابتداء جب ہوتی ہے کسان اور جاگیردار کا تصادم شروع ہوجکاتا ہے۔ اس تصادم سے یہ نظام ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد سے

امراء کا اقتدار بڑھتا ہے۔ شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اس مرحلہ پر اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ مغربی تہذیب میں یہ زمانہ 900ء سے 1500ء تک کا ہے۔

3- موسم گرما

اس کے بعد تہذیب موسم گرما کے دور میں داخل ہوتی ہے یہ دور خاص طور سے شہروں کی تعمیر اور ان کی ترقی کی وجہ سے اہم ہوتا ہے۔ یونانی تہذیب میں یہ دور شہری ریاستوں کے عروج کا تھا۔ اس کا خاتمہ پر ـکلس کے سنہری دور پر ہوا۔ رومی تہذیب میں اس دور میں اٹرسکن بادشاہوں کی جگہ رومی امراء نے لے لی اور بالاخر امراء اور عوام کے تصادم کے بعد اس کا خاتمہ ہوا۔ مغربی تہذیب میں یہ زمانہ بے ڈھنگے طرز تعمیرو آرائش کا ہے۔ (Baroque) جو فرانسیسی انقلاب پر ختم ہوتا ہے۔

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت شہروں کی آبادی اور ان کی ترقی ہے اس لیے اشپینگلر دنیا کی تاریخ کو شہروں کی تاریخ کہتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کی تمام بڑی تہذ یبیں ہیں۔ اس دور کا ہر آدمی شہر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں آکر "دنیا کی تاریخ اور انسانی تاریخ" میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ شہر کے آدمی کی تاریخ ہے سیاست' مذہب' فن آرٹ' سائنس یہ تمام علوم شہر کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں۔ لیکن اس عمل میں سب سے بڑا معجزہ ایک شہر کی روح کی پیدائش ہے ایک شہر اور گاؤں میں جو چیز تفریق کرتی ہے۔ وہ چھوٹائی اور بڑائی نہیں بلکہ روح کی موجودگی ہے۔ شہر قائم ہونے کے بعد بورژواطبقہ سیاسی و معاشی اور رومانی طور پر آہستہ آہستہ جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کو بے دخل کردیتا ہے۔ معاشی طور پر شہری معیشت میں پیسہ طاقت بن جاتا ہے۔ زمین کی قدر و قیمت ختم ہوجاتی ہے۔ شہر گاؤں پر فتح یاب ہوجاتا ہے۔ اور پیسہ زمین پر فوقیت حاصل کرلیتا ہے۔ ہر تہذیب اپنے موسم گرما میں اپنے مذہبی عقائد کو بناتی و سنوارتی ہے۔ اسی زمانہ میں فلسفیانہ خیالات پیدا ہوتے ہیں اس لحاظ سے یہ دور فن اور سائنس کے عروج کا دور ہوتا ہے۔ اسی زمانہ میں ذہین اور باصلاحیت افراد پیدا ہوتے ہیں جیسے ہندوستان میں برہمن یونان میں سوفسطائی اور یورپ میں سنوارنا رولا "لوتھر اور کالون" فلسفہ میں اس کی مثال ہندوستان میں اپنشد' یونان میں سقراط سے پہلے کا زمانہ اور یورپ میں بیکن' ڈیکارٹ اور گلیلیو اس دور میں فن' مذہب' فلسفہ اور سائنس ذہن اور شعور کی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے۔ جو کھیت میں کام کرنے والے کسان کی فہم سے بالاتر ہوتی ہے۔

-4 ہر تہذیب کی اپنی خزاں ہوتی ہے۔ اس دور میں تہذیب عقائد سے نکل کر عقل کے دائرے میں آتی ہے۔ اسی زمانہ میں فلسفہ کا نظام مکمل ہوتا ہے جیسے ہندوستان میں یوگا اور ویدانت' یونان میں افلاطون اور ارسطو' اسلام میں ابن رشد اور ابن سینا اور مغرب میں کانٹ اور ہیگل۔

-5 تہذیب جب اپنے موسم سرما میں داخل ہوتی ہے تو اس وقت اس میں مادی نظریات فروغ پاتے ہیں۔ اس دور میں ہر چیز کو افادیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسے یونان میں رواقی و ایپی کیورین فلسفی' فلسفہ کلبیہ کے پیرو اور مغرب میں بنتھیم کامے اور کارل مارکس۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر تہذیب دیومالائی تصورات سے باقاعدہ مذہبی عقائد تک پہلے درجہ میں ابتدائی فلسفہ سے رواداری' آزاد خیالی اور مکمل فلسفیانہ نظام تک دوسرے درجہ میں' مکمل فلسفیانہ نظام سے مادیت و سائنس تک تیسرے درجہ میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس کے بعد تہذیب اپنی زندگی کے آخری دور میں جو زوال' فنا اور موت کا ہے' داخل ہوتی ہے یہ آخری دور دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ پہلا "لڑائی اور اختلاقی زمانہ" کا ہوتا ہے یہ زمانہ دو صدیوں تک چلتا ہے اس کا خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک طاقت فتح یاب ہوجاتی ہے اور فتح کے بعد اپنا اقتدار اس علاقہ میں قائم کرلیتی ہے جو تہذیب کی عملداری میں ہوتا ہے۔ اس وقت "شہنشاہی ریاست" پیدا ہوتی ہے۔ اس کے پیدا ہوتے ہی تہذیب زندگی کی آخری منزل میں قدم رکھتی ہے۔ اس دور میں تمام مذہب دنیا بالواسطہ یا بلا واسطہ قانونی یا غیر قانونی طور پر ایک شخصیت کے قبضہ میں ہوتی ہے۔ چاہے اس کا خطاب سیزر ہو یا شہنشاہ' وہ علاقے کو جو شہنشاہیت کے دائرے میں ہوتے ہیں وہاں امن وامان ہوتا ہے چونکہ شہنشاہ کی شخصیت طاقتور اور تمام اختیار کی مالک ہوتی ہے اس لیے اسے حاصل کرنے کی محلاتی کوششیں کی جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ نجی جنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ قومی جنگوں کا نہیں بلکہ نجی جنگوں کا ہوتا ہے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طاقت ور افراد' فوجی راہنما اور آمر اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں ان کی طاقت اس وقت مضبوط ہوجاتی ہے جب "عالمی امن" کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت قوموں میں طاقت و قوت کی خواہش ختم ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ افراد کی ذاتی خواہشات لے لیتی ہیں۔ عالمی امن کے زیر سایہ ایک طاقتور فرد اپنے فوجی ساتھیوں کی مدد سے لوگوں پر حکومت

کرتا ہے۔

تہذیب کے آخری دور میں "عالمی شہر" وجود میں آتے ہیں جو انسانیت سوز تباہ کن اور تمدن کے المیہ کی نشانی بن جاتے ہیں۔ شہر وہ مرکز ہوتا ہے جہاں دنیا کی تاریخ اپنی تمام قوتیں جمع کرکے ختم ہوجاتی ہے۔ ہر تمدن میں یہ عالمی شہر اور عظیم مرکز پورے ملک کی تہذیب کو نچوڑ لیتا ہے یہاں کوئی امیر و بورژوا' آزاد و غلام' مہذب و غیر مہذب اور مومن و مشرک نہیں ہوتا بلکہ تمام شہری "ہردیسی" (Cosmopolitan) ہوتے ہیں۔ ان میں اور صوبائی باشندوں میں فرق اور بعد بڑھ جاتا ہے۔ اور یہ فخر سے خود کو ہردیسی اور انہیں حقارت سے صوبائی کے نام سے پکارتے ہیں۔

اشپینگلر نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تک "چولہا" سیدھی سادی زندگی اور خاندان کا مرکز رہتا ہے۔ اور انسانی ذہن اس سے متعلق رہتا ہے اس وقت تک زندگی میں سکون و اطمینان اور قرار ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ طریقہ زندگی تبدیل ہوتا ہے تو کسان اور کاشتکار جو آرام کی زندگی گزارتے تھے شہروں میں مکانوں کے وسیع سمندر میں آوارہ و سرگرداں پناہ کی تلاش میں پھرتے ہیں۔ جیسے تہذیب کے ابتدائی دور میں شکاری خوراک کی تلاش میں پھرتے تھے۔ یہ آوارہ گرد افراد "ذی ہوش خانہ بدوش" کی شکل اختیار کرلیتے ہیں اشپینگلر لکھتا ہے کہ:

> بڑے شہروں نے قصبوں اور گاؤں کے بہترین خون کو چوس لیا ہے اس کے باوجود اس کی پیاس برابر بڑھ رہی ہے اور یہ برابر تازہ شگفتہ اور سادہ انسان کے سمندر کو ہڑپ کررہے ہیں۔ تاریخ کے آخری شاندار دور میں جب شہر کی خوبصورت اور گناہ آلود زندگی اپنے شکار کو پکڑ لیتی ہے تو پھر اسے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ قدیم زمانے میں لوگ اپنے آپ کو زمین سے آزاد کرلیتے تھے اور آزادانہ گھومتے تھے لیکن یہ ذی ہوش خانہ بدوش شہر کی زنجیروں میں جکڑے مجبور ہیں ان کے دل میں اس مجبوری کے باوجود شہر کی محبت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر ہر بڑا شہر اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اس کا گھر بن جاتا ہے لیکن قریبی گاؤں کی زندگی اس کے لیے اجنبی ہوجاتی ہے۔ وہ شہر کے فٹ پاتھ پر دم توڑ دیتا ہے۔ لیکن اپنی زمین پر واپس نہیں جاتا۔

عالمی شہروں کی ترقی کے ساتھ ساتھ آبادی میں کمی واقع ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ یہ

عمل صدیوں جاری رہنے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ یہ تمدن کے سفر کی آخری آرام گاہ ہوتی ہے کیونکہ آدمی بحیثیت نسل انسان کے زندہ رہنا نہیں چاہتا اس کے لیے زندگی ایک سوال بن جاتی ہے۔ جب پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں میں یہ بحث ہو کہ بچوں کے ہونے سے کیا نقصان اور فوائد ہیں تو اس وقت تاریخ ایک انقلابی صدمے سے دوچار ہوتی ہے جب زندگی کے متعلق دلائل دیئے جائیں تو اس وقت زندگی بذات خود سوال بن جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر احتیاطاً" پیدائش کی رفتار روک دی جاتی ہے۔ یونانی تہذیب پر جب یہ وقت آیا تو پولی بیس (Poly-bius) نے اس پر اظہار افسوس کیا اور اسے یونان کی تباہی قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عالمی شہر آہستہ آہستہ گھٹنا شروع ہوجاتے ہیں اور آخر میں چند لوگوں کی آبادی ان کھنڈرات میں قدیم طرز زندگی گزارنے لگتی ہے۔ جب ہیون سانگ نے اشوک کا پاٹلی پتر دیکھا تو وہ غیر آباد اور اجاڑ مکانوں پر مشتمل تھا۔ پولی بیس نے جب یونان کے مشہور شہروں کی تاریخ لکھی تو اس وقت ان کی پر رونق گلیاں غیر آباد ہوچکی تھیں۔ محلات کی دیواریں گر رہی تھیں۔ مشہور امفی تھیٹر میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ جہاں مویشی چرتے پھرتے تھے۔ مجسموں پر کائی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اور جگہ جگہ خود رو جھاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔

شہروں کی آبادی کے ساتھ ساتھ پیسہ کی قدروقیمت بڑھ جاتی ہے ابتداء میں پیسہ کا کام صرف یہ تھا کہ چیزوں کی قیمت کا تعین کرے۔ زمین' جانور' مکانات اور غلام حقیقی قیمت تھے' لیکن شہروں کے وجود میں آنے کے بعد اور معاشی نظام میں تبدیلی کے بعد' پیسہ بذات خود قیمت بن جاتا ہے اس کی قدروقیمت ان چیزوں سے بڑھ جاتی ہے جن کی قیمت مقرر کرنے کے لیے اسے ایجاد کیا گیا تھا۔ تمدن کے آخری دور میں تخلیقی روح ختم ہوجاتی ہے۔ فن' مذہب اور سیاست میں کوئی تخلیق نہیں ہوتی۔ زندگی صرف مادی اور تجارتی مقاصد کے لیے وقف ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہی کچھ مغربی تہذیب میں ہورہا ہے۔ اشپنگلر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اب ہم جب نمائشوں میں موسیقی کے میلوں میں اور تھیٹروں میں جاتے ہیں تو وہاں مسخروں' شور مچانے والوں اور بے وقوفوں کو اچھل کود کرتے پاتے ہیں۔ ان کا یہ فن مارکیٹ کی خاطر ہوتا ہے۔ وہ صرف ایسی چیز پیش کرتے ہیں جو عوام کو خوش کریں۔ آرٹ موسیقی اور ڈرامہ کی اقدار دم توڑ چکی ہیں۔"

تمدن کے آخری دور میں دوبارہ مذہبی جنون پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی شکل موسم

بہار کے مذہب سے جدا ہوتی ہے۔ موسم بہار میں مذہب اپنی پوری قوت و طاقت سے ابھرتا ہے۔ لیکن آگے چل کر جب وہ اپنی اصلی ہیئت کو برقرار نہیں رکھ سکتا تو اس وقت مذہبی اصلاح کی تحریک شروع ہوتی ہے اور خالص مذہبیت کا زمانہ آتا ہے۔ جو مذہبی "مجنوں" پیدا کرتا ہے۔ یہ مذہب کو اور مذہبی تقدس کو طاقت کے ذریعہ نافذ کرتے ہیں۔ "پیورٹن ازم" کے بعد عقلیت کا زمانہ آتا ہے اور عقلیت کے بعد مادیت پروان چڑھتی ہے تہذیب مذہب کی تخلیقی قوتوں سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی پرورش دیہات کی فضا میں ہوتی ہے۔ شہروں میں آرٹ و فن میں پختگی آتی ہے۔ آخر تہذیب عالمی شہر میں مادیت کی آغوش میں دم توڑ دیتی ہے۔

عقلیت و ذہنی شعور کے خلاف غیر فطری اور مجہولانہ فرقے پیدا ہونا شروع ہوجاتے ہیں جیسے اسکندریہ میں سیراپس (Serapis) کا فرقہ' روم میں آئی سس (Isis) کا فرقہ اور مغربی تہذیب "ازم" اسی کی ایک شکل ہے۔ یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ دوسرا مذہبی دور شروع ہونے والا ہے اس کی ابتداء اعلیٰ طبقہ سے نہیں ادنیٰ طبقہ سے ہوگی۔ مغربی تہذیب اس وقت اس عمل سے دوچار ہے جب یہ عمل پورا ہوجائے گا تو یورپ میں گوتھک عیسائیت دوبارہ واپس آجائے گی۔

اشپنگلر اس درجہ پر تہذیب کو موت سے ہمکنار کردیتا ہے۔ اس کے نزدیک تمدن فنا ہو کر روپوش ہوجاتا ہے لیکن معاشرہ اس وقت بھی برقرار رہتا ہے۔ آدمی کی مثال ایک درخت کی ہوجاتی ہے جو زمین میں مضبوط قدم جمائے زندگی کو برقرار رکھتا ہے لیکن اس میں احساس جذبہ اور جوش ختم ہوجاتا ہے۔ گاؤں دوبارہ سے پیدا ہوتے ہیں کسان پھر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے قدیم عالمی شہروں کی ویران زمین میں بیج ڈالے جاتے ہیں اور اس خاکستر سے پیدا ہونے والا معاشرہ "تاریخی گمنامی" میں اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے اس دور میں آدمی مشکل سے گزر اوقات کرتا ہے۔ زندگی کی اس اذیت اور کرب میں وہ دوبارہ مذہبی زندگی اختیار کرلیتا ہے جو اسے مصیبتوں' تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت کرنے کی تلقین کرتی ہے یہ ایک بے مقصد ڈرامہ ہے۔ بے مقصد ستاروں کی رفتار' زمین کی گردش' سمندروں کا اتار چڑھاؤ اور جنگلوں کا پھیلاؤ ایک مہمل ڈرامہ جو اس دنیا میں کھیلا جارہا ہے۔ چاہیں تو ہم اس کی توصیف کریں یا اس پر نوحہ کناں ہوں لیکن یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

اشپنگلر نے مغربی تہذیب کے ارتقاء کے جو درجہ متعین کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ مغربی تہذیب کی ابتدا صلیبی جنگوں سے ہوئی اس کا موسم بہار از منہ وسطی میں ختم ہوگیا۔ جبکہ نظام جاگیرداری قائم تھا' نائٹوں کی بہادری اور شجاعت کی روایات تھیں اور تصوف و فلسفہ کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کا موسم گرما تحریک نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوا۔ جس میں قومی ریاستیں قائم ہوئیں شہروں کی آبادی بڑھی' سرمایہ داری نظام نے جڑیں پکڑی' ریاضی فلسفہ اور اطالوی مصوروں نے ترقی کی اس کی خزاں اٹھارویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ جب موزارٹ گوئٹے اور کانٹ نے اس تہذیب کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کمال تک پہنچایا۔ انیسویں صدی اس کے زوال کی ابتداء ہے جس میں مادیت پرستی کے نقیب کامے' ڈاروِن اور کارل مارکس پیدا ہوئے۔ انارکسٹ و سوشلسٹ تحریکیں ابھریں۔ منطق دانوں' ثبوتیت پسندوں اور ماہر نفسیات کی مقبولیت بڑھی' فن تعمیر آرٹ اور فن میں سطحیت نمایاں ہونا شروع ہوئی۔ اشپنگلر اس آخری لحہ میں مغربی تمدن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

> "ہمیں تقدیر نے اس تمدن میں پیدا کردیا ہے۔ اس وقت جب کہ یہ آخری اور فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہورہا ہے۔ اس وقت جبکہ دولت اپنی فتح کے آخری جشن منا رہی ہے۔ اس وقت جبکہ سیزرازم خاموش اور مضبوط قدموں سے کامیابی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ہم اپنی آزادی اور خود مختاری کھو رہے ہیں تاریخ' جو فیصلہ دے چکی ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔"

تہذیبوں کے مطالعہ سے اشپنگلر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہر تہذیب جدا اور منفرد ہوتی ہے۔ اس کی علیحدہ روح اور ہیئت ہوتی ہے اس لیے کوئی ایسی تہذیب نہیں جو آفاقی اور ابدی اقدار پر مبنی ہو۔

اشپنگلر کے نزدیک ہر ترقی یافتہ زمانے میں معاشرہ غیر جمہوری رہا ہے ہر تہذیب کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے معاشرے میں جہاں جمہوریت' آمریت' بادشاہت یا پارلیمانی نظام ہو' اس کے پردے میں اقلیت حکومت کرتی ہے اس لیے معاشرہ ہمیشہ حاکم و محکوم میں بٹا رہتا ہے۔ جمہوریت ہر تہذیب کی زندگی کا ایک گزرتا ہوا لحہ ہے۔ اس میں بورژوا طبقہ اپنی دولت اور ذہانت سے اقتدار حاصل کرکے' بے حس اور خاموش عوام پر حکومت کرتا ہے۔

اشپنگلر تاریخ میں باعمل شخصیتوں کو مفکرین پر ترجیح دیتا ہے۔ سکندر' سیزر اور نپولین

نے تاریخ میں جو انقلابی تبدیلیاں کیں اور اپنی قوت و طاقت سے جو سیاسی' سماجی اور معاشی تبدیلیاں لائے اس کے مقابلہ میں ارسطو یا افلاطون کچھ نہیں۔

اشپنگلر سیاست کو اخلاق سے بالاتر سمجھتا ہے۔ سیاست حق و باطل کے تصور سے آزاد ہے۔ سیاست داں جن عقائد کو اپنی نجی زندگی میں عزیز رکھتا ہے عملی دنیا میں وہ ان پر کار بند نہیں ہوتا۔

دنیا کی تاریخ کی مثال ایک عالمی عدالت کی سی ہے۔ اس کا فیصلہ ہے کہ ایک اچھی اور خوشگوار زندگی ہمیشہ طاقت ور کو میسر آتی ہے۔ یہاں حق و انصاف طاقت پر قربان کردیئے جاتے ہیں۔ موت ان کے حق میں اپنا فیصلہ دیتی ہے۔ جو حق کو عمل سے زیادہ اور انصاف کو طاقت سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

لہٰذا اشپنگلر تاریخ اقوام عالم میں کسی آفاقی' ابدی اور کلی اقدار کا قائل نہیں۔

کولنگ وڈ

رابن جارج کولنگ وڈ 1889 میں پیدا ہوا۔ زندگی کا بیشتر حصہ آکسفورڈ میں گزرا۔ جہاں وہ فلسفہ کی درس و تدریس میں معروف رہا۔ کولنگ وڈ کی مشہور کتاب "تاریخ کا تصور" (IDEA OF HISTORY) اس کی وفات کے بعد 1946ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد کولنگ وڈ بحیثیت فلسفی کے جس نے تاریخ کے نظریات پر جدید انداز سے نظر ڈالی۔ بہت مشہور ہوا۔

تاریخی واقعات کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنا ان کے اسباب و علل اور پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ان کی تاویل میں پیش کرنا "فلسفہ تاریخ" کہلاتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کی اصطلاح سب سے پہلے والیٹر نے استعمال کی تھی اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ آزاد ذہن اور کھلے دماغ کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور پھر واقعات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اس کے بعد ہیگل نے اس اصطلاح کو دوسرے وسیع معنوں میں استعمال کیا اس کے نزدیک فلسفہ تاریخ کو ایک مربوط اور جامع نظام بنا کر اس کے ذریعہ آفاقی اصول دریافت کئے جن کی روشنی میں انہوں نے اقوام اور تہذیبوں کی تاریخ کو بیان کیا اور اقوام عالم اور تمدنوں کے عروج و زوال کو ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا۔

کولنگ وڈ ان سے علیحدہ اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فلسفیانہ ذہن کبھی بھی کسی شے (OBJECT) کے بارے میں نہیں سوچتا' بلکہ جب وہ کسی شے کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اس شے کے بارے میں اپنے خیال پر بھی غور کرتا ہے اس غور و فکر کو فلسفہ یا سوچ کا دوسرا درجہ کہا جا سکتا ہے یعنی ایک خیال پر خیال' جب کہ فلسفہ کے برعکس نفسیات فکر کا پہلا درجہ ہے۔ وہ ذہن کو اسی طرح سمجھتی اور پرکھتی ہے۔ جس طرح حیاتیات زندگی کو وہ کسی خیال اور شے میں کوئی رشتہ اور تعلق قائم نہیں کرتی بلکہ وہ خیال کو شے سے علیحدہ تصور کرتی ہے جب کہ فلسفہ' خیال یا سوچ کو اس کی انفرادی حالت میں نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ اس شے سے تعلق کو بھی دیکھتا ہے۔

اس کے بعد کولنگ وڈ فلسفہ میں تبدیلی پر بحث کرتے ہوئے اس کی تاریخ بتاتا ہے کہ

مغربی فلسفہ کی ابتدا یونان سے ہوئی' جہاں غور و فکر کی ابتدا ریاضی کے علم سے ہوئی۔ علم ریاضی یونان میں فلسفہ کا مرکز رہا۔ لیکن قرون وسطیٰ میں فلسفہ علم ریاضی سے علم الہیات کی طرف منتقل ہوگیا اور غوروفکر کا محور "انسان اور خدا" کے تعلقات پر رہا۔ سولھویں صدی سے انیسویں صدی تک' نیچر سائنس کے وجود میں آنے کے بعد وہ فلسفہ کا محور بن گئی لیکن اس تمام عرصہ میں انسان تاریخی نقطہ نظر سے بھی سوچتا رہا۔ اٹھارویں صدی میں اس تاریخی نقطہ نظر میں اہمیت پیدا ہوئی کیونکہ ریاضی' الہیات اور نیچرل سائنس انسان کے تمام مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ خصوصیات کے ساتھ ماضی کے وہ واقعات جو ایک خاص جگہ اور وقت میں وقوع پذیر ہوئے ان واقعات کو ریاضی کی مدد سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ کیونکہ ریاضی کی فکر اسی شے کو سمجھ سکتی ہے جس کا زمان و مکاں میں وجود نہ ہو۔ اسی طرح علم الہیات کا دائرہ بھی تنگ ہوجاتا ہے کیونکہ وہ ایک لامحدود موضوع پر غور کرتی ہے۔ جب کہ تاریخی واقعات محدود ہیں۔ اور نہ ہی سائنس ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے کیونکہ سائنس جس حقیقت کو دریافت کرتی ہے اسے وہ مشاہدات اور تجربہ کے ذریعہ جانتی ہے۔ جبکہ ماضی ایک روپوش اور دھندلی شے ہے' جسے ہم مشاہدات و تجربات کے ذریعہ ثابت نہیں کرسکتے۔ جیسے ہم سائنس کے مفروضات کو ثابت کرتے ہیں۔ اسی لیے تاریخ کے واقعات اور ماضی میں ہونے والے حادثات کو صرف فلسفہ تاریخ کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخ کیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے کولنگ وڈ کہتا ہے کہ علم الہیات اور نیچرل سائنس کی طرح تاریخ بھی فکر کا ایک نظام ہے اور اس نظام کو سمجھنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاریخ کے اس مطالعہ کی ابتداء طالب علم ٹیکسٹ کی کتابوں سے کرتا ہے یہ کتابیں اسے احساس دلاتی ہیں کہ اس نے جو کچھ بھی پڑھا ہے وہ صحیح اور قطعی ہے۔ کیونکہ کورس کی کتابوں اور اساتذہ کی پڑھائی سے یہی ثابت ہوتا ہے اس طرح اس کے ذہن میں قطعیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ خود کو ان حالات سے نکال کر مضمون کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتا ہے تو اس وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ کسی شے میں قطعیت نہیں اور نہ ہی کسی مضمون اور علم کو بالکل صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس احساس سے اس کے منجمد ذہن میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ گھٹن و تاریکی سے نکل کر آزادی اور روشن خیالی میں سانس لیتا ہے اور پھر تاریخی واقعات کو اپنے خیالات کی روشنی میں

نہیں پڑھتا تو اس کا ذہن اسی طرح جامد و ساکت رہتا ہے۔

کولنگ وڈ تاریخ کو تحقیق کی ایک قسم بتاتا ہے اور اسے سائنس کا درجہ دیتا ہے کیونکہ سائنس بھی ایک نظام فکر ہے۔ جو ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ سائنس ان واقعات کو جو پہلے سے وقوع پذیر ہوچکے ہیں انہیں جمع کرکے ان پر غور کرتی' بلکہ ان اشیاء کی ماہیت اور ہیئت کو دریافت کرتی ہے۔ جنہیں ہم نہیں جانتے۔ اس لیے سائنس "ناواقفیت" سے شروع ہوتی ہے اور پھر چیزوں کی حقیقت کو دریافت کرتی ہے اس لحاظ سے تاریخ بھی اس زمرے میں آتی ہے کیونکہ تاریخ ماضی میں انسانی عمل سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے اور اس انسانی عمل کو تلاش کرتی ہے۔ جو انسان نے ماضی میں کیا تھا۔

تاریخ کی افادیت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ کس کام کے لیے استعمال ہوتی ہے؟ اس کا جواب کولنگ وڈ اس طرح سے دیتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کو پہچاننے کے لیے ہے کیونکہ انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خود کو سمجھے' خود کو سمجھنے سے مراد ہے کہ انسانی ذہن اور فطرت کو سمجھے اور یہ سمجھے کہ انسان بذات خود کیا ہے اور ہم کسی قسم کے انسان ہیں۔ اور دوسروں سے ہم کس طرح مختلف ہیں۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ "ہم کیا کرسکتے ہیں" اس سے ہم جبھی واقف ہوسکتے ہیں کہ جب ہم کچھ کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہم تاریخ سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ جب ہم کچھ کرنے کی کوشش کریں اس طرح ہم تاریخ سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ ماضی میں انسان نے جو کچھ کیا ہے وہ ہم اب بھی کرسکتے ہیں۔ لہٰذا تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان نے اب تک کیا کیا ہے۔ اور خود انسان کیا ہے؟

اس لیے تاریخ ایک سائنس ہے جو سوالات کا جواب دیتی ہے۔ اس کا تعلق ماضی میں انسان کے عمل سے ہے۔ یہ ماضی کے واقعات کی تاویل کرتی ہے اور اس سے انسان اور اس کی ذہنیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخ کی ابتدا کس طرح سے ہوئی؟ اسے ایک علم کا درجہ کس طرح دیا گیا؟ اور کس طرح انسانی ذہن تاریخ کے احساس و شعور سے دوچار ہوا؟ اس کی تشریح کرتے ہوئے کولنگ وڈ کہتا ہے کہ مشرق میں تاریخ کی ابتدا مذہبی قصے' کہانیوں اور دیومالائی تصورات سے شروع ہوئی جسے ہم الہیاتی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ انسانی عمل کی تاریخ نہیں' کیونکہ

الہیاتی اور مذہبی تاریخ میں انسان اور اس کے عمل کو دخل نہیں' اس کی حیثیت ایک آلہ کار کی سی ہے۔ دیومالائی قصوں میں انسانی عمل سرے سے مفقود ہے۔ اس میں صرف دیوی دیوتاؤں کے قصے ہیں یہ قصے کسی تاریخ بنیاد پر نہیں تخلیق ہوتے بلکہ ان کے بارے میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ماضی میں ایسا ہوا ہوگا۔ ان کا دائرہ عمل گمنام ماضی میں اور لامحدود زماں و مکاں میں سرگرم نظر آتا ہے جس کے بارے میں کوئی قطعی اور حتمی طور پر نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا تھا؟ درحقیقت یونانیوں نے سب سے پہلے تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے دیکھا اور سمجھا اور انہوں نے تاریخ اور انسانی عمل کو آپس میں مربوط اور ہم آہنگ کیا۔ اس لیے یونان کی تاریخ دیومالائی قصوں اور کہانیوں پر مشتمل نہیں بلکہ یہ تحقیق ہے اور ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ یہ مذہبی نہیں اور انسان کی سرگرمیوں اور عمل کی تاریخ ہے۔ اس میں وہ واقعات نہیں جو گمنام ماضی اور لامحدود زماں و مکاں میں بغیر نام و نشان کے ہوئے ہوں گے بلکہ وہ واقعات ہیں جو ماضی میں ایک خاص اور قطعی وقت پر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

یونانیوں کے ذہن میں تاریخ کا احساس' ماحول کی وجہ سے ہوا' جس میں تیزی سے تغیر و تبدل ہو رہا تھا۔ زلزلے' سیلاب اور دوسری فطری آفات زمین کے چہرے اور خدوخال کو بدل رہی تھیں۔ ان کے سامنے فطرت ایک مستقل سفر کے عمل میں تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس تبدیلی کو انسانی زندگی میں بھی رواں دواں دیکھا۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ' سکون اور جمود نہیں۔ اس میں کوئی قطعیت نہیں۔ بلکہ زندگی برابر نشیب و فراز مدوجزر کی شکل میں سرگرم رہتی ہے اور پھر یہ تبدیلی بھی شدید اور متضاد ہوتی ہے۔ چھوٹے سے بڑا' فخر سے ذلت اور خوشی سے محرومی' یہی پلاٹ ان کے ڈراموں کی جان ہوا اور اسی پلاٹ کو انہوں نے تاریخ میں بیان کیا۔ یونانی اس لیے علم تاریخ کو ضروری سمجھتے تھے کہ اس سے تبدیلی کا شعور پیدا ہوتا ہے اور یہ تبدیلی اپنے آپ کو دہراتی بھی رہتی ہے ایک جیسے حالات میں ایک جیسے نتائج پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لیے اہم واقعات کو یاد رکھنا چاہئے تاکہ ان کی روشنی میں حال کو سمجھا جاسکے اور خطرات سے محفوظ رہا جاسکے۔ اس طرح انسان اپنی تقدیر کا مالک ہو سکتا ہے۔

یونانیوں کے بعد کولنگ وڈ نے رومیوں کے نظریہ تاریخ پر بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ ایک سلسلہ ہے۔ اس لیے ماضی کے ورثہ کی حفاظت کی جائے اس نظریہ کے

تحت رومیوں نے قدیم روایات اور اشیاء کی حفاظت کی۔ دنیا نے پہلی بار رومیوں سے عالمی تاریخ یا قومی تاریخ کا تصور لیا۔ جس میں تاریخ کے اس عظیم سلسلہ کے ہیرو عوام اور ان جذبہ ہے۔ مشہور رومی مورخ پولی بس کے نزدیک "ہم تاریخ کے مطالعہ کے بعد ان غلطیوں سے نہیں بچ سکتے جو ہم سے پہلے انسان کر چکا ہے۔ لیکن ہم ان تمام مصیبتوں' تکلیفوں اور دکھوں کو بہادری سے برداشت کرنے کا سبق حاصل کرسکتے ہیں"

یونانی اور رومی نظریہ تاریخ کی خصوصیات یہ ہیں' تاریخ انسان سے متعلق ہے اس میں انسان کا عمل اس کا مقصد اس کی کامیابی و ناکامی کا بیان ہے اگرچہ اس میں دیوتاؤں کا بھی اثر ہے لیکن ان کا دائرہ عمل محدود ہے' وہ انسانی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ اس میں انسان اپنی مرضی و خواہش سے اپنے انجام تک پہنچتا ہے۔

تاریخ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ صرف انسان کی خواہش (Will) کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ انسان کا کردار اس کے عمل اور تجربہ کی روشنی میں تشکیل پاتا ہے۔ اور اس کے عمل کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس کا کردار بھی بدلتا رہتا ہے۔ انسان یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کررہا ہے؟ یہاں تک کہ وہ کام کرچکتا ہے۔ انسان کے عمل اس احساس سے نہیں کئے جاتے کہ وہ اسے کہاں لے جائیں گے بلکہ وہ اس خواہش کے تحت ہوتے ہیں کہ ان کے کیا نتائج نکلیں گے۔

یونانیوں اور رومیوں کے بعد کولنگ وڈ عیسائیت کے نظریہ تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے جس میں انسانی عمل ناواقفیت کے اندھیرے میں ہوتا ہے۔ اس میں انسانی عمل کسی سوچ سمجھے منصوبے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ یہ اچانک اور شدید خواہش کے زیر اثر ہوتا ہے۔ یہی عیسائیت میں "بنیادی گناہ" کا تصور ہے کہ انسان گناہ کو نہ تو جان بوجھ کر کرتا ہے اور نہ ہی اسے پسند کرتا ہے بلکہ یہ انسانی فطرت میں موجود رہتا ہے۔ انسان کے کارنامے' اس کی اپنی طاقت اور خواہش کے مرہون منت نہیں ہوتے۔ اس لیے انسانی اعمال سے جو منصوبے پورے ہوتے ہیں وہ اس لیے نہیں ہوتے کہ انسان انہیں سوچتا ہے یا ان کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے بلکہ وہ اس لیے پورے ہوتے ہیں کہ وہ خدا کے مقصد کی تکمیل چاہتے ہیں اس سے تاریخ میں یہ نظریہ پیدا ہوا کہ تاریخی عمل میں جو منصوبے تکمیل پاتے ہیں یہ انسان کے عمل سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور اس کے مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ اس عمل میں انسان محض ایک آلہ کار ہے اس سے عیسائیت کا آفاقی نظریہ نکلتا ہے کہ خدا

کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں۔ اس کے ہاں رنگ و نسل اور قوم کا کوئی امتیاز نہیں۔ بلکہ اس عمل میں دنیا کے تمام انسان مل کر اس کے مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں اس لیے ہر جگہ اور ہر قوم میں ان کا عمل خدا کے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح عیسائیت نے تاریخ کا آفاقی تصور پیدا کیا۔ یونان اور روم کی تاریخوں میں انسانی عمل کا محور یونان اور روم ہے لیکن عیسائیوں کے ہاں خدا کی ذات محور ہے جس کے ارد گرد دنیا کے تمام انسان سرگرم عمل ہے۔

روشن خیالی کے زمانے میں تاریخی تصور میں جو تبدیلی آئی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کولنگ وڈ کہتا ہے کہ اس دور میں تاریخ کو سائنٹفک اور عقلیت کے اصولوں پر پرکھا گیا۔ لیکن انہوں نے ماضی کو بربریت اور توہمات کا نمائندہ قرار دے کر نظرانداز کر دیا۔ حال پر زیادہ زور دیا گیا اور ماضی کو درخوراعتنانہ سمجھا گیا۔ روشن خیالی کے اس تصور کے خلاف رومانوی تحریک ابھری' جس کا سرگرم رکن روسو تھا اس کے خیالات تاریخ کے نظریات میں بھی انقلاب لائے اس نے حکمرانوں کے وجود سے بغاوت کی اور عوام کی حکمرانی پر زور دیا۔ اس کے نزدیک والٹیر کے روشن خیال حکمراں اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک کہ عوام خود روشن خیال نہ ہوں۔ لہٰذا "مطلق العنان مرضی" کی جگہ "عمومی مرضی" زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ عمومی مرضی ہر دور اور زمانہ میں موجود رہی ہے اس لیے تاریخ کو اس عمومی مرضی کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس تصور نے مورخوں کے ذہن کو وسعت دی۔ انہوں نے ماضی کو وحشت و بربریت کا نمونہ سمجھ کر نہیں' بلکہ تاریخی عمل میں اور تہذیب و ارتقاء کے عمل میں ایک کڑی سمجھ کر دیکھا۔ ان کے نزدیک عمل ایک ہمہ گیر اور جامع تحریک ہے جو مسلسل ترقی کی جانب رواں ہے اور جس نے انسان کو وحشت و بربریت سے تہذیب و تمدن کی بلندیوں تک پہنچایا۔

رومانوی دور کی وسعت و ہمہ گیری کی جگہ جب ثبوتیت پسند تحریک نے لی تو نظریہ تاریخ میں پھر تبدیلی آئی کیونکہ ثبوتیت پسندوں کے نزدیک واقعات کا تعین کرنا اور پھر ان کی روشنی میں قوانین کو ترتیب دینا اہم تصورات تھے۔ اس تحریک نے تاریخ میں زبردست اضافہ کیا۔ مورخوں نے واقعات کی چھان بین کی اور انہیں انتہائی تفصیل سے بیان کیا لیکن ہوا یہ کہ واقعات کی بھرمار اور تفصیلات نے تاریخ کو خشک مضمون بنا دیا۔ ان مورخوں نے واقعات کو تو جمع کیا لیکن ان واقعات پر کوئی تبصرہ اور تنقید نہیں کی اور جب تاریخ میں یہ

سوالات پیدا ہوئے کہ کیا یہ پالیسی صحیح تھی؟ کیا یہ معاشی نظام مستحکم تھا اور کیا سائنس' مذہب اور آرٹ میں ترقی ہوئی؟ تو انہوں نے ان کے جوابات دینے سے احتراز کیا کیونکہ جواب دینے کی صورت میں ذاتی رائے فیصلہ اور نقطہ نظر کو دخل ہوتا جو واقعات کی شکل اور ان کا تاثر بدل دیتا۔ اس ثبوتیت پسندوں نے تاریخ کو صرف تاریخ سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا اور ان افکار کو نہیں دیکھا۔ جنہوں نے واقعات کی تشکیل میں مدد دی۔ انہوں نے تاریخ کو صرف سیاست تک محدود رکھا اور سائنس آرٹ و مذہب کے اثر کو محسوس نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کا تاریخی شعور سمٹ گیا اور اس کی ہمہ گیری ختم ہو گئی۔

انسان ہر چیز کو جاننے کی کوشش کرتا ہے وہ خود کو سمجھنے کی بھی خواہش کرتا ہے کیونکہ جن اشیاء کے بارے میں وہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا شمار بھی ان ہی میں سے ہے۔ اس لیے خود کو جانے بغیر اس کی معلومات دوسری اشیاء کے بارے میں ناقص ہیں۔ خود کو پہچاننا ضروری ہے تاکہ دوسری اشیاء کے بارے میں معلومات ہو سکیں۔ یہاں خود کو جاننے سے مراد جسمانی ہی نہیں بلکہ روحانی' ذہنی اور شعوری ہے تاکہ اس طرح سے وہ اپنی صلاحیتوں' افکار اور خیالات سے واقف ہو سکے۔

انسانی ذہن کی فطرت سمجھنے سے پہلے اس دنیا کے بارے میں واقف ہونا چاہئے کیونکہ جب ہم اس دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں خاص قسم کے واقعات نظر آتے ہیں۔ جو ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان واقعات کو سمجھتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے سے متعلق نظر آتے ہیں۔ واقعات کے آپس کے تعلق اور رشتہ کو "فطری قوانین" کہا جاتا ہے۔ ان قوانین کی روشنی میں نہ صرف ہم واقعات کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ ان کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ انسانی ذہن کو بھی سمجھنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔ پہلے ہم یہ دیکھیں کہ کن حالات میں ہمارا ذہن رد عمل کا شکار ہوتا ہے اور اس کا اثر کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم ان قوانین کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ جو ذہن اور اس کے عمل کو متحرک رکھتے ہیں۔ فطرت کو سمجھنے کا بہترین طریقہ سائنس ہے اور انسانی ذہن کو سمجھنے کا تاریخ ہے۔

کولنگ وڈ فطری اور تاریخی عمل میں تضاد پاتا ہے۔ فطرت کا عمل ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ پیدا کرتا رہتا ہے لیکن تاریخی عمل واقعات ہی پیدا نہیں کرتا' بلکہ ان کی تہہ میں گہری فکر بھی پیدا کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ مورخ صرف واقعات ہی کو بیان نہیں کرے بلکہ اس فکری عمل کو بھی دیکھے جو واقعات کی گہرائی میں رواں ہیں تاریخ کا یہ

صحیح نقطہ نظر ہے اور اسی وجہ سے تاریخ کو فکر کی تاریخ کہا جاتا ہے۔

فطری عمل اور تاریخی عمل میں فرق اس مثال سے سمجھ میں آتا ہے کہ جب ایک سائنسدان پوچھتا ہے کہ "کاغذ کا یہ ٹکڑا زرد کیوں ہوا؟" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کن موقعوں پر کاغذ زرد ہوجاتا ہے یا کن مرحلوں سے گزرنے کے بعد اس پر زردی آتی ہے اور جب ایک مورخ پوچھتا ہے کہ "بروٹس نے سیزر کو کیوں قتل کیا؟" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بروٹس نے کیا سوچا؟ کہ جس کی وجہ سے وہ سیزر کو قتل کرنے پر تیار ہوا۔ مورخ کے نزدیک واقعہ کے وقوع ہونے کی وجہ وہ خیال ہے جو اس شخص کے ذہن میں پیدا ہوا جس نے آلہ کار بن کر واقعہ کی تشکیل دی۔ یہی تاریخ میں ہر واقعہ کا داخلی پہلو ہے۔

مورخ کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ واقعات کو بیان کرے تو ان کے داخلی پہلو سے بھی پردہ اٹھائے' اس فکر کو دیکھے جو ان واقعات کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔ اس عمل کو دیکھے جو واقعات کو پیدا کرتا ہے۔ مورخ کے لیے یہ کام انتہائی اذیت ناک اور دشوار ہے کیونکہ واقعات کو سمجھنے کے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو اسی ماحول میں ڈھال لے اور اپنی شخصیت کو اسی شخصیت میں ضم کردے جس کا وہ بیان کررہا ہو۔ مثلاً" جب ایک مورخ سیزر کی تاریخ لکھتا ہے اور اس کی جنگوں اور سیاست پر تبصرہ کرتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوچے کہ سیزر کے ذہن میں کیا خیالات تھے جس کی وجہ سے وہ عمل پر مجبور ہوا۔ مورخ خود کو انہیں حالات میں ڈھال کر غور کرے کہ ان حالات میں سیزر نے جو کچھ کیا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟ اس کے بعد وہ اس کی تاریخ کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکتا ہے اور اس سے بہتر نتائج نکال سکتا ہے۔ اس فکر کی تاریخ پہلے مورخ کے ذہن میں تشکیل پاتی ہے اسی کے زیر اثر مورخ ماضی کے افکار کو دوبارہ تشکیل دیتا ہے جس سے فکری تاریخ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مورخ تاریخی علم کو صرف انسانی معاملات تک محدود رکھتا ہے۔ کیونکہ فطری عمل واقعات کا عمل ہے۔ جب کہ تاریخ کا عمل فکر کا عمل ہے۔ اس لیے انسانی تاریخ عمل کا موضوع ہے کیونکہ انسان وہ حیوان ہے جو سوچ سکتا ہے اور اس کی سوچ میں برابر اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کے تمام عمل تاریخ کاموضوع نہیں ہوتے۔ اس کے کچھ عمل تاریخی ہوتے ہیں اور کچھ غیر تاریخی' جو انسانی اعمال فطرت کی وجہ سے ہوتے ہیں جیسے بھوک' پیاس اور نیند وغیرہ' یہ غیر تاریخی عمل ہے کیونکہ یہ فطرت کا عمل ہے اس لیے یہ

مورخ کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں کہ انسان سوتا ہے۔ کھاتا ہے محبت کرتا ہے اور اپنی فطری بھوک اور خواہشات کو پورا کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر مورخ ان سماجی معاشی اور معاشرتی رسومات' روایات اور اقدار میں دلچسپی لیتا ہے۔ جنہیں انسانی معاشرہ تشکیل کرتا ہے اور جن کے پس منظر میں معاشرہ کی فہم و ادراک پیدا ہوتی ہے۔

کولنگ وڈ کے نزدیک ایک مورخ صرف ان واقعات کو بیان کرے جو داخلی طور پر فکر کے حامل ہوں' واقعات کا بیان صرف اس حد تک ہو جس حد تک ان میں فکر ہو۔ کیونکہ یہی صحیح اور اصل تاریخ ہے۔ محض واقعات کے انبار کو ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ جمع کرنے سے کوئی تاریخی شعور پیدا نہیں ہوتا۔

تاریخی تحقیق مورخ کو اپنے ذہن کی قوت کا احساس دلاتی ہے کیونکہ وہ تاریخی علم کو اس کی گہرائیوں میں نہیں اتر پاتا تو اس وقت اسے اپنے ذہن کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات کچھ مورخ یا مورخوں کی پوری نسل تاریخ کے کسی دور یا زمانہ کو نہیں سمجھ پاتے اور اسے "تاریک دور" کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اس تاریکی کا تعلق زمانہ سے نہیں بلکہ ان کے ذہن سے ہوتا ہے۔ جو زمانہ کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ پاتا۔

فطرت اور تاریخ کے عمل میں ایک فرق یہ ہے کہ تاریخی عمل سے جو ماضی پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک زندہ' متحرک اور جاندار ماضی ہوتا ہے۔ مثلاً" یونانیوں نے علم ریاضی میں جو تخلیق کی وہ موجودہ ریاضی کی بنیاد بن گئی ان تبدیلیوں نے تاریخی فکر کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملائیں اور فکر کی اس زنجیر کو برابر متحرک رکھا۔ لیکن فطری عمل ذہنی طور پر اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی فطری تجربات سے دوسرا فائدہ اٹھاتا ہے مثلاً" ایک شخص کھانا کھاتا ہے یا پانی پیتا ہے۔ لیکن اس کے فطری عمل سے دوسرے شخص کو کوئی جسمانی توانائی نہیں پہنچتی لیکن اگر کوئی شخص غور و فکر کرتا ہے تو اس سے دوسرے ذہن بھی متاثر ہوتے ہیں اور تاریخ اسی ذہنی و شعوری فکر کو محفوظ رکھ کر اسے دوسروں تک پہنچاتی ہے کیونکہ فکر تاریخی عمل میں ہے اس لیے تاریخی علم محض تفریح یا وقت گزاری کے لیے نہیں بلکہ یہ وہ علم ہے جو ذہن و شعور کو فہم و ادراک بخشتا ہے۔

کولنگ وڈ تاریخ کی بنیاد دو چیزوں پر قرار دیتا ہے یاداشت اور اتھارٹی اگر کوئی واقعہ تاریخی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اس سے واقف ہو اور واقف کار اسے یاد بھی رکھے اور اپنی یاداشتوں کی مدد سے' اسے واضح اور صاف الفاظ

میں دوسروں سے بیان کرے۔ اس میں صداقت بھی ہونی چاہئے تاکہ دوسرے اسے صحیح تسلیم کریں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے والا مورخ ہوا اور جس کی بات پر یقین کیا گیا وہ اتھارٹی ہوئی۔

مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ اتھارٹی کے بیان کو دیکھے کہ کونسا حصہ کمزور ہے اور کہاں بیان میں حالات سے مطابقت نہیں۔ واقعات کو کن حالات اور کس ماحول میں لکھا گیا اور اس کے پس منظر میں کیا مقاصد تھے۔ اس کے بعد مورخ واقعات کی تشریح کرے اور ان کا تنقیدی جائزہ لے مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتھارٹی کے بیان کو بالکل صحیح تسلیم نہیں کرے بلکہ اس بات کو دیکھے کہ اس نے کن اہم چیزوں کو نظرانداز کردیا ہے اور کن باتوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ مثلاً" ایک کمانڈر اپنی رپورٹ میں جنگ کو فتح قرار دیتا ہے جب مورخ اس پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ اگر یہ فتح تھی تو پھر اس کے نتائج کیوں دوسرے برآمد ہوئے۔ یہاں وہ کمانڈر کی غلط بیانی کو پکڑ لیتا ہے کہ اس نے اپنی رپورٹ میں کچھ حقائق کو چھپایا ہے۔ اگر وہ اس طرح تجزیہ نہ کرے تو وہ بھی مورد الزام ٹھہرے گا کہ اس نے رپورٹ کو صحیح سمجھ کر بیان کردیا اور اس پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی۔

بعض اوقات تاریخ کا انحصار نہ تو اتھارٹی پر ہوتا ہے اور نہ یاداشت پر کیونکہ مورخ تک تاریخ اس صورت میں پہنچتی ہے کہ نہ تو کوئی بیان ہوتا ہے۔ اور نہ شہادت و روایت۔ اب مورخ کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آیا یہ واقعات ہوئے بھی تھے یا نہیں یہ فیصلہ وہ اس تحقیق کے بعد کرتا ہے جس میں آثار قدیمہ کے نشانات اور نوادرات اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مورخ ان نشانات اور نوادرات کی مدد سے تاریخی واقعات کو تشکیل دیتا ہے اور واقعات کو جوڑ کر ان سے تاریخ بناتا ہے۔

اس مرحلہ پر یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ کے ذریعہ کس طرح حقیقت تک پہنچا جائے؟ کیونکہ مورخ اتھارٹی کے بیان کو تسلیم کرکے بیان تو کردیتا ہے مگر ساتھ ساتھ اس شبہ کا اظہار بھی کرتا ہے کہ حقیقت میں جو کچھ ہوا وہ یہ نہیں بلکہ شاید کچھ اور ہو اس کا جواب براڈلے اس طرح دیتا ہے کہ "ہمیں دنیا کے تجربات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ واقعات خاص ماحول میں ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتے۔ ان تجربات کی روشنی میں مورخ اس بات پر غور کرے کہ اتھارٹی کا بیان صحیح ہے یا غلط۔ اگر نتائج اس کے تجربات کے

مطابق ہوں تو وہ واقعات صحیح ہیں ورنہ نہیں۔"

کولنگ وڈ براڈلے کے اس نقطہ نظر سے اختلاف نہیں کرتا کیونکہ اس نقطہ نظر سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا وقوع پذیر ہوا؟ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا ہونا چاہئے؟ چونکہ یہ نہیں بتایا جاتا کہ کیا ہوا؟ اس لیے ہمیں اپنی معلومات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ہم اپنی معلومات پر یقین کرتے ہوئے اس کو اتھارٹی کی معلومات پر منطق کرتے ہیں اس سے اتھارٹی کی مخالفت صرف منفی حد تک ہوتی ہے۔

کچھ مورخ اپنے تجربہ کو تاریخ سے بلکہ فطرت سے اخذ کرتے ہیں جبکہ فطرت کوئی تاریخ نہیں رکھتی۔ کیونکہ فطرت کے قوانین یکساں ہوتے ہیں اس لیے جو چیز آج فطرت کے خلاف ہے وہ دو ہزار قبل بھی اس کے خلاف تھی۔ لیکن تاریخی لحاظ سے انسان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ان میں یکسانیت نہیں اور ان کے نتائج بھی ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں۔

کولنگ وڈ تاریخ کے لیے تخیل کو ضروری سمجھتا ہے کہ کیونکہ تاریخ میں جگہ جگہ خلا یا شگاف ہیں اس لئے مورخ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے تخیل کی مدد سے تاریخ کے ان شگافوں کو بھرے تاکہ رکاوٹیں دور ہوں اور تاریخ واضح اور صاف شکل میں وجود میں آئے۔ تاریخ میں کس قسم کے خلا ہوتے ہیں؟ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ مثلاً" اگر تاریخ میں یہ لکھا ہے کہ سیزر ایک دن روم میں تھا اور چند دن بعد گال (Gaul) میں تو مورخ کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کہ آخر ان بقیہ دنوں میں وہ کہاں تھا؟ جو روم اور گال کے درمیان میں آتے ہیں۔ اب مورخ کا کام یہ ہے وہ اپنے تخیل کی مدد سے اس خلا کو پر کرے کہ ان دنوں میں سیزر نے کیا کیا؟ وہ کن کن مقامات سے گزرا ان سوالات کے جواب سے وہ اس خلا کو بھر سکے گا جو تاریخ میں موجود ہیں بالکل اسی طرح جیسے سمندر میں ایک جہاز کو دیکھتے ہیں۔ پھر پانچ منٹ آنکھیں بند کرکے دوبارہ اسے دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں دوسری جگہ نظر آتا ہے۔ اب ہم اپنے تخیل کی مدد سے اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس پانچ منٹ کے عرصے میں جب ہم نے اسے نہیں دیکھا اس وقت جہاز کس جگہ ہوگا۔ بالکل اسی طرح ہم تاریخ میں جو جگہیں خالی ہیں انہیں پر کرسکتے ہیں۔

بری (Bury) کہتا ہے کہ تاریخ سائنس ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں کولنگ وڈ اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سائنس کے معنی ہیں کسی بھی علم کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنا' اس لحاظ سے تاریخ کو سائنس کہنا صحیح ہے لیکن یہ سوال غور طلب ہے کہ تاریخ

سائنس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیونکہ کوئی علم جب سائنس ہوتا ہے تو وہ ایک خاص قسم کی سائنس میں شمار ہوتا ہے کیونکہ علم کے کسی پہلو کو ایک خاص انداز اور طریقہ سے منظم کیا جاتا ہے۔ مثلاً" علم موسمیات جو ان واقعات اور مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے جسے سائنسداں وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اگرچہ وہ انہیں اپنی مرضی سے پیدا نہیں کر سکتا یا علم کیمیا جو صرف مشاہدہ ہی نہیں کرتا بلکہ واقعات کو خاص حالات کے تحت پیدا بھی کرتا ہے لیکن تاریخ ان میں سے کسی بھی طریقے سے ترتیب نہیں دی جاتی۔ جنگ اور انقلاب جو مورخ کا موضوع ہوتے ہیں وہ کسی تجربہ گاہ کی پیداوار نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ ان واقعات کا اس طرح سے مشاہدہ کرتا ہے جیسے سائنسداں تجربات اور مشاہدات سے فطرت کے مستقل قوانین دریافت کرتے ہیں۔ مورخ تاریخ میں کوئی مستقل اور وجہ دریافت نہیں کرتا کیونکہ تاریخ ایسی سائنس ہے جو ان واقعات کا مشاہدہ کرتی ہے جو ہمارے مشاہدے سے دور ہیں۔ وہ ان واقعات کا استخراجی مطالعہ کرتی ہے اور ان پر اس طریقہ سے بحث کرتی ہے جو مشاہدہ کی پہنچ تک ہیں۔ اسے مورخ شہادت (Evidence) کہتا ہے۔

کولنگ وڈ سوانح حیات کو تاریخ تسلیم نہیں کرتا' کیونکہ اس کا نظریہ ہے کہ فکر کے علاوہ اور کوئی تاریخ نہیں۔ اس لیے سوانح حیات اگرچہ تاریخ عنصر رکھتی ہے لیکن اس کے بنیادی اصول غیر تاریخی ہوتے ہیں' بلکہ ایک لحاظ سے تاریخ سے متضاد ہوتے ہیں۔ سوانح حیات کا موضوع صرف محدود واقعات ہوتے ہیں جو ایک انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اس لیے اس کی بنیاد اور ڈھانچہ فکر پر نہیں بلکہ فطری عمل پر ہوتا ہے۔ اور اس کے گرد آدمی کی جسمانی زندگی' اس کا بچپن' شباب' بڑھاپا' بیماریاں اور حادثات ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس عمل کے پہلو اس کی اپنی اور دوسروں کی فکر بھی ہوتی ہے۔ لیکن بنیادی چیز انسانی جذبات ہیں اور سوانح حیات انسانی جذبات کی ترجمان ہوتی ہے۔ اس میں انسانی تجربات' جذبات اور خواہشات ہوتی ہیں یہ کسی ایک شخصیت کی ترجمانی تو کر سکتی ہے' مگر یہ تاریخ نہیں ہو سکتی۔

کولنگ وڈ تاریخ میں صرف انہیں سرگرمیوں اور انسانی اعمال کو جگہ دیتا ہے۔ جو کسی مقصد کے تحت وقوع پذیر ہوئے ہوں۔ بامقصد انسانی عمل تاریخ کا موضوع ہوتے ہیں۔ اس میں خصوصیت سے سیاست کو اولیت حاصل ہے کیونکہ یہ ایک بامقصد عمل ہے جو ایک سیاست داں کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے۔ ہر سیاست داں اپنا نقطہ نظر رکھتا ہے اس پر اپنی

پالیسی ترتیب دیتا ہے اور اس پالیسی کو سوچ سمجھے منصوبہ کی حیثیت سے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح معاشی سرگرمیاں بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جب آدمی فیکٹری لگاتا ہے یا بنک کا کاروبار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور اس مقصد میں وہ لوگ بھی شامل ہوجاتے ہیں جو اس ذریعہ سے روزی کماتے ہیں اس کی چیزیں خریدتے ہیں یا بنک میں پیسہ جمع کراتے اور نکلواتے ہیں۔ اخلاقی تاریخ کی بنیاد بھی مقصد پر ہے جو خواہشات اور آزادی کو معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے محدود کرتی ہے۔ افراد فرض کی ادائیگی حادثاتی طور پر نہیں کرتے' بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں اس کی اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے۔

کولنگ وڈ نے اپنے تاریخی نظریات میں جس چیز کو واضح کیا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ فطرت سے آزاد ہے۔ وہ عمل جس کے اثر اس کی قوت اور جس کے زور سے انسان تاریخی تبدیلیاں لایا ہے اس کے پس منظر میں کوئی طاقت اور قوت نہیں۔ تاریخ آزادی سے اپنے منصوبوں کو پورا کرتی ہے۔ تاریخ فکر نیچرل سائنس کے دباؤ سے آزاد ہے وہ ایک خودمختار سائنس ہے جس کا اپنا عمل' قوانین اور فکری نظام ہے۔ تاریخ ایسی سائنس ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹ کر ترتیب دیتی ہے۔ اس لیے انسان کی ذہنی و شعوری ترقی میں' اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

رینائر

جی۔ جے رینائر بیسویں صدی کا مورخ ہے۔ تاریخ کے بارے میں اس نے اپنے خیالات کا اظہار مشہور کتاب۔

History : Its Methods and Practic

میں کیا ہے۔ اس نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ تاریخ کس طرح بنی؟ کسی طرح اس میں ترتیب آئی؟ اور کس طرح اس کا تعلق انسانی ذہن سے ہوا؟ اور عملی زندگی میں تاریخ کس کام آسکتی ہے؟ اس نے اس اہم سوال کا بھی جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ کیا تاریخ آج کی سائنسی و فنی زندگی میں کوئی انقلابی کردار ادا کرسکتی ہے۔

رینائر نے تاریخ کی افادیت و اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ انسان کے لیے یادداشت کا ہونا انتہائی لازمی اور ضروری ہے کیونکہ یہ یاداشت اس کے شعور، عقل و فہم اور غور و فکر کے لیے ضروری ہے انسان بغیر یاداشت کے نہ تو کوئی فیصلہ کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنی حالت سدھار سکتا ہے۔ اگر انسان ابتداء میں صرف غور و فکر کرتا تو یہ اس کے لیے انتہائی مہلک ہوتا کیونکہ غور و فکر عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کے لئے جانوروں سے مقابلہ کرنا اور اپنا وجود برقرار رکھنا ناممکن ہوجاتا یہ اس کی حرکت عمل اور تیزی تھی جس نے خوں خوار جانوروں کو شکست دی اور اس نے ابتدائی دور میں کامیابی حاصل کی۔

انسان نے غور و فکر سے زیادہ عمل پر کیوں زور دیا؟ اس لیے کہ آدمی کی خواہشات بھوک، پیاس اور تھکن کے بعد آرام کی شدید خواہش نے اسے مجبور کیا کہ وہ حالات سے مقابلہ کرے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کرے کیونکہ انسان کی خواہشات کا تعلق اس کے ذہن سے ہے۔ اس لیے ہر انسان اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے اس تصادم اور کش مکش میں انسان نے تجربات کے ذریعہ یہ سیکھا کہ کچھ حالات میں عمل سے گریز کیا جائے اور کچھ حالات میں صرف مشاہدہ کیا جائے۔ حالات و واقعات کو پرکھا جائے۔ بعض حالات میں سوچے سمجھے بغیر یا مشاہدہ کئے بغیر عمل کیا جائے۔ بعض وقت جب اسے

کوئی مشکل مرحلہ پیش آتا ہے یا کوئی عقلد لا ینحل اور پیچیدہ مسئلہ اسے پریشان کرتا ہے تو اس وقت وہ سوچتا ہے کہ کیا ماضی میں بھی کبھی ایسا ہی واقعہ اور مسئلہ پیش آیا تھا؟ اور اس وقت اس نے کیا کیا تھا؟ کس طرح اس نے ان مسائل کو حل کیا تھا؟ اور اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہوئی تھی؟ اس سوچ بچار کے بعد وہ عمل کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان نے اپنے عمل کی بنیاد "تجربات" پر رکھی ہے۔ ماضی کے ان تجربات کو ذہن میں محفوظ رکھنے کے لیے "یاداشت" کا ہونا ضروری ہے یاداشت کو بہتر طریقے سے کام میں لانے کے لیے غور و فکر اور سوچنا لازمی ہے اس لیے انسانی زندگی جس قدر پیچیدہ ہوگی' اسی قدر اس کے حل کے لیے اور مسائل کو دور کرنے کے لیے جدوجہد اور غور و فکر کی ضرورت ہوگی۔

یاداشت کا کام ہے کہ وہ ماضی کے تجربات کو ذہن میں جمع کرتی ہے۔ جو اسے اپنے آباؤ اجداد سے زندگی کے مختلف حصوں میں بطور وراثت ملتے ہیں۔ یہ "یاداشت" بالکل صحیح صحیح ہر چیز کو محفوظ نہیں رکھتی اور تجربات کو بھلا بھی دیتی ہے۔ کیونکہ ہر انسان کی یاداشت مختلف ہوتی ہے کوئی کم یاد رکھتا ہے اور کوئی زیادہ لیکن اس کمزوری کے باوجود ہم اسے اپنے احساسات و تجربات کی حفاظت گاہ سمجھتے ہیں۔

انسانی معاشرہ ایک فرد کی طرح ہے جب اسے مشکلات پیش آتی ہیں۔ تو وہ ماضی کے تجربات کی طرف دیکھتا ہے۔ اسی وجہ سے بیکن کہتا ہے کہ "تاریخ آدمی کو عقل مند بناتی ہے" لیکن فرد کے مقابلے میں معاشرے کے لیے یاداشت رکھنا بہت مشکل ہے' کیونکہ اس کے پاس کوئی نامیاتی (Organic) یا منظم قسم کی کوئی یاداشت نہیں ہوتی جہاں وہ ماضی کے تجربات کو اکٹھا کرے' انہیں محفوظ کرے اور جب بھی ضرورت پڑے تو ان تجربات میں سے کسی تجربہ کا استعمال کرے۔ اس لیے معاشرہ کا ہر فرد اپنے جانشین کو اپنے تجربات بیان کرتا ہے اور در حقیقت یہی "بیانات" معاشرے کی یاداشت ہوتے ہیں یہ بیانات بہادری کے واقعات' قصے' کہانیاں گیت اور اقوال میں ہوتے ہیں۔ جب معاشرہ کو یہ احساس ہوا کہ ان بیانات سے قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو انہوں نے یہ کام مخصوص لوگوں کے سپرد کردیا کہ وہ انہیں ترتیب اور قاعدہ سے محفوظ رکھیں اور پھر اسے آنے والی نسل کو منتقل کردیں۔ یہ بیانات آگے چل کر تاریخ میں تبدیل ہوئے اور ان کو لکھنے والے مورخ کہلائے۔ ان مورخوں نے ہر آنے والے واقعہ کو جو قحط ہو' زلزلہ ہو' یا دشمن کے مقابلہ

میں محاصرہ کی حالت ہو یا فتح و شکست ہو۔ اسے تفصیل سے لکھا تاکہ آنے والی نسل ماضی کے ان واقعات کی واقفیت حاصل کرکے خوشی و مسرت سے لطف اندوز ہو۔ بعد میں ان بیانات کی ہر دور میں توضیح و تشریح ہوتی رہی اور ان پر تنقید کی گئی۔ اس لیے (Bauer) کہتا ہے کہ

"ہر زمانے کی تاریخ کا تصور علیحدہ بنیاد پر ہوتا ہے"

ہر فرد کو اپنے ماضی سے دلچسپی ہوتی ہے۔ گزرے ہوئے لمحات اس کے لیے خوشی و مسرت یا رنج و اندوہ کی متحرک تصویریں ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک نقش اس کے ذہن پر ثبت ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے ماضی سے نکل کر اپنی قوم اور معاشرے کے ماضی میں آتا ہے تو اس وقت بھی اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے کیونکہ اس وسیع و عریض اور گنجلک ماضی میں اس کا ماضی بھی شامل ہوتا ہے۔ معاشرے کی اقدار' روایات اور ادارے اس کی ذات کی وسعت ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے وہ ماضی کے خزانوں سے متعارف ہوتا ہے اسی لیے کسی نے کہا کہ "تمام ماضی میرا ماضی ہے اور میں تسکین کی خاطر اسے دیکھنا چاہتا ہوں" اس سے ثابت ہوتا ہوا کہ فرد کا جذبہ نرگسیت اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ماضی کے دریچوں میں جھانک کر دیکھے۔ ماضی کے واقعات سے والہانہ محبت کرے ان پر فخر کرے' ان سے خوشی و انبساط حاصل کرے یا ان کو یاد کرکے غم و اندوہ اور اداسی سے دوچار ہو۔ ماضی سے لگاؤ' محبت صرف ماضی کی خاطر نہیں ہونا چاہئے بلکہ حال کے لیے بھی ہونا چاہئے۔ ماضی کے خزانوں سے جو کچھ بھی حاصل کیا جائے ان کی مدد سے مستقبل کو محفوظ اور پائیدار بنایا جائے۔

انسانی تاریخ انسانی تجربوں کی کہانی ہے۔ یہ تجربات منفی بھی ہیں اور مثبت بھی۔ اس لیے ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی ذہن کو سمجھا جائے۔ جس قدر انسانی ذہن کو سمجھا جائے گا اسی قدر اچھی تاریخ ہوگی اور اسی قدر وسیع نقطہ نظر ہوگا۔

موجودہ زمانے میں تاریخ کو کئی قسموں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ مثلاً" سیاسی تاریخ دستوری تاریخ' معاشی تاریخ' پارلیمانی تاریخ' سماجی تاریخ اور فنی تاریخ لیکن ان سب میں سیاسی تاریخ خصوصیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں انسان اپنی عظمت اور شان و شوکت کی خاطر جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ سیاسی تاریخ میں کھیلا جانے والا ڈرامہ ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اس میں خون ریز جنگیں بھی ہیں تو شجاعت و بہادری کے محیرالعقول

کارنامے بھی اور خیرہ کرنے والے شان و شوکت کے مظاہرے بھی' یہی وجہ ہے کہ والٹیر' گزو' آگٹس تھیری' مکالے اور رانکے نے سیاسی تاریک میں دلچپی لی۔ سیاسی تاریخ کے وسیع اسٹیج پر قومیں اپنی تقدیر بناتی نظر آتی ہیں۔ اس لیے آج بھی سیاسی تاریخ سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ کے دوسرے پہلو سیاسی تاریخ کے پس منظر میں جلوہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ جب تک کسی دور کے سیاسی نظام کو نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک اس دور کی معاشی' سماجی' فنی اور دستوری تاریخ کو بھی نہیں سمجھا جائے گا۔

کیونکہ انسانی تاریخ انسان کے متعلق ہے اس لیے مورخ اپنے اردگرد کے حالات کو دیکھتا ہے اور اپنے ساتھی انسانوں کے ذہن کردار اور عادات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس صورت میں اس علم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ماضی کو بہتر طریقہ سے سمجھتا ہے۔

ایک مورخ کے نقطہ نظر سے اگر انسانی ذہنیت ایک سی نہ ہوتی تو انسانی تاریخ بڑی پیچیدہ اور ناقابل فہم ہوتی۔ اسی خیال کو اناطول فرانس ذرا تبدیلی سے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے بہت کم مختلف ہیں۔ ہماری دلچپی و احساسات میں اگر کوئی تبدیلی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے جسمانی مسامات و اعضاء میں بھی تغیر و تبدیل ہو۔ اگر جسم میں معمولی تبدیلی ہوتی ہے تو یہ کام صدیوں میں پورا ہوتا ہے اس لیے انسانی کردار میں صدیوں و ہزاروں برس کے بعد تبدیلی آتی ہے۔

لیکن ایک دوسرا فلسفی اور مورخ کولنگ وڈ اس کی شدید مخالفت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی ذہن تبدیل ہوا ہے اور تبدیل ہوگا۔ جب دنیا کی تمام چیزوں میں تبدیلی ہوتی ہے اور ہر شے تغیر کا شکار ہے تو صرف انسانی ذہن اس سے کیوں کر مبرا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن کوئی جامد و ساکت شے نہیں ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ابتدائی زمانے میں جب انسان کا فطرت سے مقابلہ تھا تو اس وقت اسے طاقت و قوت درکار تھی۔ وہ مضبوط کردار کا حامل ہوا کرتا تھا۔ ایک انسان پوری جماعت کو اپنے قابو میں رکھتا تھا۔ جماعت کے تمام افراد اس کے تابع و فرماں بردار تھے۔ قرون وسطی میں چاہے ولی ہو یا نائٹ' یا دستکار سب معاشرے میں مل جل کر رہتے تھے اور اجتماعی نقطہ نظر سے ہر کام کرتے تھے۔ جب کہ موجودہ دور کا انسان انفرادیت پر زور دیتا ہے۔ اس انفرادیت نے اس کی پوری شخصیت اور کردار کو تبدیل کردیا ہے۔

سولھویں صدی کے آدمی کی اعصابی قوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ مذہبی امور میں اذیتوں کو خوشی خوشی برداشت کرتا تھا۔ جب کہ بیسویں صدی کا آدمی ہائیجن اور اینستھیزیا کے بغیر کوئی تکلیف برداشت نہیں کرسکتا لیکن اس کا جواب ماہر تعلیمات اور فلسفی اس طرح دیتے ہیں کہ جب لوگوں میں نظریہ کا اعتقاد ہو اور وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھیں تو اس صورت میں وہ ہر تکلیف کو برداشت کرسکتے ہیں۔ جیسے کمیونسٹ جنھوں نے مقصد کی خاطر خوشی خوشی تمام اذیتیں برداشت کیں۔ اس لیے یہ سوال کہ انسانی ذہن تبدیل ہوا ہے یا نہیں اس کا جواب بھی تاریخ کے صفحات میں نظر آجاتا ہے۔

ادب اور ڈرامے میں انسانی جدوجہد کے مناظر پیش کیے جاتے ہیں لیکن ان میں تاریخ کی طرح واقعات کی سچائی نہیں ہوتی۔ اگرچہ ادب اور ڈرامے میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ معاشرے اور فرد کی تاریخ ہوتی ہے لیکن یہ تاریخ تخیل کی پیداوار ہوتی ہے اور اس کی مدد سے مصنف یا ڈرامہ نویس انسانی کردار کے متعلق اپنی رائے دیتا ہے۔ شاعر مصنف اور فنکار کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے انسانی ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں لیکن تاریخ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں ٹھوس اور اٹل حقیقت ہوتی ہے۔ سبب علت، تخیل اور انسانی کردار کی فہم، تاریخ کے ضروری عناصر ہیں جن سے مل کر تاریخ بنتی ہے۔ اس لیے تاریخ صرف تخیل کی ایجاد نہیں بلکہ مورخ اپنی معلومات تجربوں کی بنیاد پر ماضی میں ہونے والے واقعات و حالات کو آپس میں ملاتا ہے۔ ان کی توضیح و تشریح کرتا ہے اور پھر اس سے نتائج نکالتا ہے۔

جب کوئی مورخ ان تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے تو اس میں اس کی ذاتی رائے اس کا سیاسی و مذہبی نقطہ نظر ضرور شامل ہوتا ہے اور بعض حالات میں مورخ ایک خاص ذہن و خیال کے سانچہ میں تاریخ کو ڈھالتا ہے۔ اس لیے ہر تاریخ مذہبی و سیاسی و نسلی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔

جب تاریخ میں ہونے والے واقعات کو غور و فکر سے پرکھا جاتا ہے ان کی توجیح پیش کی جاتی ہے اور انہیں ترتیب دے کر ان سے کوئی نتیجہ نکالا جاتا ہے تو پھر یہ "فلسفہ تاریخ" بن جاتا ہے کیونکہ تاریخ میں صرف بیان ہوتا ہے جب اس بیان کے اسباب و علل پیش کیے جائیں اور کسی خاص نقطہ نظر سے ان پر تنقید کی جائے یا ان کی تشریح کی جائے تو پھر یہ فلسفہ تاریخ ہوجاتا ہے۔

تاریخ کے ہر نظریہ میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ تمام واقعات ایک ترتیب' سلسلہ اور نظام کے تحت عمل پذیر ہورہے ہیں۔ اس لیے ترتیب وار واقعات کا دھرانا " قانون تاریخ" کے وائرے میں آجاتا ہے جو "قوانین فطرت" کی مانند ہوتے ہیں کہ جہاں ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ انسان نے جو تجربات ماضی میں کئے وہ دھرائے جائیں گے اگر تاریخ کو ایک سلسلہ مان لیا جائے کہ ابتدا سے اب تک اور آئندہ جو کچھ ہورہا ہے وہ تاریخ کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ایک کڑی سے دوسری کڑی سے ملا ہوا چل رہا ہے تو اس صورت میں یہ کہنا کہ سلسلہ ٹوٹ کر پھر واقعات دھرائیں گے غلط ثابت ہوجاتا ہے کیونکہ یہ سلسلہ ہمیشہ آگے بڑھے گا' اس میں تسلسل ہوگا' اس تسلسل کو روک دینا یا ختم کردینا انسانی ترقی کو ختم کر دیتا ہے۔ تاریخ میں کچھ واقعات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے واقعات و حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں جو اس سے مماثلت و مشابہت رکھتے ہیں۔ پھر یہ واقعات آنے والے واقعات کو متاثر کرتے ہیں اس لیے ہر واقعہ دوسرے واقعہ سے مضبوطی سے ملا ہوا ہے اور ہر واقعہ دوسرے واقعہ سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ واقعات کا سلسلہ ہوتی ہے جو برابر آگے کی جانب رواں دواں رہتی ہے۔ اس صورت میں تاریخ بار بار نہیں دھراتی بلکہ مضبوطی سے آگے کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔

ایک اہم سوال عام طور سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مورخ پیشین گوئی کرسکتا ہے؟ تاریخ کا مطالعہ ہر فرد کو اس بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ ماضی کی روشنی میں حال اور مستقبل کو سمجھ سکے۔ تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس کی نگاہ دور رس ہوجاتی ہے اور پھر وہ حالات کو وسیع نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لیے بلوک کہتا ہے کہ "ماضی کا وسیع علم مورخ کو یہ موقع فراہم نہیں کرتا کہ وہ مستقبل کے بارے میں صحیح صحیح پیشین گوئی کرسکے لیکن یہ علم اسے زمانہ حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اور زمانہ حال کو سمجھنے کے بعد مستقبل کے بارے میں اندازہ ہوسکتا ہے"

کیا مورخ جب تاریخ لکھنے بیٹھے تو اس وقت وہ اپنی رائے' تجربہ' خیالات' جذبات و احساسات کو اس سے علیحدہ رکھے؟ مورخوں کا ایک گروہ اس کا حامی ہے کہ تاریخ میں نظریات کا پرچار نہ ہو۔ ذاتی رائے و خیالات کا دخل نہ ہو۔ کیونکہ تاریخ بھی سائنس کی

طرح ہے اس لیے مورخ کا فرض ہے کہ واقعات کو جانچ اور پرکھ کر انہیں صرف بیان کردے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ شدت سے اس کا مخالف ہے۔ ان کے نزدیک مورخ اپنی ذات کو علیحدہ نہیں رکھ سکتا کیونکہ مورخ کا موضوع معاشرہ ہوتا ہے۔ اسے ان واقعات کو بیان کرنا اور پھر انہیں سمجھنا پڑتا ہے جس کا وہ خود ایک حصہ ہوتا ہے اس لیے معاشرہ اور قوم سے وہ اپنے وجود اور ذات کو علیحدہ نہیں کرسکتا۔ اس کی ذات کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو وہ سماجی روایات سے فرار نہیں ہوسکتا۔ اس لیے مورخ کا فرض ہے کہ وہ پہلے سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کردے تاکہ قاری اسی نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرے۔

ای۔ ایچ۔ڈانس

ای ایچ ڈانس بیسویں صدی کا انگریز مورخ ہے۔ جس نے یورپ اور انگلستان کی تاریخ پر کتابیں لکھیں۔ تاریخ کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار

HISTROY THE BETRAYER

میں کیا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ انسان کو حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔ تعصب وطن پرستی اور نسلی برتری کے احساسات تاریخ کو مسخ کرتے ہیں اس لیے ایسی تاریخ انسانوں میں باہمی نفرت، دشمنی عناد اور دوری کا سبب بنتی ہے۔

تاریخ کے ذریعہ حقیقت کی تلاش ایک ناممکن امر ہے۔ سچائی اور حقیقت تاریخ میں مختلف نقطہ ہائے نظر کی بھول بھلیوں میں گم ہوجاتی ہے یا مذہب اور رنگ و نسل کے گل ہائے رنگین میں روپوش ہوجاتی ہے۔ تاریخ حقیقت کی منزل کے اتنے راستے دریافت کرتی ہے کہ حق کا متلاشی ان راہوں میں ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے اور منزل دور سے دور تر ہوجاتی ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماضی میں تبدیلی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ تاریخ ماضی کا نام ہے لیکن تاریخ ماضی کا نام نہیں بلکہ زمانہ ماضی میں ہونے والے واقعات کا نام ہے اگر ان واقعات کا کوئی ریکارڈ نہ ہو تو تاریخ کے صفحات سادہ نظر آئیں گے اس لیے اس ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک ریکارڈ کی ضرورت ہے جب وہ اسے محفوظ کرتا ہے، ترتیب دیتا ہے اس کے معانی اور مطالب کو واضح کرتا ہے تو اس وقت اس کے ذاتی خیالات اور تعصب کا رنگ ان واقعات پر چڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی ہیئت و ماہیت بدل جاتی ہے۔

اس لیے ڈانس کے نزدیک تاریخ واقعیت پسند نہیں ہوسکتی۔ تاریخ دانوں کی مثال عدالت میں کھڑے ہوئے ان گواہوں کی مانند ہوتی ہے جو ایک ہی واقعہ کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں جب ایک واقعہ کتنے ہی رنگوں میں رنگا جائے اور اس کی بار بار مختلف انداز

سے توضیح و تشریح کی جائے تو اس صورت میں حقیقت و اصل واقعہ ان لاتعداد پردوں میں لپٹ کر نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور جزئیات پر بحث ہوتی رہتی ہے۔

اس صورت حال سے بچنے کے لیے مورخوں کا ایک گروہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر تاریخ کو سنہ و سال کے ذریعہ بیان کیا جائے تو اس صورت میں اسے واقفیت پسند بنایا جاسکتا ہے کیونکہ اس صورت میں ذاتی رائے اور نقطہ نظر کو دخل نہیں ہوگا لیکن یہ رائے بھی صحیح نہیں ہے اس کی مثال دیتے ہوئے ای۔ ایچ۔ ڈانس لکھتا ہے کہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ہاسٹنگ کی جنگ 1066 میں ہوئی تھی لیکن اس میں دو غلط بیانیاں ہیں۔ اول تو جنگ ہاسٹنگ میں نہیں اس سے چھ یا سات میل دور ہوئی تھی۔ اس لیے کچھ مورخوں نے اس بات کی تحریک شروع کی کہ اس کا نام ہاسٹنگ سے بدل کر "سین لیک" (Senlac) رکھ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ 1066 میں نہیں بلکہ 1069 سے 1074 کے درمیان ہوئی تھی کیونکہ عیسیٰ کی پیدائش ہمارے کیلنڈر کے مطابق آگسٹس کے 31 ویں سال میں نہیں ہوئی تھی بلکہ اس سے پہلے ہوئی تھی جب کرے نیس (Cyre nius) شام کا گورنر تھا۔

عیسوی سنہ کی اس غلطی کی وجہ سے نہ صرف مغربی تاریخیں سنہ و سال کے لحاظ سے غلط ہیں' بلکہ یہ غلطیاں وہاں بھی رواج پاگئیں جن ملکوں نے عیسویں سنہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ عیسوی سنہ کے پرانے اور نئے کیلنڈر میں جسے پوپ گریگوری نے ترتیب دیا۔ بڑا فرق ہے اس فرق کی وجہ سے عیسوی سنہ میں 2 سے 8 سال تک کا فرق پڑ جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے دوسرے ملکوں میں یا ماضی میں کوئی بھی ایسا طریقہ نہیں جس سے ہم ماہ و سال کا صحیح حساب لگا سکیں۔ اہل یونان اپنا حساب اولمپک کھیلوں سے رکھتے ہیں۔ اہل روم کا حساب شہر روم کی تعمیر کی تاریخ سے چلتا تھا اور مسلمانوں نے ہجرت کو اپنا سنہ قرار دیا۔ جس میں چاند کی تاریخوں سے حساب رکھا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس میں پرانے طریقوں کو ختم کرکے انقلابی حکومت نے اپنا سنہ شروع کیا۔ چینیوں نے دو ہزار سالہ شہنشاہیت کے زمانہ میں ہر شہنشاہ کی تخت نشینی سے ایک نیا سال شروع کیا۔ یہی طریقہ ہندوستان میں مغلوں کا تھا۔

یہ تمام طریقے معیار کے مطابق نہیں اور جب انہیں مغرب میں سنہ عیسوی میں تبدیل کیا گیا تو یہ اور بھی معیار سے گر گئے اسی وجہ سے مصر کی تاریخ میں بڑی الجھن پیدا

ہوئی کیونکہ ان کے سال میں 365 دن نہیں ہوتے تھے بلکہ 1/4 365 دن ہوتے تھے۔ عیسوی سال سے مصری تہذیب کی مدت 1461 سال ہوئے جس کی وجہ سے مصری تہذیب کے ماہر دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے جو 1461 سال کی تاریخ کو مختلف تاریخوں اور سنوں میں لکھ رہے ہیں۔

اس تحقیق کے بعض دلچسپ نتائج نکلتے ہیں مثلاً" حمورابی کا دور حکومت نئی تحقیق کے بعد دو سو سال اوپر چلا گیا۔ الفرڈ دی گریٹ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ 901ء میں مرا۔ لہٰذا اس کی وفات کی تاریخ کے حساب سے اس کی ایک ہزار سالہ برسی منانے کا اہتمام کیا جارہا تھا کہ کسی نے دریافت کیا کہ اس کی اصل تاریخ وفات 899ء یا 900ء ہے نتیجہ یہ ہوا کہ تمام تقریبات منسوخ ہوگئیں اور تاریخ کی تمام کتابوں میں سنہ کی تبدیلی کی گئی اسی طرح 23 اپریل کو شکسپیر کو یوم پیدائش بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم کسی کو نہیں۔

اس سے یہ چیز واضح ہو کر آئی کہ تاریخ کو واقعیت پسند بنانے کے لیے سنہ و سال کا سہارا کسی کام کا نہیں اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ تاریخ کو سنہ و سال کے ڈھانچے ڈھالنے کے باوجود اس میں تعصب پوری طرح سمو دیا جاتا ہے۔ سچ بولنے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ سوائے سچ کے اور کچھ نہیں بولا جائے۔

"EASIES WAY OF TELLING THE TRUTH IS TO SPEAK NOTHING BUT TRUTH-:"

مثلاً" تاریخ کی دو کتابیں جو برطانیہ اور جرمنی میں لکھی گئی ہیں ان سنہ و سال کے ذریعہ اس طرح تاریخ لکھی ہے۔

برطانیہ کی تاریخ میں

1510- میں ڈوڈلے اور امپسن کا قتل

1512- میں فرانس سے جنگ اور بریٹ کے مقام پر فرانسیسی بیڑہ کی تباہی

1513- انگلینڈ اور فرانس کی جنگ' فرانس کی شکست

1514- فرانس اور اسکاٹ لینڈ میں صلح

1515- وولزلے کا کارڈ نیل اور چانسلر بننا

1521- ہنری ہشتم کو پوپ کی جانب سے مذہب کے محافظ کا خطاب۔

جرمنی کی تاریخ میں

1500- اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کی ابتداء

1517- مارٹن لوتھر اور تحریک اصلاح مذہب۔

1520- جرمنی کی سائنس و فنی ترقی۔

1524- کسانوں کی جنگ۔

ان دونوں کتابوں میں 1500 سے لے کر 1525 تک کی معلومات دی گئی ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک بھی چیز مشترک نہیں کیونکہ دونوں تاریخیں دو مختلف نقطہ ہائے نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ برطانوی تاریخ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہمیشہ فرانسیسیوں اور اسکاٹ لینڈ والوں کو شکست دی ہے۔ ان تاریخوں کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں اپنے ملک کے واقعات کو بڑی اہمیت دی ہے جب کہ دنیا میں ہونے والے اہم واقعات کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔

جرمنی کی تاریخ میں برطانیہ کے بارے میں کوئی ایک لفظ نہیں اور نہ ہی اس میں یورپ کے سیاسی و معاشرتی واقعات کا کوئی ذکر ہے لیکن دونوں تاریخ میں سچ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں پھر بھی دونوں تاریخیں تعصب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اسی طرح مشرقی جرمنی میں جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں اسی زمانے کے واقعات کچھ اس طرح سے ہیں۔

1500- ہانسا کا زوال۔

1510- ہین لین نے جیب گھڑی ایجاد کی

1514- غریب کونارڈ کا انقلاب

1516- ٹامس مور کی یوٹوپیا

1517- لوتھر

1520- سوئزرلینڈ میں تحریک اصلاح مذہب

1524- کسانوں کی بغاوت۔ بابر کا ہندوستان فتح کرنا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان واقعات کو بڑی خوبی سے مارکسی نقطہ نظر سے منتخب کرکے ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

لہٰذا ان تاریخوں سے اور اس کے ذریعے دی جانے والی اطلاعات سے ایک خاص

قسم کے ذہن و شعور کی پرورش ہوتی ہے۔ اس قسم کی تاریخیں پوری نسل میں تعصب و دشمنی اور نفرت کے جذبات کو پروان چڑھاتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اسکول کے طالب علموں کے لیے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں یہ تعصب پوری شان سے ہوتا ہے کیونکہ کتاب جس قدر مختصر ہوگی اسی قدر اس میں کم انتخاب ہوگا اور اسی قدر اس میں تعصب ہوگا لیکن یہ بات اسکول کی کتابوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھی۔ گبن، مکالے اور ٹائن بی نے تاریخ کو اپنے نقطہ نظر میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ سے تاریخ پروپیگنڈے کا کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی۔ کیونکہ ہر تاریخ کی کتاب کسی خاص مقصد کی تشہیر کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اس لیے یہ کتابیں ایک نسل میں تو بڑی مقبول ہوتی ہیں اور لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں لیکن دوسری نسل کے لوگ انہیں فراموش کردیتے ہیں جیسے مکالے، سیلی اور گرین کی تاریخیں، کیونکہ انہوں نے یہ تاریخیں اپنے زمانہ اور ماحول کے مطابق لکھیں جب حالات بدلے تو ان کی وقعت بھی ختم ہوگئی۔ یہی حال موجودہ زمانے کی تاریخوں کا ہوگا۔ کیونکہ ان میں کوئی آفاقی قدر نہیں، وسیع نقطہ نظر نہیں، وسعت و جامعیت نہیں اس لیے یہ آنے والی نسلوں کے مزاج اور نظریہ کے خلاف ہوں گی اور اپنی اہمیت کھو دیں گی۔ نازی، فاشسٹ، اور کیمونسٹ نظریہ کے تحت جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں نظریہ کا رنگ گہرا ہے۔ اس لیے تاریخ کی کتابیں لکھتے وقت انہوں نے صرف انہیں واقعات کو منتخب کیا جن سے ان کے نظریہ کو تقویت ملی۔ وہ ایمانداری کے ساتھ اس نقطہ نظر کو صحیح بھی سمجھتے ہیں۔

اسی ذہنیت کے ساتھ انگریزوں نے تاریخ کی کتابیں لکھیں، مثلاً ""انگلستان کی وسعت"" (Expanbion of England) سامراجی نقطہ نظر سے لکھی گئی اور اسے انگریزوں نے صحیح سمجھ کر بڑی خوشی سے پڑھا۔ اس لیے نازیوں، فاشسٹوں، کیمونسٹوں اور انگریزوں کے طریقہ میں کوئی فرق نہیں۔ صرف نقطہ نظر میں فرق ہے۔ جب برطانوی و امریکی مورخ اپنی تاریخ کی کتابوں میں جمہوریت و پارلیمانی طرز حکومت کی طرف داری کرتے تو امریکی و برطانوی عوام اس سے خوش ہوتے ہیں اس لیے اگر جمہوریت کا پروپیگنڈہ جائز ہے۔ تو پھر ہمیں اشتراکیوں پر کیا اعتراض ہے اگر ایک امریکی مورخ جمہوری اقدار کی ستائش کرتا ہے اور ایک روسی اشتراکی نظریہ پیش کرتا ہے تو پھر ایک دوسرے کو تنگ نظر اور متعصب کہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی - دونوں کے خیالات و افکار میں جو فرق

ہے اس کی وجہ بھی تاریخ کی کتابیں ہیں۔

تاریخ میں ایک ہی واقعہ کی جدا جدا اور مختلف تفصیل ملتی ہے کیونکہ ہر قوم اپنے نقطہ نظر سے اس واقعہ کو بیان کرتی ہے۔ مثلاً" اسپین کی تاریخ میں آرمیڈا کی شکست موسم کی خرابی کی وجہ سے ہوئی۔ جرمنی کی تاریخوں میں کریمیا کی جنگ کے سلسلہ میں برطانیہ کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اشتراکی ملکوں میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں اتحادی طاقتوں کا ذکر بہت کم ہے۔

ہر قوم اپنے انداز سے سوچتی ہے اور یہی انداز اس کا تاریخ میں جھلکتا ہے ہر قوم اپنی طاقت' شجاعت اور بہادری کو مبالغہ کی حد تک بیان کرتی ہے مثلاً" جب جنگ صد سالہ کے حالات کے برطانیہ میں لکھے جاتے ہیں تو اس میں "سیلز کریسی" "پوٹیر" اور "اگن کورٹ" کی جنگوں کا ذکر تفصیل سے ہوتا ہے۔ جب فرانس میں یہی حالات لکھے جاتے ہیں تو اس میں برنارڈ کے دفاعی حربے' جان آف آرک کی بہادری اور فرانسیسی فتوحات کی تفصیلات ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انگریز طالب علم اس خوش فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ انگریز فرانسیسیوں سے زیادہ بہادر ہیں۔ اور فرانسیسی طالب علم فرانسیسیوں کو انگریزوں سے برتر سمجھتا ہے حالانکہ انگریز طالب علموں کو اس پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ انگریزوں کی بہادری اور فتوحات کے باوجود آخر وہ کیوں فرانس سے نکال دیئے گئے۔

جب "اسپین کی جانشینی" کا حال لنگریزی تاریخوں میں ہوتا ہے تو اس میں "بلین ہائم' مراحلے' مال پیک" کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کون تھے اور ان کے کیا کارنامے تھے؟ اسی طرح فرانس کی کتابوں میں "مالبرو" کی سرگرمیاں نظر نہیں آتیں۔ اس صورت میں دونوں ملکوں کے طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا ملک فتح یاب ہوا اور دونوں صحیح ہیں کیونکہ اس جنگ کے نتیجہ میں فرانس کا امیدوار اسپین کا بادشاہ ہوا اور برطانیہ نے نو آبادیات میں اضافہ کیا۔ کچھ یہی حال نپولین کی جنگوں کا ہے۔ انگریزی تاریخیں "ٹرافل گر" اور "واٹرلو" کی تفصیل سے بھری پڑی ہیں۔ جب کہ اس کی دوسری فتوحات کو یا تو نظر انداز کردیا جاتا ہے یا بہت ہی معمولی انداز میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک تاریخ کی کانفرنس میں جب سوال اٹھا کہ واٹرلو کی جنگ کا اصلی ہیرو کون تھا؟ تو اس کے جوابات بڑے دلچسپ آئے' برطانیہ' امریکہ اور اٹلی نے ویلنگ ٹن کو ہیرو قرار دیا۔ مغربی جرمنی نے بلوشر کو' فرانس نے پہلے بلوشر کو اور پھر ویلنگ ٹن کو' ڈنمارک نے پہلے

ویلنگ ٹن کو اور بلوشر کو' آسٹریا اور ناروے نے دونوں کو برابر کا قرار دیا۔ بیلجیم کے مورخ نے کہا کہ ویلنگ ٹن کی کمانڈ ضروری تھی لیکن اصل فتح کی وجہ بیلجیم کا ایک جنرل تھا۔ جس نے ویلنگ ٹن کے حکم کے باوجود پسپائی اختیار نہ کی اور آخر کار جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس فرق اور اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر قوم صرف انہی واقعات کا انتخاب کرتی ہے جو اس کے حق میں ہوں اور دوسرے تمام واقعات کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ تمام قوموں میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے کہ وہ دوسروں کی خوبیاں نہیں دیکھتیں۔

ہماری تاریخ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہم نے اسے مختلف دوروں میں تقسیم کررکھا ہے۔ مثلاً" قدیم قرون وسطیٰ اور جدید' قدیم تاریخ رومی شہنشاہیت کے خاتمہ پر ختم ہوجاتی ہے اور جدید دور کا آغاز نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوتا ہے اس کا درمیانی حصہ قرون وسطیٰ میں آتا ہے۔ لیکن کچھ مورخوں کے نزدیک جدید کی اصطلاح لایعنی ہوگئی کیونکہ جدید زمانہ سترھویں صدی سے لے کر موجودہ زمانہ تک آگیا۔ اس لیے اس زمانہ کے لیے "درمیانہ زمانہ" کی اصطلاح وضع کی گئی لیکن اسے برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں نے تسلیم نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں ایک الجھن اور پیدا ہوئی کیونکہ مغربی یورپ کے علاوہ دوسرے حصوں میں نہ تو رومی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا' اور نہ ہی تحریک نشاۃ ثانیہ ابھری' اس لیے ان کے ہاں قرون وسطیٰ کا کوئی زمانہ نہیں ہونا چاہیے۔ بازنطینی شہنشاہیت میں "درمیانی دور" کی کوئی ابتدا نہیں' مشرقی یورپ میں تو جدید زمانہ اب شروع ہوا ہے۔ اس لحاظ سے افریقہ اور ایشیاء کی پوری تاریخ نئے ادوار میں تقسیم ہوگی جس سے اہل مغرب قطعی ناواقف ہوں گے۔

اشتراکی ملکوں' خصوصیت کے ساتھ روس اور چین میں تاریخ کو نئے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی تاریخ میں صرف دو ادوار ہیں قدیم اور جدید' قدیم و جدید زمانے کو جدا کرنے والا واقعہ ان کے ہاں خانہ جنگی ہے۔ جس میں امراء کا زوال ہوا اور درمیانی طبقہ کو اختیارات ملے۔

بہت سے مورخ تحریک نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح مذہب کو چنداں اہم نہیں سمجھتے' ان کے نزدیک سترھویں صدی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس صدی میں ہونے والے واقعات نے تاریخ میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ برطانوی پارلیمنٹ نے بادشاہ کو قتل کیا 1648 اور 1659 میں یورپ کی طاقتوں کا معاہدہ ہوا۔ جس نے ہیسپربرگ

(Hapsburg) کا اثر ختم کیا اور فرانس کی قوت و طاقت کو بڑھایا اس دور میں پرشیا (Prussia) پہلی مرتبہ طاقت بن کر ابھرا' ہالینڈ اور سوئزرلینڈ کو پہلی مرتبہ بحیثیت طاقت کے تسلیم کیا گیا۔ دوسری جانب ذہنی و فنی اور سائنسی ترقی بھی اسی صدی میں ہوئی 1642ء میں گلیلیو کی وفات ہوئی اور نیوٹن پیدا ہوا بیکن نے سائنس کو تجربات کی بنیاد پر سیکھنے کو کہا۔ پوری یورپ میں سائنس کی اکیڈمیاں بنیں۔ نو آبادیاتی نظام کی ابتداء ہوئی۔ صنعت و حرفت میں ترقی ہوئی۔ بحیرہ روم کا تسلط ختم ہوا۔ اور اطلانٹک کے اقتدار کا زمانہ شروع ہوا۔

ہماری تاریخوں میں جو تنگ نظری آئی ہے اور اسے قومی و نسلی و مذہبی تعصب سے لکھا گیا ہے اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تاریخ کے طالب علم کو نہ صرف اپنے ملک بلکہ دوسرے ملکوں اور قوموں کی تاریخ ان کے کارناموں اور ان کی ترقی سے واقف ہونا چاہئے۔ ایشیا اور افریقہ میں جو واقعات ہوئے ان کا علم اہل مغرب کو ہونا ضروری ہے اہل مغرب کو یہ بات بھی سمجھنی چاہئے کہ صرف عیسائیت عظیم مذہب نہیں بلکہ اس کے علاوہ دوسرے مذاہب بھی ہیں اور ان کی اخلاقی قدریں بھی اتنی ہی عظیم ہیں جتنی عیسائیت کی۔ جب تک تاریخ میں بین الاقوامی تصور اور نظریہ نہیں ہوگا اس وقت تک ذہن میں وسعت و کشادگی نہ ہوگی - جن علماء اور مفکرین نے انسانیت کی تبلیغ کی وہ بھی تاریخ کے ہاتھوں ناقدری کا شکار ہیں۔ ہماری تاریخوں میں گروشس' پین' بینتھم' کانٹ اور وکٹر ہیوگو کا ذکر ایک آدھ صفحہ میں ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہیرو ڈوٹس تاریخ کا بانی ہے جب ہیروڈوٹس نے دوسرے ملکوں کا سفر کیا تو اسے جو جگہیں اور چیزیں پسند آئیں ان کا ذکر کیا جو زیادہ پسند آئیں ان کا ذکر تفصیل سے کیا اور جو چیز اسے پسند نہیں آئی اسے نظر انداز کردیا یا معمولی انداز میں اس پر لکھا یہی کچھ حال ہماری تاریخ کا ہے جو ہیرو ڈوٹس کے اس اصول پر آج تک عمل پیرا ہے۔

کروچے

بنی ڈی ٹو کروچے 1866ء میں پیدا ہوا۔ روم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ 1915ء میں وہ سینیٹر مقرر ہوا۔ اور 1921ء میں وہ اٹلی کا وزیر تعلیم ہوا۔ جب اٹلی میں مسولینی برسراقتدار آیا تو اس نے فاشزم کی سخت مخالفت کی۔ 1952ء میں اس کی وفات ہوئی۔ کروچے کی تصانیف تاریخ اور فلسفہ دونوں علوم میں ہیں "جمالیات" منطق' تاریخ اس کا نظریہ اور عمل اس کی مشہور کتابیں ہیں۔

تاریخ سائنس ہے یا آرٹ؟ کروچے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور اس بات کی سختی سے مخالفت کرتا ہے کہ تاریخ سائنس ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ آرٹ ہے کیونکہ جس طرح آرٹ نہ تو لذت دیتا ہے اور نہ ہی لذت کو اپنے میں سموتا ہے نہ ہی یہ فطرت کے رازوں اور حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے۔ نہ ہی یہ فطرت کی نمائندگی کا دعویدار ہے اور نہ ہی یہ باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ آرٹ ان تمام تصورات سے ہٹ کر فرد کی وجدانی کیفیت کا نام ہے۔ آرٹسٹ اس انفرادی کیفیت کو محسوس کرتا ہے اور اس کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے آرٹ دیکھنے یا محسوس کرنے والے عمل کا نام ہے۔ سائنس اس کے برعکس ایک عمومی علم ہے اس لیے یہ عمومی تعلقات پیدا کرتی ہے اور پھر ان میں رشتہ و تعلق قائم کرتی ہے۔

آرٹ اور سائنس کی اس تعریف کے بعد کروچے تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تاریخ انفرادی واقعات کا نام ہے اور ان واقعات کا بیان اور ان کی وجوہات تاریخ میں فکر پیدا کرتی ہیں۔ اگر محض اس بیان کی وجہ سے یا واقعات کی ترتیب اور مربوط سلسلہ کی وجہ سے تاریخ کو سائنس کہا جائے تو یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی صرف بیان تاریخ کو سائنس بنانے میں مدد نہیں دے سکتا کیونکہ بیان میں کسی واقعہ کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کی تفصیلات دی جاتی ہیں۔ جب کہ سائنس میں کسی شے کو تجربہ کے بعد بیان کیا جاتا ہے۔ سائنس اور تاریخ میں اس بیان کی نوعیت بالکل جدا اور مختلف ہوتی ہے۔ سائنس داں جب کسی شے کا تجزیہ کرتا ہے یا کسی واقعہ کا مشاہدہ کرتا ہے تو انہیں وہ عام قوانین کے

تحت ثابت کرتا ہے لیکن تاریخ میں بیان کو کسی قانون کے تحت پابند نہیں کیا جاتا ہے۔ اس میں موضوع کو نہیں دیکھا جاتا ہے بلکہ اس کے بارے میں غور و فکر کیا جاتا ہے اس لیے تاریخ وجدان اور فرد کی اس کیفیت کی نمائندگی کرتی ہے اس لحاظ سے اس میں اور آرٹ میں مماثلت ہے لیکن تاریخ ایک قسم کا آرٹ ہے۔ دوسرے آرٹسٹ جو محسوس کرتے ہیں اسے بیان کرتے ہیں مورخ بھی یہی کرتا ہے لیکن مورخ دوسرے آرٹسٹوں کے برعکس اس پر یقین رکھتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سچ ہے اور حقیقت ہے۔ کروچے منطقی طرز استدلال سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آرٹ مجموعی طور پر اسی کی نمائندگی کرتا ہے جو چیز وقوع پذیر ہوچکی ہے؟ اس لیے جو چیز ہوچکی ہے وہ ناممکن نہیں ہوسکتی' کیونکہ وہ عملی طور پر تشکیل پذیر ہوچکی ہے۔ حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے جو ممکن ہو۔ حقیقت ممکن میں ہے اور تاریخ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ اس لیے تاریخ وہ آرٹ ہوتی ہے جو ممکن کا بیان کرتی ہے۔ لیکن آرٹ خالص وجدانی ہے اس میں فکر نہیں ہوتی۔ جب حقیقت کو ممکن شے سے اختیار کرنے کے لیے سوچنا پڑتا ہے تو اس صورت میں تاریخ کو "حقیقت کا وجدان" کہا جاسکتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے تو اس کی حدود آرٹ سے بڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے کروچے کے نزدیک تاریخ نہ تو کسی قانون کو دریافت کرتی ہے اور نہ ہی بناتی ہے اور نہ ہی یہ تصورات تخلیق کرتی ہے۔ یہ صرف بیان کرتی ہے۔

حق و باطل میں فرق و امتیاز فکر کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور تاریخ میں جب واقعات کو جمع کرکے ان پر غور و فکر کرکے ان کی حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے تو اس میں فکر شامل ہوجاتی ہے۔ تاریخ بغیر فکر کے واقعات کی وضاحت' توجیح اور تشریح نہیں کرسکتی لیکن اگر تاریخ کو صرف بیان سے نکال کر فکر کا درجہ دے دیا جائے تو یہ آرٹ نہیں رہتی اس کا دائرہ اس سے بڑھ جاتا ہے اس کے ذہن میں اور زیادہ کشادگی پیدا ہو جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ منطق اور فکر دو قسم کے فیصلے کرتے ہیں۔ ایک آفاقی دوسرا انفرادی لیکن کروچے حقیقت کی اس تقسیم کے خلاف ہے اس کے نزدیک آفاقی اور انفرادی حقیقت ایک ہے۔ اس لیے تاریخ کا فیصلہ آفاقی ہوتا ہے۔ مثلاً" تاریخ میں اس جملہ کو پڑھا جائے "لوئی XI اور فرڈی نینڈ نے اپنے جرائم کے باوجود فرانس اور اسپین کو مستحکم کیا' جس کی وجہ سے دونوں قوتیں انتہائی طاقت ور بن گئیں" اس جملہ سے یہ بات واضح ہے کہ مصنف اور قاری

جرائم، قوم، طاقت ور اور اس قسم کی دوسری اصطلاحوں کو سمجھتے ہیں اور اپنے ذہن میں اخلاقی و سیاسی اقدار کا شعور رکھتے ہیں۔ ان ہی سیاسی و اخلاقی اقدار کے ذریعے ہم اس تاریخی حقیقت کو دریافت کرتے ہیں جو لوئی XI اور فرڈی نینڈ کے ذریعہ تکمیل کو پہنچی۔ اس لیے صرف تاریخ کے ذریعہ ان تصورات کو جو عملی شکل میں وجود میں آتے ہیں۔ بہتر طریقہ سے سمجھا جاسکتا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فلسفہ اور فکر کس طرح تاریخ سے اپنا رشتہ اور تعلق ملاتے ہیں۔ فیصلہ کا موضوع فرد ہوتا ہے لیکن اس کا دائرہ آفاقی ہوتا ہے۔ لہٰذا تاریخ فرد کو جانچتی ہے۔ لیکن اسی میں آفاقیت ہے۔

فلسفہ تصورات اور افکار تخلیق کرتا ہے۔ تاریخ اسے عملی شکل دیتی ہے اس لیے تصورات و افکار کی عملی شکل میں حقیقت پوشیدہ ہے تمام تاریخ حقیقت ہے اور تمام علوم تاریخی علوم ہیں۔ علم فلسفہ تاریخ کا ایک جزو ہے یہ وہ آفاقی عنصر ہے جس کی ٹھوس شکل فرد ہے اور فرد کے عمل کا بیان تاریخ ہے۔ تاریخ ایک محدود علم کا نام نہیں بلکہ یہ وہ علم ہے جو وسیع و عریض موضوع کو سمیٹ کر تمام علوم کی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے۔

کروچے کے نزدیک تاریخ ان واقعات کا علم ہے جو وقوع پذیر ہوچکے ہیں جن کی حقیقت ٹھوس اور انفرادی ہے۔ اس انفرادی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جذب ہوا جائے اس کی گہرائیوں میں اترا جائے اور اس کی روح کو سمجھا جائے۔ اس کی زندگی کو اپنی زندگی بنایا جائے۔ اور پھر اس کا تجزیہ کیا جائے۔ کسی شے میں خود کو جذب کرنے سے تاریخی واقعہ کی حقیقت بہتر طریقہ سے واضح ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ "اگر تم نیو لیتھک، لیگورین اور سس لین بن جاؤ، اگر تم ایسا نہیں کرنا چاہتے یا ایسا نہیں کرسکتے تو پھر اسی پر مطمئن ہوجاؤ کہ ان کی قدیم اور شکستہ کھوپڑیوں اور تصویروں سے دل بہلاؤ جو تمہیں مل گئی ہیں۔ اگر تم گھاس کے کے گھٹے کی صحیح تاریخ جاننا چاہتے ہو تو گھاس کا گھٹا بن جاؤ۔ اگر تم ایسا نہیں کرسکتے پھر اس کے تنکوں کے تجزیہ اور ان کی خوبصورتی پر مطمئن ہوجاؤ۔

کروچے تاریخ میں حقیقت کی تلاش اسی وقت ممکن قرار دیتا ہے جب ذہنی و شعوری طور پر خود کو اس ماحول اور حالات میں جذب کردیا جائے صرف اسی صورت میں ہم حقیقت کی تہہ اور گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں ورنہ محض قدیم اشیاء کو دیکھنے اور نوادرات سے لطف اٹھانے سے اس دور کی روح اور حقیقت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

کروچے فلسفہ اور تاریخ کو یک جان و دو قالب قرار دیتا ہے۔ جہاں تک سائنس کا

تعلق ہے تاریخ سائنس سے پہلے وجود میں آئی کیونکہ سائنس کی بنیاد جن واقعات' تجربات' شہادتوں اور مواد پر ہے وہ تاریخی مواد ہے اس لیے جب تک تاریخ واقعات کا تعین نہیں کرتی اس وقت تک سائنس داں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

کروچے تاریخ کا موضوع اسی ماضی کو بتاتا ہے۔ جس کی شہادتیں اور واقعات موجود ہیں۔ وہ ماضی نہیں جو واقعات اور شہادتوں سے محروم ہو۔ ماضی کا ایک حصہ گمنامی و اندھیرے میں روپوش ہے۔ اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں رہا کہ جس سے ہم ان واقعات کی کھوج لگائیں۔ انہیں اندھیرے سے اجالے میں لائیں اور واقعات کی مدد سے ماضی کی تعمیر کریں۔ ہم صرف شہادت کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ یونان میں عظیم مصور تھے لیکن محض شہادت پر ایک بات کو بیان کرنے سے یہ بات پایہ ثبوت تک نہیں پہنچتی کیونکہ ہمارے سامنے ان مصوروں کی کوئی تصویر نہیں۔ اس کے برعکس جب یہی بات یونان کے سنگ تراشوں کے بارے میں کہی جاتی ہے تو یہ تاریخی علم ہوتا ہے کیونکہ ان کے تراشیدہ مجسمے آج بھی ہمارے جمالیاتی ذوق کی نشوونما اور ترقی میں حصہ لے رہے ہیں اور ہماری موجودہ زندگی کا حصہ بن گئے ہیں۔ یونانی مجسمہ سازی کی تاریخ ہمارے موجودہ جمالیاتی تجربہ کا ذریعہ بن گئی ہے اس سے تاریخ اور روزنامچہ میں فرق واضح ہوتا ہے جن مصوروں کے نام ہمارے پاس روایتی طور پر چلے آرہے ہیں وہ یونانی مصوری کی تاریخ نہیں بتاتے بلکہ وہ یونانی مصوری کے روزنامچہ ہیں۔ روزنامچہ اس لیے کہ وہ ماضی تعمیر کرتے ہیں جس پر صرف شہادتوں یا روایتوں کی بنا پر یقین کیا جاتا ہے اس لیے یہ تاریخ نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر وہ تاریخ روزنامچہ بن جاتی ہے جب بیان کرنے والا اس کے کرداروں کے تجربات کو نظرانداز کردیتا ہے اس لیے روزنامچہ سے پہلے ضروری ہے کہ تاریخ کا وجود ہو لیکن روز نامچہ تاریخ کا جسم ہے اور جب اس میں سے روح نکل جاتی ہے تو وہ تاریخ کا مردہ جسم بن جاتا ہے۔ کردچے کہتا ہے کہ تاریخ میں کسی شہادت کی ضرورت نہیں' کیونکہ شہادت روزنامچہ کے لیے ضروری ہے جو لوگ شہادت' تصدیق اور اتھارٹی کی بات کرتے ہیں وہ تاریخ کی نہیں بلکہ روزنامچہ کی بات کرتے ہیں۔

تاریخ دو چیزوں کے ملاپ سے تشکیل پاتی ہے۔ ثبوت اور تنقید' ماضی اپنے پیچھے نشانیاں چھوڑ جاتی ہے۔ یہ نشانیاں محض بے حس ٹکڑے نہیں ہوتے' ان میں ماضی کے افکار اور ماضی کی فکر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ماضی کے ذہن و شعور کی عکاسی کرتے ہیں

اور ہم ان نشانیوں کو اس لیے محفوظ رکھتے ہیں تاکہ یہ مستقبل کے مورخ کے لیے ثبوت کے طور پر فراہم ہوں۔ ماضی کی ان نشانیوں کو جو میوزیم میں موجود ہیں یا جنہیں آثار قدیمہ کے تحت محفوظ کرلیا گیا ہے صرف ان نشانات اور نوادرات کی تفصیل بیان کرنا ان کی رنگ' ہیئت اور ساخت کا نقشہ کھینچنا نام نہاد تاریخ ہے کیونکہ ایسی تاریخ میں صرف بیان ہوتا ہے کوئی تنقید اور تاویل نہیں ہوتی اس لیے یہ بیان تاریخ کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اسی طرح جو تاریخ جذبات و خواہشات اور تعصب کی بنیاد پر لکھی جائے وہ بھی ایک نام نہاد تاریخ ہوتی ہے اس کو شاعرانہ یا رومانوی تاریخ تو کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ حقیقت کو آشکار کیا جائے بلکہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ حقیقت کو اپنے رنگ میں رنگا جائے اس قسم کی تاریخ مصنف کی خواہشات و جذبات کو ماضی کے بارے میں ظاہر کرتی ہے اس میں حقیقت کو پانے کی کوئی جستجو نہیں ہوتی۔ اس لیے جو تاریخ جذبہ حب الوطنی' قومی' انسانی آزادی اور مذہبی و نظریاتی نقطہ نظر سے لکھی جائے اس میں تعریف اور نفرت انتہا پر ہوتی ہے۔ ایسی تاریخ' تاریخ کہلانے کی مستحق نہیں کیونکہ جذبات اور تعصبات اسے ثبوت' شہادت اور صداقت سے دور لے جاتے ہیں۔ اس لیے صحیح تاریخ صرف وہ ہوتی ہے جس میں ثبوت اور شہادت پر نظر رکھی جائے اور ذاتی خواہشات کو نظرانداز کردیا جائے۔

انیسویں صدی کے مشہور مورخ تین (TAIN) کا کہنا ہے کہ "پہلے واقعات کو جمع کرو' پھر ان کی وجوہات تلاش کرو" کروچے اس پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ واقعات ٹھوس اور واضح حقائق سے بھرے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سائنس جیسی ترتیب اور تنظیم نہیں ہوتی' یہ ترتیب اسی وقت ہوسکتی ہے جب ان کی "وجہ" دریافت کی جائے۔ اسباب و علل ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے ملاتے رہتے ہیں اور لامتناہی واقعات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ واقعات کی زنجیر برابر بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن ہم اس وجہ سے یا وجوہات کو نہیں پاسکتے جس سے اس زنجیر کی ابتداء ہوئی ہے اور جس بنیاد پر واقعات کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

اس لیے کروچے اس بات پر یقین نہیں کرتا کہ تاریخ کسی ایک خاص متعین منصوبہ پر عمل کرتی ہے یا کسی خاص مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔ کیونکہ کسی ایک متعین راستہ پر چلنا فطرت کا طریقہ ہے۔ تاریخ کا نہیں۔ تاریخ واقعات سے جو انسانی ذہن کے رجحانات افکار و خیالات مقاصد اور دل چسپی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ظاہر نہیں ہوتا کہ انسان کی منصوبہ کی تکمیل کررہا ہے یا کسی مقصد کے تحت نپے تلے راستہ پر چلا جارہا ہے بلکہ یہ واقعات الجھن اور پیچیدگی پیدا کرکے انسان کو اندھیرے اور تاریکی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔

ٹائن بی

آرنلڈ جوزف ٹائن بی 1889ء میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ میں حاصل کی' پھر اسی یونیورسٹی میں 1915ء تک پڑھایا۔ اس کے بعد لندن یونیورسٹی میں بازنطینی اور جدید یونانی زبان و ادب اور تاریخ کا پروفیسر رہا۔ 1925ء سے ریٹائر ہونے تک رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز کا ڈائریکٹر رہا۔ 1976ء میں اس کی وفات ہوئی۔ ٹائن بی کی تصانیف کی تعداد کافی ہے لیکن اس کی مشہور کتاب "مطالعہ تاریخ" ہے۔

مطالعہ تاریخ میں ٹائن بی نے 26 تمدنوں کے عروج و زوال کی تاریخ لکھی ہے۔ ان میں وہ تمدن بھی ہیں جو ایک محدود مدت کے لیے وجود میں آئے اور پھر گم ہوگئے۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے انتہائی عظمت اور شان و شوکت اختیار کی۔ اس نے ان 26 تمدنوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1- بالکل ابتدائی تمدن

2- پرائمری تمدن جن میں مصری' سمیری اور انڈک (ہندوستانی) ہیں۔

3- ثانوی تمدن' جن میں بابلی' ہندوستانی' شامی' یونانی' اور چینی(شنگ زمانے کے) ہیں۔

4- اعلیٰ تمدن جن میں یہودیت' مجوسیت' ہندومت' اسلام اور عیسائیت شامل ہیں۔ یہ تمدن سابقہ تمدنوں سے متاثر ہوئے ہیں جیسے مجوسیت بابل سے' ہندومت انڈک سے' اسلام شامی سے اور عیسائیت یونانی تمدن سے۔

تمدن کیوں کر پیدا ہوتے ہیں؟ اور یہ کیوں کر ترقی کرتے ہیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ٹائن بی کہتا ہے کہ تمدن کی پیدائش یا ارتقاء کسی نسل کی برتری یا حالات کے سازگار ہونے پر نہیں۔ بلکہ تمدن سخت ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ سخت ماحول انسان کو چیلنج دیتے ہیں اور انسان اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ان کا جواب دیتا ہے۔ اس لیے یہ چیلنج ہمیشہ اندرونی طاقت اور نئی تخلیق کو پیدا کرتے ہیں۔ مصری' سمیری اور بابلی تمدنوں کی پیدائش انہیں سخت حالات میں ہوئی۔ انسان نے ارضی و سماوی آفات کا مقابلہ کیا۔ فطرت

سے جنگ لڑی اور اس فتح کے نتیجہ میں تمدن وجود میں آیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمدن نے ہمیشہ سخت حالات میں جنم لیا۔ اس لیے چین کا تمدن یانگ سی کی وادی میں پیدا نہیں ہوا جو زرخیز اور خوشگوار تھی بلکہ دریائے زرد کے کنارے پیدا ہوا جو سیلابی اور دلدلی علاقہ تھا۔

ٹائن بی کے نزدیک تمدن کا ارتقاء حیاتیاتی عمل نہیں کہ اس کی پیدائش کے بعد اس کی نشوونما بھی ہوگی تمدن کی بالیدگی اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ تمام چیلنجوں کا بھرپور جواب دیا جائے کیونکہ جو تمدن چلینج کا جواب نہ دے سکے وہ ختم ہوگئے اگر چیلنج سخت ہو اور اس کے جواب میں معاشرے نے اپنی تمام قوت خرچ کردی' تو اس میں اتنی قوت و طاقت ہی نہیں رہتی کہ وہ ترقی کرسکے۔ لہٰذا۔

1- تاریخ میں کچھ ایسے معاشرے گزرے ہیں جنہوں نے بالکل ترقی نہیں کی اور اسی حالت میں فنا ہوگئے جس میں انہوں نے جنم لیا تھا۔

2- کچھ ایسے معاشرے بھی تھے جنہوں نے فطرت کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیئے اور پھر خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کرلی۔

3- کچھ ایسے تمدن تھے جنہوں نے چیلنج کا موثر جواب دیا اور اس صورت میں انہوں نے انتہائی ترقی کی۔

اس سے ثابت ہوا کہ فطرت کی بے پناہ سختیاں آدمی کی جدوجہد کو ختم کردیتی ہیں اور معاشرہ ان سختیوں کے مقابلہ میں اپنی تمام طاقت اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں صرف کردیتا ہے اس کی مثال شمالی عرب کا معاشرہ اور مشرقی جزائر میں پولی نیشن تمدن ہے جو ترقی نہیں کرسکے اور اپنے ابتدائی دور ہی میں رہے۔

معاشرہ کی ترقی کی نشانی سیاسی وسعت' یا اعلیٰ فنی کارکردگی نہیں ہوتیں سیاسی وسعت تمدن کے دور انتشار میں ہوتی ہے۔ اگر تمدن کے نشوونما کے دور میں فنی ترقی ہو تو یہ اس کے لیے موت کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ ٹھہرے ہوئے تمدن

(Arrested civilization)

میں ہوا۔ فنی تخلیق نے ان کی تمام صلاحیتوں کو ختم کردیا اور معاشرہ اس کا غلام بن کر رہ گیا۔

تمدن کے ارتقاء کے لیے لطافت کا عمل یعنی سادگی' لباس' زبان' سائنس اور ٹیکنیک ضروری ہے کیونکہ اس میں کم طاقت صرف ہوتی ہے اور مادی وسائل کے کم استعمال سے

روحانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر سماجی و روحانی چیلنج زیادہ ہوتے ہیں اور مادی کمک ان چیلنجوں کے جواب کے بعد ارتقاء کا عمل معاشرہ کو خود ارادیت اور خود مختاری کا جذبہ دیتا ہے۔ اور معاشرہ روحانیت کی جانب ارتقاء کرتا ہے۔ مثلاً" یونانی تمدن نے جمالیات کی جانب' ہندوستانی تمدن نے مذہب کی جانب اور مغربی تمدن نے سائنس کی جانب توجہ دی اور ترقی کی۔

تمدن کی ترقی میں تخلیقی افراد اور تخلیقی اقلیت زبردست حصہ لیتی ہے۔ تخلیقی افراد وہ ہیں جنہیں انسان کامل' علوی انسان یا عبقری کہا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کی راہنمائی سے پہلے گوشہ نشینی اختیار کرلیتے ہیں۔ اور اس گوشہ نشینی کے دوران مسلسل عبادت اور ریاضت سے روحانی اور مادی طور پر اپنی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں جب ان کی شخصیت مکمل ہوجاتی ہے تو پھر یہ معاشرے میں واپس آتے ہیں یہ عمل ٹائن بی کے ہاں "گوشہ نشینی اور واپسی" کے نام سے ہے۔ جب یہ اپنا پیغام معاشرے کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ان کی شخصیت سے متاثر ہوکر معاشرے کی ذہین اقلیت ان کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ تخلیقی اقلیت معاشرے میں ذہنی انقلاب لاتی ہے۔ لیکن یہ گوشہ نشینی اور واپسی صرف شخصیتوں تک محدود نہیں بلکہ تمدن بھی اس عمل سے گزرتے ہیں۔ یونانی تمدن میں ایتھنز کی مثال ہے جس نے 8 اور 6 صدی ق۔ م میں نو آبادیات پر قبضہ کرنے میں حصہ نہیں لیا۔ اور یونان کی تمام سرگرمیوں' مہمات اور فتوحات سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ اس کے بعد ایتھنز اپنی یکجا قوتوں کے ساتھ میدان میں آیا اور پورے یونان کی راہنمائی کی۔ یورپی تمدن میں 13 ویں اور 15 ویں صدی میں اٹلی یورپ کے ہنگاموں سے دور رہا اور پھر تجارتی و صنعتی ملک بن کر ابھرا۔ یہی حال برطانیہ کا تھا جو 15 ویں سے 18 ویں صدی تک یورپ سے دور رہا اور اس دوران اس نے پارلیمانی جمہوریت کی پرورش کی اور معاشرے کو صنعتی بنیادوں پر استوار کیا۔ ٹائن بی کے نزدیک روس کی یورپ سے علیحدگی بھی اسی عمل کے تحت ہے جب اس کی ریاضت ختم ہوگی تو اس صورت میں وہ پھر واپس آکر یورپ کی راہنمائی میں بڑا حصہ لے گا کیونکہ اس گوشہ نشینی کے دوران یہ اپنے معاشرے کو پاک و صاف کرے گا۔ اپنی قوتوں کو اکٹھا کرے گا اور نئی زندگی و جذبہ سے میدان میں آئے گا۔

ٹائن بی کے نزدیک تخلیقی اقلیت تمدن کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور معاشرے کی اکثریت ان کی تقلید کرتی ہے۔ معاشرے میں ترتیب و تنظیم ان کی قوتوں کا

استعمال اسی تخلیقی اقلیت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ٹائن بی تمدن کے اس دور کی ایک اہم بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ترقی یافتہ معاشرہ یا تمدن بے جان ہونے لگتا ہے اور اس میں تعطل آنے لگتا ہے یا زندگی کی حرارت اور شدت کم ہوجاتی ہے تو اس وقت خارجی جھٹکے اسے پھر سے چونکا دیتے ہیں اور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سستی و کاہلی و بے حسی سے بیدار کرتے ہیں۔ مثلاً" جب تیمور نے بایزید کو شکست دی تو اس صدمہ سے عثمانیوں میں مایوسی و ناامیدی کے بجائے ایک نیا جوش و ولولہ پیدا کیا اور ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اپنی کمزوری کو ختم کرکے شکست کے بدنما داغ کو مٹائیں' چنانچہ سلطان محمد فاتح کے زمانے میں عثمانیوں نے ایک بار پھراپنی طاقت کو مستحکم کیا اس کی دوسری مثال اہل کار تھیج کی ہے جب انہوں نے پیونک جنگوں میں شکست کھائی تو اس نے پوری قوم کو بیدار کردیا اور نئے جذبہ کے ساتھ حلکار کی سربراہی میں اسپین کو فتح کرلیا اس کی تیسری مثال آسٹریا اور پروشیا کی ہے جب نپولین نے ان ملکوں کو فتح کیا تو انہیں اپنی سیاسی و فوجی کمزوریوں کا احساس ہوا۔ اور ان کے ہاں مختلف تحریکیں اٹھیں جنھوں نے آسٹریا اور پروشیا میں ذہنی و شعوری بیداری پیدا کی۔

اسی طرح بعض معاشرے خارجی دباؤ اور خارجی خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے ترقی کرتے ہیں۔ مثلاً" جب عثمانی ترک اناطولیہ میں آئے تو انہیں بلقان کی جانب سے حملہ کا خطرہ تھا۔ اس حملہ کے خطرہ نے انہیں اس قدر متحریک اور جاندار رکھا کہ انہوں نے آگے بڑھ کر مشرقی یورپ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن جو ترک وسط ایشیا میں آباد تھے چونکہ انہیں کوئی خارجی خطرہ نہ تھا اس لیے وہ اسی طرح رہے اور کوئی ترقی نہیں کرسکے۔

ٹائن بی تمدن کی ترقی کے بعد اس درجہ پر آتا ہے جس میں تمدن ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی صورت میں اس کی ترقی رک جاتی ہے۔ تمدن کیوں کر ٹوٹتا ہے۔ اور اس کی ترقی کیوں رک جاتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جب تخلیقی شخصیت اور تخلیقی اقلیت غلطی پر غلطی کرتی ہے اور چیلنج کا جواب نہیں دیتی اور خاموشی اختیار کرلیتی ہے۔ جب تخلیقی اقلیت میں فخر و غرور کے احساسات پیدا ہوجاتے ہیں۔ حکومت و اقتدار کی ہوس انہیں اندھا کردیتی ہے اور طاقت و ظلم کے ذریعے اپنے احکام منواتے ہیں تو ان کی ذہانت تعمیر کے بجائے تخریبی سرگرمیوں میں صرف ہونے لگتی ہے۔ عوام پرانی اقدار اور پرانے اداروں کی اندھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور شخصیت پرستی پر زور

دیا جانے لگتا ہے۔ اس مرحلہ پر عوام کے ایک حصہ کا تخلیقی اقلیت پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ اس سے بغاوت کا اعلان کردیتے ہیں۔ یہ طبقہ داخلی پرولتاریوں کا ہوتا ہے جو حالات سے مطمئن نہیں ہوتے اور اس میں تبدیلی چاہتے ہیں۔

کیا کوئی تمدن اس مرحلہ پر پہنچنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور فنا ہونے سے بچ سکتا ہے؟ یا اس کی تقدیر میں موت لکھی ہوئی ہے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ٹائن بی کہتا ہے کہ اگر فرقہ بندی اور اختلافات ختم کرکے اتفاق و اتحاد پیدا کیا جائے تو اس صورت میں زوال کا عمل رک سکتا ہے اور تمدن اپنی جگہ پتھر کی طرح جامد ہوکر صدیوں اسی حالت میں قائم رہ سکے گا۔ تمدن کے ایک جگہ جم جانے اور ٹھہرنے کو ٹائن بی (Petrification) کہتا ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر زوال کو روکنا ناممکن ہے۔

جب تمدن ٹوٹنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد زوال کے آخری اسٹیج پر آتا ہے تو اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں سب سے پہلے اندرونی پرولتاری معاشرے کے استحکام کو ختم کرکے اس میں نااتفاقی پیدا کردیتے ہیں۔ اس کے بعد زوال پذیر معاشرے سے اور تمدن سے بھی وہ بغاوت کرتے ہیں جو معاشرے میں نہیں ہوتے۔ لیکن تمدن کے اثر سے جکڑے ہوتے ہیں۔ (ان کی اپنی کوئی اعلیٰ و ارفع تہذیب یا تمدن نہیں ہوتا) زوال کے دوران ان پر سے تمدن کے سحر اور افسوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اور وہ بھی اس سے بغاوت کرکے اس کی تباہی کے در پے ہوجاتے ہیں یہ طبقہ "خارجہ پرولتاریوں" کا ہوتا ہے۔

زوال پذیر تمدن سے روحانی اقدار بھی ختم ہوجاتی ہے اور ان کی زندگی سے حرارت وگرمی نیست و نابود ہوجاتی ہے۔ اس وقت معاشرے کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں۔

1- قدامت پرستی اختیار کریں اور پرانے مذہب، آرٹ، فن، زبان اور پرانی اقدار کو اسی طرح برقرار رہنے دیں اور کسی تبدیلی و تغیر کو قبول نہ کریں۔

2- یا تمام قدیم روایات اور اقدار کو ترک کردیں۔ نئے مسائل اور چیلنج کا موثر جواب دیں اور نئے تجربوں کے ساتھ سیاست، معیشت اور آرٹ میں تبدیلی کریں۔

3- اور یا راہ فرار اختیار کریں مایوس و ناامید ہو کر جدوجہد ترک کردیں اور سکون و اطمینان سے موت کا انتظار کریں۔

اس موقع پر ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ جو خوش فہمی میں پناہ لیتا ہے اور اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ہم خدا کی پسندیدہ مخلوق ہیں اور ہمارا زوال ہمارے گناہوں کی سزا ہے،

لیکن مستقبل میں خدا ہماری حالت بدلے گا اور تباہی و بربادی سے بچائے گا۔

زوال پذیر تمدن مصیبتوں اور کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے جس میں مسلسل سماجی اور معاشرتی نظام رہتا ہے۔ ریاستوں میں آپس میں خوں ریز جنگیں ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آخر کار ان میں سے ایک طاقت کامیاب ہوتی ہے تو اس وقت عوام کی دو خواہشیں ہوتی ہیں۔ امن و امان اور جان و مال کا تحفظ۔ ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ایک مضبوط عالمی ریاست قائم ہوتی ہے جس میں اقتدار اقلیت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور یہ اقلیت ناراض و باغیِ داخلی و خارجی پرولتاریوں پر طاقت و قوت سے حکومت کرتی ہے۔ درحقیقت عالمی ریاست کا قیام داخلی و خارجی پرولتاریوں کے جواب میں ہوتا ہے جو اقلیت کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے لیکن پرولتاری اس ریاست کی تشکیل سے مطمئن نہیں ہوتے اس لیے وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے نظریات اور نئے مذاہت کو فروغ دیتے ہیں۔ اس طرح سے پرولتاری' بااقتدار اقلیت کو چیلنج کرکے عالمی چرچ قائم کرتے ہیں اس کے بعد عالمی ریاست کو نیست و نابود کرنے کی خاطر داخلی و خارجی پرولتاری جنگ جو دستے قائم کرتے ہیں جو کسی مہم جو شخصیت کی راہنمائی میں عالمی ریاست کی سرحدوں پر حملہ کرتے ہیں۔ آخر عالمی ریاست اور بااقتدار اقلیت ان جنگ جو دستوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ عالمی ریاست ان کا جواب نہیں دے سکتی۔ اس لیے تمدن موت کی آغوش میں روپوش ہوجاتا ہے۔

تمدن کی اس موت کے بعد معاشرہ پھر سے قدیم طریقہ زندگی کو اختیار کرلیتا ہے یہاں تک کہ ایک نیا تمدن ابھرتا ہے یہ دور "درمیانی زمانہ" کہلاتا ہے۔ جو دو تمدنوں کے درمیان کا ہوتا ہے ایک مردہ اور دوسرا آنے والا۔ اس دوران میں غیر مہذب قبائل آزادانہ زندگی گزارتے ہیں۔ جنگ جو سردار ان پر حکومت کرتے ہیں۔ بہت سے تمدن اس درمیان درجہ میں فنا ہوجاتے ہیں لیکن پرانے تمدن کی خاکستر سے ایک نیا تمدن ابھرتا ہے۔

تمدن کی پیدائش' ترقی' اس کا ٹوٹ جانا اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا اس تجزیہ کے بعد ٹائن بی مغربی تمدن کا جائزہ لیتا ہے کہ یہ کس دور میں ہے اور کیا اس کا زوال شروع ہوچکا ہے؟ ٹائن بی مغربی تمدن کو زوال پذیر ہوتے دیکھ رہا ہے۔ اندرونی تفرقات' اقلیت کا غلبہ' داخلی و خارجی پرولتاریوں کی بے چینی' مذہب کا زوال' سماجی اقدار کا خاتمہ' یہ وہ مسائل اور مشکلات ہیں جن سے مغربی تمدن برسرپیکار ہے۔ صنعتی و مادی ترقی نے روحانی

اقدار کو مٹا دیا ہے۔ جمہوریت نے ثقافت، آرٹ، فن اور سیاست کو عوامی بنا کر اس کی بلندی اور گہرائی کو ختم کردیا ہے اور اس میں سطحیت پیدا کر دی ہے۔ کیمونزم نے مزید مغربی تمدن کی مضبوط عمارت میں شگاف ڈال دیئے ہیں۔

تو کیا اس صورت حال میں مغربی تمدن بھی دوسرے تمدنوں کی طرح ختم ہوجائے گا؟ کیا اس کی تقدیر میں بھی فنائیت لکھی ہے؟ ٹائن بی اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی تمدن کی تقدیر اٹل اور فیصلہ کن نہیں ہوتی اس لیے یہ ہماری طاقت اور اختیار میں ہے کہ ہم مغربی تمدن کو بچا سکیں۔ اس کے تحفظ کی صورت یہ ہے کہ مغربی تمدن کو آفاقی تمدن بنا دیا جائے اسے انسانیت کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ لہٰذا اس صورت میں وہ سب کچھ اختیار کرلیا جائے جو دوسرے تمدنوں میں بہتر اور تعمیری ہے۔ ہمیں چاہئے کہ سقراط، افلاطون، زرتشت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، پیٹر، پال اور ابن خلدون وغیرہ ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے ہم آہنگی پیدا کریں۔

اس صورت میں یہ آفاقی تمدن پوری انسانیت کو اپنے دامن میں پناہ دے گا۔ ٹائن بی مستقبل سے بڑا پرامید ہے۔ اس کا یقین ہے کہ اگر تمدن کے ذریعے عالمی حکومت قائم کی جائے اور دنیا کے چار عظیم مذاہب اور ان کی خصوصیات کو یک جا کر دیا جائے تو اس صورت میں انسانیت تباہی سے بچ سکتی ہے۔ اس لیے ہندومت کی فکر، عیسائیت کی جذباتیت (FEELINGS) اسلام کی حساسیت (SENSATIONS) اور بدھ مت کی وجدانیت کو ملا کر عالمی معاشرے کی تشکیل کی جائے۔

ٹائن بی کے نزدیک یہ انسانیت کے تحفظ اور بقا کی امید ہے۔

ول ڈیوارنٹ

ول ڈیورانٹ نے اعلیٰ تعلیم کولمبیا یونیورسٹی' نیویارک میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ صحافت کا پیشہ اختیار کیا' پھردرس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور فلسفہ پڑھاتا رہا۔ 1927ء میں اس نے ملازمت ترک کردی۔ اور "تمدن کی کہانی" لکھی شروع کی جو 11 جلدوں میں ختم کی۔ آخر میں اس نے تاریخ کے مطالعہ کا نچوڑ (LESSONS OF HISTORY) "تاریخ کے اسباق" میں لکھا۔

ول ڈیورانٹ کی "تمدن کی کہانی" ہماری مشرقی میراث سے شروع ہوکر عہدہ نپولین تک گیارہ ضخیم جلدوں میں ختم ہوتی ہے۔ یہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور ترقی کی ایک دل فریب متحرک تصویر ہے۔ چار ہزار سال کی طویل مدت میں انسان نے جن پیچ در پیچ راستوں سے سفر کیا۔ جن کٹھن مقامات سے کاروان تہذیب کو گزارا اور جن مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرکے ذہن و شعور کو جلا بخشی انسان کی یہ کہانی ہزار ہا صفحات پر بکھری ہوئی ہے اور یہ انسان ہر رنگ' روپ اور حلیہ میں متحرک و باعمل نظر آتا ہے۔ سخاوت و فیاضی' شرافت و نیکی کے مجسمے' تنگ نظری بخل و عیاری کے نمونے' جرات و بہادری اور شجاعت کے متوالے تو بزدلی و مکاری اور دھوکے بازی کے رسیا' ایسا انسان ہر رویے اور ہر پہلو سے اس میں جلوہ گر ہے۔ یہاں شاعر' ادیب' فلسفی' مورخ' سنگ تراش' مصور' موسیقار اور مغنی ہیں تو ان کے ساتھ تلوار لیے جیالے سپاہی' جنرل اور مطلق العنان بادشاہ اور ان کے خوشامدی امراء بھی ہیں۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ انسانی تہذیب کے عروج و زوال' ارتقاء و ترقی' نشوونما اور موت کی جس کی ابتدا ضرور ہیں لیکن انتہا کوئی نہیں۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کا انجام کوئی نہیں۔ انسان کی یہ کہانی بڑی سبق آموز ہے کیونکہ یہ انسانی تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں اور ان کے تجربات و مشاہدات کا ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ کیا تاریخ کا یہ طویل سلسلہ انسان کے مستقبل کے لیے افادیت کا حامل ہوسکتا ہے؟ کیا تاریخ آج کے سائنسی دور میں انسان کی منزل متعین کرسکتی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ول ڈیورانٹ نے "تاریخ کے اسباق" میں دیا ہے۔

ول ڈیورانٹ تاریخ اور ارضیات کے باہمی رشتہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب

تاریخ اور ارضیات کے باہمی تعلق اور رفتار کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دریا' پہاڑ' سمندر' صحرا' ریگستان اور نخلستان کے درمیان ابھرتا ہوا انسان مسلسل جدوجہد اور سعی پیہم میں نظر آتا ہے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی گہرائیوں اور فطرت کے راز اس کے لیے کوئی راز نہیں رہے۔ اس نے زمین کے چپہ چپہ کو مسخر کرلیا وہ زمین کے سینے کو چیرتا ہے' غلہ اگاتا ہے' زمین کی گہرائیوں میں جاتا ہے۔ معدنیات کے ذخیروں کو دریافت کرتا ہے۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمین کا مالک و مختار ہے۔ لیکن دوسری جانب انسان اپنی تمام صلاحیتوں' قوتوں اور ذہانت کے باوجود فطرت کے مقابلہ میں کمزور بے کس نظر آتا ہے۔ اس کی صدیوں کی محنت و مشقت سے تعمیر شدہ خوبصورت شہر' خوبصورت عمارتیں' وسیع و عریض و بلند و بالا محلات آن واحد میں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر زمین کے برابر ہوجاتے ہیں اور انسان کا فخر و غرور اس کی کاریگری سب خاک میں مل جاتی ہیں۔ انسان فطرت کے مقابلہ میں ناکام ہوا ہے فطرت اپنی رحمتوں سے اور اپنی بلاؤں سے انسان کو مسرور و ہراساں رکھتی ہے۔ آج بھی انسان کی جسمانی و ذہنی ساخت کا دارو مدار فطرت کے حالات پر ہے۔ اگر کسی علاقہ میں بارش کم ہو تو پورا علاقہ بنجر اور ریگستان ہوجاتا ہے اور اس بنجر علاقہ سے تہذیب ختم ہوجاتی ہے۔ جیسے وسط ایشیا میں' لیکن اگر بارش زیادہ ہو تو تہذیب گھنے جنگلوں میں روپوش ہوجاتی ہے' جیسے وسطی امریکہ میں۔

تاریخ اور جغرافیہ کا ربط و ضبط بڑا گہرا اور قدیم ہے کیونکہ سمندر' دریا' چشمے' تالاب' شہروقصبے' ذرائع آمدورفت ان سب کا تعلق جغرافیہ سے بھی ہے اور انسان کے ذہن و جسم سے بھی۔ انسان طبعی' جغرافیہ کی حدود میں علیحدہ قوموں اور نسلوں کی شکل میں رہتا ہے۔ یہ پہاڑ' دریا اور سمندر اس کے علاقے کی فطری حدیں ہیں۔ علیحدہ علاقے میں رہنے کی وجہ سے آب و ہوا اور ماحول اس کی جسمانی ساخت' رنگ' عادات و اطوار اور لباس کو بھی جدا کردیتا ہے۔ لیکن رنگ و نسل' لباس و عادات و عقیدہ اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک انسان دوسرے انسان کا' ایک قوم دوسری قوم کی اور ایک نسل دوسری نسل کی محتاج رہتی ہے انسانی ایجادات اور علم نے ان جغرافیائی حدوں کو ختم کردیا ہے۔ زراعت اور صنعت و حرفت نے انسان کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں سب سے زیادہ مدد دی ہے۔

جغرافیائی حالات کا تہذیب و تمدن کی سرگرمیوں پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہر بڑے دریا

کی وادی تہذیب و تمدن کا گہوارا اور مرکز رہی ہے اور ان دریاؤں کے کنارے انسانی آبادیاں بڑھتی اور پھیلتی قوم اور ملک میں تبدیل ہوگئیں جیسے نیل کے کنارے مصر' ڈینوب کے کنارے آسٹریا' ایلبا اور رائن کے کنارے جرمنی' سین اور رھون کے کنارے فرانس۔

جب یونانیوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس مقصد کے لیے انہوں نے بحر روم کا علاقہ پسند کیا جو اپنی خوش گوار آب و ہوا کی وجہ سے 480 ق - م 1588ء تک مغربی اقوام کا میدان جنگ رہا۔ 1491ء میں جب کولمبس اور واسکوڈے گاما نے سمندروں کو تسخیر کیا تو اٹلانٹک کا علاقہ انسانی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔

مستقبل میں یہ جغرافیائی حالات انسان کی ترقی میں کیا حصہ لیں گے؟ اس کا جواب ول ڈیورانٹ یہ دیتا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسانی ہوائی سفر میں بلندی تک پہنچ جائے' اس وقت یہ سمندر' جہاز اور بندرگاہیں متروک ہوجائیں گی اور اس وقت وہ قومیں بھی میدان عمل میں آئیں گی جو اب تک قدرتی بندرگاہوں سے محروم ہیں۔ مستقبل میں قوموں کے درمیان صنعت و حرفت اور تجارت میں زبردست مقابلہ ہوگا۔ اور یہ مقابلہ تاریخ میں ایک عظیم انقلاب کی بنیاد رکھے گا۔

حیاتیات کا مطالعہ تاریخ کے نظریہ میں اہم اضافہ کرتا ہے کیونکہ حیاتیات اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ انسان کا ارتقاء کس طرح عمل میں آیا؟ اور اس ارتقاء کے دوران جدوجہد کش مکش' تصادم اور مقابلہ کے نتیجہ میں کمزور کا خاتمہ اور طاقت ور کا وجود' یہ سب کس طرح ترتیب شدہ قوانین کے تحت ہوا۔ اس مطالعہ کے بعد تاریخ کو یہ سبق ملتا ہے کہ انسانی زندگی ایک مسلسل مقابلہ کا نام ہے۔ اپنے وجود' زندگی اور بقا کے لیے زبردست اور سخت مقابلہ ضروری ہے۔ انسان کی فطرت میں خوں ریزی رچی ہوئی ہے۔ وہ امن صرف اس وقت قبول کرتا ہے جب غذا وافر ہو' ورنہ جس طرح ایک جانور دوسرے جانور کو بھوک کی شدت میں کھا جاتا ہے اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کے خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ انسان کی فطرت میں لالچی' خود غرضی' لوٹ کھسوٹ اور طمع شامل ہیں۔ یہ اسے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں کیونکہ انسانی تاریخ کے ہر دور اور زمانہ میں انسان نے اپنے وجود کی خاطر' اپنے آرام و آسائش کی خاطر' اپنے مفاد اور فائدے کی خاطر' اپنے مقابل انسان کو حیلے اور حربے سے ختم کیا ہے۔ اس کے خون سے اپنی زندگی کو

تازگی اور حرارت بخشی' اس لیے جنگ و جدل' قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے پس منظر میں انسان کا مقصد غذا حاصل کرنا' اقتصادی خوش حالی اور معاشی برتری شامل ہیں۔ کیا انسان جنگ و جدل سے باز آسکتا ہے؟ ول ڈیورانٹ کے نزدیک یہ جب ہی ہوسکتا ہے جب قومیں' ریاستیں اور ملک ایک دوسرے سے باہمی طور پر منسلک ہوجائیں۔ اپنے مفاد کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کردیں۔ اپنی ضروریات' خواہشات اور احتیاجات کو محدود کردیں اگر ایسا نہیں ہوا تو جنگ ہوتی رہے گی۔ انسان ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے گا اور خون و آگ کی ہولی کھیلی جاتی رہے گی۔ یہ اندوہناک سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

حیاتیات کا دوسرا سبق یہ ہے کہ زندگی ہزار ہا جدوجہد اور سعی و مشقت کے بعد وجود میں آتی ہے۔ اس لیے اس کو باقی رکھنے کے لیے بھی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ زندگی میں ہر طرف مقابلہ ہے۔ خوراک کے لیے بھی اور طاقت کے لیے بھی۔ کچھ اس مقابلہ میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور کچھ ناکام' جو کامیاب ہوتے ہیں وہ دنیا کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں جبکہ ناکام لوگوں کے لیے یہ وسیع و عریض دنیا اور اس کی نعمتیں خواب ہوتی ہیں۔ ان کا وجود اس سرزمین پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اور وہ ہزار ہا حسرتیں اور محرومیاں لیے اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ فطرت کچھ کو نعمتوں سے نوازتی ہے اور کچھ کو محروم رکھتی ہے؟ ول ڈیورانٹ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ فطرت تمام انسانوں کو مساوی طور ذہنی و جسمانی صلاحیتیں دے کر پیدا نہیں کرتی۔ ہر شخص جسمانی' ذہنی اور شعوری طور پر جدا ہوتا ہے۔ انسانوں میں یہ فرق اور امتیاز ایک فطری عمل ہے۔ ذہین افراد اور اپنی ذہانت اور صلاحیت سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ پھر اس طاقت سے مزید طاقتور بنتے ہیں۔ جبکہ کمزور' کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے قدرت ذہانت کی تقسیم میں بہت بخیل ہے۔ ہر معاشرہ میں صرف % 30 ایسے ذہین افراد ہوتے ہیں جو معاشرے کے پورے ذہنوں کے برابر ہوتے ہیں۔

آزادی اور مساوات ساتھ مل کر نہیں رہ سکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی مخالف اور دشمن ہیں۔ جب ایک آتی ہے تو دوسری چلی جاتی ہے جب آدمی آزاد ہوتا ہے تو وہ معاشرے میں امتیاز اور تفریق پیدا کرتا ہے۔ جیسے امریکہ اور برطانیہ میں 19 ویں صدی میں آزاد تجارت کی پالیسی کے بعد ہوا۔ جب معاشرے میں طبقاتی تقسیم کو روکنے کے لیے

مساوات قائم کی جاتی ہے تو آزادی کو قربان کیا جاتا ہے۔ اس وقت ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جیسے روس میں۔ وہ لوگ جو معاشی طور پر غیر مستحکم ہوتے ہیں وہ مساوات چاہتے ہیں اور جو ذہین ہوتے ہیں وہ آزادی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ حیاتیات کا تیسرا سبق یہ ہے کہ زندگی مسلسل تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ فطرت اس معاملہ میں اس لیے اس قدر سخی ہے کہ تاکہ ذی حیات جہدالبقا میں شریک ہوسکیں اور اس تصادم اور کش مکش کے نتیجہ میں ذہین اور طاقت ور اشخاص ابھریں فطرت ان ہی کا انتخاب کرتی ہے۔ جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہتے ہیں کمزور، نحیف اور ناتواں اس جنگ میں شکست خوردی کے ساتھ موت سے ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔

فطرت اس بات کا بھی خیال رکھتی ہے کہ غذا کا توازن برقرار رہے اس لیے قحط وبا اور جنگ آبادی کو گھٹانے میں حصہ لیتے ہیں۔ اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے مال تھس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر فطرت ان ذرائع سے آبادی کو کم نہیں کرتی تو پیداوار کسی بھی صورت میں بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی اور انسانیت بحران کا شکار ہوجاتی لیکن اس کے برعکس تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کچھ ممالک اپنی ضرورت سے زیادہ غلہ پیدا کرتے ہیں اور دوسرے ملکوں کو بھیجتے ہیں جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مال تھس اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ مصیبت اور غذا کے بحران کو روکنے کا ایک وقتی طریقہ ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ زمین کی یہ صلاحیت کب تک باقی رہے گی کیونکہ جس طرح ہر شے ایک مرحلے پر پہنچ کر اپنی قوت و طاقت سے محروم ہوجاتی ہے اسی طرح زمین بھی ایک وقت اپنی زرخیزی ختم کردے گی۔ پیداوار گھٹے گی۔ غلہ کمیاب ہوگا اور ضروریات بڑھیں گی تو اس وقت کیا ہوگا؟ کیونکہ موجودہ سائنسی ترقی نے انسانی زندگی کو طویل کر دیا ہے۔ شرح اموات میں کمی ہوگئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اب زیادہ عمر تک زندہ رہتا ہے اور معاشرہ میں ایسے ناکارہ افراد کی بہتات ہوگئی ہے جن کے قوای مضمحل اور قوت مفقود ہے اور جو دواؤں کے سہارے زندگی کو طول دے رہے ہیں۔ اس لیے اس بڑھتی ہوئی آبادی کا کیا حل ہے؟ ول ڈیورانٹ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ صرف برتھ کنٹرول کے ذریعہ ہم افراد اور غذا میں تواز برقرار رکھ سکتے ہیں اور صرف اس طریقہ سے آبادی کو گھٹایا جاسکتا ہے۔ اور یہی ایک طریقہ متوازن اور آئیڈیل معاشرے کے لیے ضروری ہے۔

دنیا کی تاریخ اور اس میں مختلف رنگ و نسل کے افراد و معاشروں کی جدوجہد اور

اس جدوجہد کے نتیجہ میں تہذیب و تمدن کی تخلیق و ارتقاء و ترقی سے اس جذبہ کا پیدا ہونا کہ وہ دوسری قوموں سے افضل ہیں ان کی تہذیب اور تمدن دوسروں سے اعلیٰ ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ اس وقت دنیا میں بیس کھرب غیر سفید فام باشندے اور دس کھرب سفید فام افراد ہیں۔ دنیا کی ہر قوم خود کو اور اپنی تہذیب و تمدن کو دوسروں سے بہتر قرار دیتی ہے۔ چینوں کے قول کے مطابق ان کی تہذیب دنیا میں سب سے ارفع و اعلیٰ ہے کیونکہ انہوں نے 2 ہزار قبل مسیح سے آج تک لاتعداد سیاستداں' فلسفی' آرٹسٹ' موجد' شاعر اور سائنسداں پیدا کیے ہیں۔ میکسی کن اپنی مایا اور ایزٹک تہذیبوں پر فخر کرتے ہیں۔ ہندو اپنے معماروں شاعروں اور سنگ تراشوں کو سب سے اعلیٰ گردانتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی بھی ایک قوم یا اس کی تہذیب سب سے اعلیٰ نہیں کیونکہ تاریخ کی نظر میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں۔ کوئی ایک نسل تہذیب کو تخلیق نہیں کرتی' بلکہ تہذیب نسلوں کی تعمیر کرتی ہے اور کئی نسلیں باہمی میل جول اور یگانگت سے نئی تہذیب و اقدار کو پیدا کرتی ہیں۔ جیسے کیلٹ (CELTS) رومی انگلز (ANGLES) جٹس (JUTS) ڈین اور نارمنوں نے مل کر انگریزی قوم کو بنایا۔ جب اس ملاپ سے قوم تشکیل پاتی ہے تو تہذیب و تمدن میں نئے پہلوؤں کا اضافہ ہوتا ہے اور اس کے اثر سے قوم کا کردار' اخلاق' ادب' ثقافت' فن آرٹ اور مذہب سب کچھ بدل جاتا ہے۔

امریکی تہذیب اسی نسل و رنگ کے امتزاج اور ملاپ کے عمل سے وجود میں آئی۔ 1700ء سے 1848ء تک شمالی فلوریڈا میں انگریز آباد تھے۔ اس لیے ان کی تہذیب و ثقافت انگریزی تھی۔ لیکن جب 1848ء میں یورپ کی دوسری سفید فام اقوام آئیں تو اس نسلی خلط ملط سے ایک نئی قوم تشکیل ہونا شروع ہوئی اس کی تکمیل صدیوں جاکر ہوگی اور جب یہ عمل پورا ہوجائے گا تو اس وقت امریکہ ایک نئی قوم' تہذیب' زبان ادب اور آرٹ کا مالک ہوگا۔

قوموں میں باہمی نفرت' عداوت اور دشمنی کی وجہ نسلی امتیاز ہے۔ اس کے علاوہ زبان' لباس' عادات و اطوار' کردار اخلاق و مذہب اس نفرت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ نفرت اس قدر گہری اور مضبوط ہے کہ اسے جڑ سے نکالنا ناممکن ہے۔ اسے صرف کم کیا جاسکتا ہے۔ یا دبایا جاسکتا ہے اور وہ بھی صرف تعلیم کے ذریعے۔

کیا تاریخ کے اس طویل سلسلہ میں انسان کی ذہنیت بھی بدلی؟ یا اس میں کوئی انقلابی تبدیلی آئی؟ ول ڈیورانٹ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ یونانی زمانہ قدیم میں جس رکھ رکھاؤ کے حامل تھے آج فرانسیسی اس کی مثال ہیں۔ رومیوں کے طور طریق انگریزوں میں نظر آتے ہیں۔ تہذیب کا بنیادی مقصد اسی طرح برقرار رہتا ہے اس کی گہرائی میں جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ اسی طرح زندہ رہتی ہے۔ وہ شکلوں' اجسام' طور طریق اور رکھ رکھاؤ کو بدلتی رہتی ہے۔ تہذیب کی روایات اور قدریں اندر ہی اندر رواں دواں رہتی ہیں اور زمانہ کی رفتار کا ساتھ دیتی ہیں۔

انسان کی فطرت میں کوئی تبدیلی اور تغیر نہیں ہوا اس کی فطرت میں جو لوٹ کھسوٹ' چھین جھپٹ' جنگ و جدل' قتل و غارت گری یا حفاظت کے پیش نظر معاشرتی و اجتماعی طریقہ زندگی وہ اسی طرح موجود ہے تاریخ کے ہر دور میں امیر و غریب کی جنگ معاشرہ کا اہم واقعہ رہی ہے۔ تاریخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی رہی ہے کہ جب مظلوم قوت و طاقت کا مالک بنتا ہے تو بھی ان ہی طریقوں اور ذریعوں کو اختیار کرتا ہے جن سے اس نے بغاوت کی تھی۔ اقتدار و طاقت کا نشہ' انتقام کا جذبہ اور اقتدار کی حفاظت اسے بھی ظالم بنا دیتی ہے۔ امیر و غریب' ظالم و مظلوم اور طاقت ور و کمزور بدلتے رہتے ہیں اور انسان اس تصادم اور جنگ میں قربان ہوتا رہتا ہے۔

معاشرے میں عظیم شخصیتوں اور ذہین افراد کا وجود اچانک نہیں ہوتا۔ حالات و واقعات حادثات اور وجوہات جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اسباب بنتے رہتے ہیں۔ جب ماحول سازگار ہوتا ہے تو اس وقت معاشرہ کے ہیرو' شعلہ بیاں مقرر اور عظیم رہنما ابھرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے تاریخ کے دھارے بدل دیتے ہیں۔ نپولین' چرچل' مورس' فورڈ اور لینن یہ سب ہزار ہا اسباب و علل کے طور پر ظہور میں آئے۔ ان کی کامیابی کا دارومدار بھی حالات سازگار ہونے پر تھا۔ لیکن کوئی ایک آدمی ایک زندگی میں اس قدر باصلاحیت' طاقت اور قوی نہیں ہوسکتا کہ وہ تنہا تہذیب و تمدن میں انقلاب لائے یا روایات و اقدار کو بدل دے۔ تہذیب کی نشو و نما اور ترقی صدیون کے عمل کے بعد ہوتی ہے۔ اس میں ہزار ہا افراد اور نسلیں اپنی ذہانت' محنت و مشقت اور اپنا خون دیتی ہیں اگر اس کی تکمیل ایک فرد سے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ صدیوں کا عمل اس نے تنہا پورا کیا۔ اس لیے تہذیب و تمدن یا روایات و اقدار کی تکمیل انفرادی طور پر نہیں' اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔

ایک روایت دوسری بروایت کی جگہ لیتی ہے ایک قدیم ہوجاتی ہے تو اس کی جگہ لینے کے لیے جدید آگے بڑھتی ہے۔ قدیم و جدید کا یہ تصادم چلتا رہتا ہے۔ قدامت پسند جو قدیم روایات میں جکڑے ہوتے ہیں ان کے لیے ہر نئی چیز اور تبدیلی ایک ضرب کاری ہوتی ہے۔ جو ان کے ماحول اور ان کی زندگی کے سکون اور ٹھہراؤ کو تباہ کرنے کے لیے ہوتی ہے جب کہ نئی نسل باغی اور انقلابی ہوتی ہے۔ وہ پرانی اور قدیم روایات کو ذہنی طور پر قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر نقش کہن کو مٹانے پر تلے ہوتے ہیں۔ اس تصادم کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نہ تو پرانی اقدار ایک دم ختم ہوتی ہیں کیونکہ ان کے پس منظر میں پوری تاریخ ہوتی ہے اور ان کی جڑیں مضبوط اور گہری ہوتی ہیں اور نہ ہی اقدار اچانک اپنا تسلط جماتی ہیں کیونکہ ان کی مدد کے لیے سوائے جذبات کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے نئے خیالات و افکار اور اقدار جب تک مخالفت کی بھٹی میں پک کر پختہ نہیں ہوجاتے اس وقت تک ان میں مضبوطی پیدا نہیں ہوتی۔ نئی اقدار کا مخالفت کی بھٹی میں پکنا اذیت ناک عمل ہے لیکن ہر نئی اور جدید چیز کو اس عمل سے گزرنا ضروری ہے اس کے بعد ہی اس میں پختگی آتی ہے اور اسے معاشرہ میں مقام ملتا ہے۔ اس تصادم کے نتیجہ میں دونوں جانب سے تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جو معاشرے کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی قوانین اٹل نہیں ہوتے بلکہ ان کا مفہوم ہر دور میں حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ انسان جب وحشت و بربریت کے دور میں تھا تو اس وقت اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے پیچھا کرنا' لڑنا' مارنا اور چھین جھپٹ کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ مرد کو زندگی کی اس جدوجہد میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ اس لیے عورتوں کے مقابلے میں وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہتا تھا اسی وجہ سے ایک مرد زیادہ عورتیں رکھتا تھا اور نسل کو بڑھا کر اپنی طاقت میں اضافہ کرتا تھا جب انسان شکاری دور سے کاشتکاری کے دور میں آیا تو پرانی نیکیاں گناہوں میں بدل گئیں۔ محنت و مشقت' پابندی اوقات اور امن و امان نے زندگی میں مقام حاصل کرلیا۔ اولاد معاشی و اقتصادی نقطہ نظر سے دولت قرار پائی' برتھ کنٹرول غیر اخلاقی اور غیر دانشمندانہ عمل ٹھہرا۔ باپ خاندان کا سربراہ ہوا اوراس کی طاقت و اثر کا دارومدار معاشی ضروریات پر تھا۔ لڑکا 15 سال کی عمر میں عملی زندگی میں قدم رکھ کر زمین ہل اور عورت کی خواہش کرتا تھا۔ اس لیے کم عمری میں شادی کا رواج ہوا۔ اس دور میں عورتوں اور مردوں کا تناسب برابر کا تھا۔ اس لیے مرد ایک شادی کرتا تھا۔

کاشتکاری کی یہ روایات اور قدریں 1500ء برس تک یورپ میں رائج رہیں۔

صنعتی انقلاب نے معاشرہ کا سماجی و اخلاقی ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا۔ مرد اور عورت میں مساوات قائم ہوئی۔ مرد کی برتری کا جذبہ ختم ہوا اور عورت بھی زندگی کے ہر میدان میں اس کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو عمل پذیر ہوئی۔ انسان کی جگہ مشین نے لے لی۔ مشینی دور نے زندگی میں مزید پیچیدگیاں پیدا کیں اس کا اثر معاشرے کی قدروں اور روایات پر ہوا۔ اولاد معاشی لحاظ سے خاندان کے لیے دولت اور نعمت نہیں بلکہ مصیبت بن گئی۔ کم عمری کی شادی ختم ہوئی۔ ماں باپ کی سربراہی نے بھی دم توڑ دیا۔ زندگی کی تلخیوں اور نئی تعلیم نے مذہب کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں۔ قدیم اخلاق اور قدیم اقدار و روایات ختم ہوئیں تاریخ کے ایک دور کی برائی دوسرے دور کی نیکی بن گئی۔ انسان کے یہ گناہ اور اس کی یہ برائیاں اس کے عروج و ترقی کی نشانیاں بن کر رہ گئیں۔

موجودہ دور میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ پر ہر طرف سے احتجاج ہے لیکن تاریخ میں یہ اخلاقی گراوٹ ہر دور میں رہی ہے۔ اور اس پر اسی طرح پرزور احتجاج بھی ہوتا رہا ہے جب لوتھر وٹن برگ یونیورسٹی میں تھا تو اسے نوجوان لڑکیوں سے شکایت تھی جو لڑکوں سے آزادانہ جنسی میل جول رکھتی تھیں۔ جب نینوا کی کھدائی ہوئی تو اس میں سے جوا کھیلنے کا پانسہ نکلا' اخلاقی گراوٹ اور برائیوں کا وجود بہت قدیم ہے۔ عیاشی' جنسی بے راہ روی اور بے ایمانی' یہ ہمیشہ ہر معاشرہ میں رہتی ہے۔ اسی لیے والیٹر نے تاریخ کو جرائم' بے وقوفیوں اور آفتوں کا مجموعہ قرار دیا لیکن ان جرائم اور عیاشیوں کے پس منظر میں اکثریت ان لوگوں کی رہی ہے جنھوں نے ایمانداری' محنت و مشقت سے زندگی گزاری۔ اس لیے موجودہ اخلاقی تنزل ہمارے معاشرے اور قوم کے زوال کا باعث نہیں بلکہ موجودہ اخلاقی گراوٹ کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ دور کاشتکاری سے جب صنعتی دور میں داخل ہوا تو اس نے قدیم روایات اور اقدار پر کاری ضرب لگائی یہ اقدار جنھیں ہم نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ عبوری دور سے گزر کر جب پختگی تک پہنچیں گی تو یہ معاشرے کے لیے قابل قبول ہوں گی۔

ابتدائی دور میں مذہب نے اخلاق پر کوئی اثر نہیں ڈالا' کیونکہ انسان نے ڈر اور خوف سے دیوتاؤں کو تخلیق کیا تھا۔ اس کے لیے یہ سمندر' دریا' پہاڑ درخت ہوا اور آسمان سب ناقابل فہم اور پراسرار تھے۔ اس لیے اس نے ہر اس چیز کی پرستش شروع

کردی جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ فطری بلاؤں اور آسمانی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے نذرانے اور قربانی دی۔ دیوتاؤں سے مدد کے لیے دعائیں مانگیں۔ جب آگے چل کر مذہب کے پجاریوں کی جماعت پیدا ہوئی تو انہوں نے دیوتاؤں کے خوف سے کام لیتے ہوئے افراد کے اخلاق کو سنوارا' اس وقت سے مذہب اور اخلاق میں تعلق قائم ہوا۔

مذہب ہمیشہ غریب' بے بس اور مایوس افراد کے لیے روحانی تسکین کا باعث رہا ہے۔ یورپ میں مذہب کا اثر ختم ہوگیا۔ لیکن سماجی تنظیم کے لیے اب بھی اس کا سہارا لیا جاتا ہے۔ روس میں مذہب کی جگہ اشتراکیت نے لے لی۔ اگر اشتراکیت غربت کو دور کرنے میں ناکام رہی تو انسان پھر روحانی تسکین کی خاطر مذہب کو اختیار کرے گا کیونکہ صرف مابعد الطبیعاتی تصورات انسان کو سکون دیتے ہیں اس لیے دنیا میں جب تک مفلسی اور غربت رہے گی اس وقت تک خدا اور مذہب کا بھی وجود برقرار رہے گا۔

ول ڈیورانٹ تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ اقلیت حکمرانی کرتی ہے اور اکثریت اس کے اثر و اقتدار اور حکومت میں رہنا گوارا کرتی ہے۔ اقلیت کے غلبہ کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی ذہانت یکساں نہیں ہوتی۔ بلکہ بہت کم افراد کو یہ نعمت ملتی ہے۔ اس لیے یہ ذہین اپنی ذہانت سے ایک ممتاز مقام حاصل کرلیتے ہیں۔ وہ جہالت اور توہمات سے دور رہتے ہیں اور سازگار ماحول کو اپنی موافقت میں ڈھال لیتے ہیں وہ سیاست اور دولت پر قابض ہوکر انتہائی طاقت ور بن جاتے ہیں۔ دولت مندوں کی ہوس بڑھتی رہتی ہے۔ لالچ اور طمع انہیں اندھا کردیتی ہے۔ وہ غریب کی محنت اور مشقت کے سلسلہ میں دولت بڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ صورت حال معاشرے کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس وقت ناانصافی' ظلم اور طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز اٹھتی ہے۔ معاشرہ ایک بحران سے دوچار ہوتا ہے ایک شدید کش مکش ظہور میں آتی ہے۔ اس وقت معاشرے کے سامنے دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو قانونی طریقہ سے دولت تقسیم کی جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ دولت کا ارتکاز ایک جماعت میں نہ ہو یا پھر انقلاب کے ذریعے سے دولت کے ارتکاز کو ختم کیا جائے اور پورے معاشرے کو یکساں کردیا جائے۔

آج کے معاشرے میں اشتراکیت اور سرمایہ داری دو متضاد نظریوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ دور سرمایہ داری میں معاشرہ خاص ماحول اور حالات میں ترقی کرتا ہے۔ سرمایہ دار دولت جمع کرتا ہے۔ اسے صنعت و حرفت میں لگاتا ہے۔ صنعتی

ترقی میں اضافہ کرتا ہے۔ پیداوار اور اشیاء ضرورت بڑھاتا ہے۔ معاشرے کے افراد کو ملازمت اور روزگار فراہم کرتا ہے۔ لیکن سرمایہ دار دولت کی تقسیم میں ایمانداری سے کام نہیں لیتا۔ وہ اپنے حصہ سے بڑھ کر دوسروں کے حصے کو بھی غصب کرلیتا ہے۔ اس لیے سرمایہ دار کی لوٹ کھسوٹ' دھوکہ دہی' بے ایمانی' ظلم و جور اور استحصال کے خلاف ہر دور میں آواز اٹھتی رہی ہے اور احتجاج کے طور پر اشتراکی نظام قائم ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ کی شاید سب سے طویل اشتراکی حکومت جنوبی امریکہ میں ارنکاز نے تیرھویں صدی میں قائم کی تھی۔ جو 1533ء میں اسپین کی فتح کے بعد ختم ہوئی۔ اس اشتراکی نظام حکومت میں' حکومت ہر فرد کے بارے میں پوری معلومات رکھتی تھی ملک کی آبادی کے اعداد و شمار اور ان کی آمدنی کا حساب رکھا جاتا تھا۔ پورے ملک میں زمین کسانوں میں تقسیم کردی گئی تھی۔ ذرائع آمدورفت کی سہولتیں پوری طرح موجود تھیں۔ ملک کا ہر باشندہ براہ راست حکومت کا ملازم ہوتا تھا۔ چونکہ حکومت کی جانب سے ہر فرد کو اس کی بنیادی احتیاجات مہیا کی جاتی تھیں اور حکومت اس کی جان و مال و ملازمت کی ذمہ دار تھی۔ اس لیے ہر شخص خوشی خوشی حکومت کے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتا تھا۔

روس میں اشتراکی انقلاب کی وجہ زار کا ظلم و تشدد' روس کی جنگ میں شکست خراب انتظام سلطنت' ابتر معاشی حالت' محاذ جنگ سے لوٹے ہوئے زخمی اور بے سہارا فاقہ کش کسان اور سپاہی۔ ان سب سے بڑھ کر لینن کی پر جوش اور پر خلوص قیادت نے زار کے خلاف انقلاب کی شکل اختیار کرلی۔ اس وقت روس اندرونی اور بیرونی خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ اس لیے جب انقلابی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ ملک کی حفاظت کریں گے تو معاشرہ کے ہر فرد نے امن و امان حفاظت اور معاشی مساوات کی خاطر اپنی آزادی کو حکومت کے سپرد کردیا۔

کیا اشتراکی نظام فرد کی آزادی کو ہمیشہ اپنے تسلط میں رکھے گا؟ اس کا جواب ول ڈیورانٹ نفی میں دیتا ہے ہر شخص فطری طور پر آزادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس لیے آزادی سے محرومی ذہنی اذیت ہے جو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کی جائے گی۔ جب پرانی نسل' جنھوں نے انقلاب میں حصہ لیا اور نئے معاشرے کی تشکیل میں شرکت کی ختم ہوگی اور اس کی جگہ نئی نسل لے گی' اسے امن و امان کا زمانہ ملے گا۔ ملک کو کسی بیرونی حملے کا خطرہ نہیں ہوگا تو اس وقت وہ یقیناً" آزادی کا مطالبہ کریں گے۔ روس کی موجودہ اشتراکی

حکومت کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نظام میں لچک پیدا کرنے کی خاطر آہستہ آہستہ اپنی سخت پالیسی میں ترمیم کررہے ہیں۔ اور فرد کو آزادی دے رہے ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم کا نتیجہ مفید برآمد ہورہا ہے۔ سرمایہ دار ممالک اشتراکی انقلاب کے خوف سے معاشرہ میں دولت کی زیادہ تقسیم اور مساوات پر زور دے رہے ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی حکومتیں سرمایہ داری کے ڈر سے فرد کو آزادی دے رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ دیکھتے ہوئے امید ہوتی ہے کہ ان دو نظام میں ہم آہنگی اور ملاپ ہو جائے گا جو ایک متوازن معاشرہ قائم کرنے میں مدد دے گا۔

تاریخ کے اس طویل سلسلہ میں جب ان نظاموں پر نظر ڈالی جاتی ہے جنہوں نے معاشرہ کو منظم کیا۔ افراد کو امن و امان کی پرسکون زندگی دی۔ یا اس کے برعکس ان پر ظلم و تشدد اور دہشت کے ذریعہ قابو پایا گیا اور انہیں غربت و مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا تو ان میں سب سے اول نظام بادشاہت آتا ہے جو اپنی خوبیوں اور برائیوں کے لحاظ سے برابر رہا۔ جب یہ دیکھا گیا کہ ایک فرد اور ذہن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو حل نہیں کرسکتا تو "چند سری" حکومت کا قیام عمل میں آیا لیکن پوری تاریخ میں اکثریت ایک نقطہ نظر اور پالیسی پر متحد نہیں ہوسکتی اس لیے اقلیت حکومت و اقتدار کو ناجائز طور پر استعمال کرے تو اس کے خلاف بغاوت کرکے حکومت کو دوسرے گروہ یا جماعت کے سپرد کردے۔

انقلابات کی وجوہات ہمیشہ معاشی رہی ہیں۔ انقلابات فرانس زمینداروں اور امراء کی دولت، عیش و آرام اور ان کے اختیارات کے خلاف ایک آواز تھی۔ برطانیہ وہ واحد ملک ہے جس نے معاشرہ میں تبدیلیاں انقلاب سے نہیں بلکہ ارتقائی عمل سے کیں۔ انقلاب اور ارتقاء کے نتائج بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ انقلاب ہر شے کو تہس نہس کرکے پورے نظام کو تبدیل کردیتا ہے جب کہ ارتقائی عمل میں معاشرہ ماضی سے رشتہ نہیں توڑتا اور اپنی روایات اور اقدار کو ساتھ لے کر چلتا ہے معاشرہ کا اپنی روایات سے اچانک لاتعلق ہونا یا انہیں نوچ پھینکنا، معاشرہ کو زخمی اور مفلوج کر دیتا ہے کیونکہ جس طرح ایک فرد کی قوت یاداشت پر منحصر ہوتی ہے اسی طرح معاشرہ کی زندگی مسلسل روایات اور اقدار پر ہوتی ہے اور اس رشتہ کو یکسر ختم کردینا معاشرہ کو تنزل کی جانب لے جاتا ہے۔

خونی انقلاب دولت کو منصفانہ اور بہتر طریقے سے تقسیم کے بجائے اسے ضائع کرتے ہیں یہ ضرور ہوتا ہے کہ معاشرہ کا با اختیار دولت مند طبقہ ختم ہوجاتا ہے۔ اور معاشی

مساوات قائم ہوجاتی ہے لیکن یہ معاشی و سماجی مساوات دوسری طرف غیر سیاسی مساوات پیدا کردیتی ہے کیونکہ اقلیت پھر سیاسی طاقت و قوت کے ذریعہ ممتاز مقام حاصل کرلیتی ہے۔
تمام طرز حکومتوں میں جمہوری نظام سب سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے کیونکہ اس نظام میں ہر شخص حکومت کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی ذہنی استعداد اس قدر بلند ہو کہ وہ حکومت کے معاملات کو سمجھ سکے۔ اس سیاسی سوجھ بوجھ کے لیے تعلیم کا ہونا لازمی ہے۔ حقیقی جمہوریت اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے کہ جب معاشرہ کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہو۔ برطانیہ' امریکہ' ڈنمارک' ناروے' سویڈن' سوئٹزر لینڈ اور کینڈا میں جمہوریت مستحکم ہو چکی ہے لیکن دوسرے ممالک میں جمہوریت کو طبقاتی کش مکش دولت کی غیر مساوی تقسیم اور سیاسی نعرہ بازی و باہمی نفرت سے بڑا خطرہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں آمرانہ نظام حکومت آسانی سے قائم ہوجاتا ہے۔ اور فوجی حکومت خوبصورت و دلفریب انقلابی نعروں سے جمہوریت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

3421 سال کی وہ طویل مدت ہے جس کا تاریخی سرمایہ مورخ ضابطہ تحریر میں لے آئے ہیں۔ اس مدت میں صرف 268 سال ایسے گزرے ہیں جن میں کوئی جنگ نہیں ہوئی ورنہ تاریخ انسانی خوں ریز جنگوں' قتل و غارت گری اور کشت و خون سے بھری ہوئی ہے۔ جنگ اور خوں ریزی انسان کے مقدر میں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ ایک مقابلہ کا نام ہے جو انسان اور اقوام عالم کے وجود کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے دنیا میں شدید اور تباہ کن جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ ایک خون ریز جنگ انسان کی صدیوں کی محنت سے تعمیر ہوئی عمارتیں' شہر اور فن و آرٹ کو ختم کردیتی ہے۔ دو عالمی جنگوں نے جو تباہی و بربادی کی وہ آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ ان دو جنگوں کے دوران جو فنی و سائنسی ترقی ہوئی اور جنگوں کے خاتمہ کے بعد اس سائنس کو انسان کی بہتری اور امن کے لیے استعمال کیا گیا یہ معمولی سا فائدہ ہے جس سے دنیا فیض یاب ہوئی۔

کیا دنیا سے ہمیشہ کے لیے جنگ ختم ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ معاشرہ میں جنگ پسند طبقہ ہمیشہ جنگ کی حمایت کرتا ہے جب کہ فلسفی اس کی مخالفت کرتے ہیں لیکن آخر میں وہ بھی اس بات پر متفق ہوجاتے ہیں کہ طویل امن قوموں کی بہادری جوش اور جرات کو زنگ لگا دیتی ہے۔ اس لیے جنگ ضروری ہے تاکہ معاشرے کا جمود ٹوٹے۔

موجودہ حالات کی روشنی میں جنگ کے خطرے کو روکنا بڑا مشکل ہے کیونکہ اشتراکی اور سرمایہ دار حکومتیں ایک دوسرے کو ختم کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں آپس کا یہ مقابلہ اور تصادم اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ جب زمین کی مخلوق کو کوئی بیرونی خطرہ ہو' اس سے بچاؤ اور حفاظت کے لیے زمین کی تمام طاقتیں متحد ہو سکتی ہیں ورنہ نہیں۔

کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ ول ڈیورانٹ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے کیونکہ کچھ ایسے واقعات ہیں جو ایک نظام کے تحت بار بار وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل میں نئی ریاستیں وجود میں آئیں گی' پرانی ختم ہوجائیں گی' پیچیدہ مسائل پیدا ہوں گے دانشور معاشرہ کی غلطیوں اور حالت زار پر قلم اٹھائیں گے۔ نئی نسل پرانی نسل سے بغاوت کرے گی اور بالاخر وہ بھی قدامت پسندی کی روش اختیار کرے گی۔ لیکن تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مستقبل نے ہر لمحہ یا ماہ و سال کو ماضی کے نمونہ پر دھرایا ہو۔ مستقبل نئے خیالات و افکار سے مزین ہوتا ہے وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہے اس لیے اسے عمر رفتہ کو آواز دینے کی فرصت نہیں ہوتی۔

ول ڈیورانٹ جب اس مسئلہ پر غور کرتا ہے کہ تہذیبیں کیوں کر بڑھتی' پھیلتی ہیں' پھر سمٹ کر تنگ ہوجاتی ہیں اور آخر گھٹ کر مرجاتی ہیں اس کے خیال میں اس تمام عمل میں کسی پراسرار طاقت کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ تہذیب کے خاتمہ کی وجہ سیاسی و معاشی اقدار کا زوال' راہنماؤں کے کردار کی کمزوری' جس کی وجہ سے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوسکتے اس لیے تہذیب جو حالات کے ساتھ بدلنا چاہتی ہے وہ ساکت ہوکر زوال پذیر ہوجاتی ہے تہذیب ساکت و جامد تو ہوسکتی ہے' اس کی ترقی تو رک سکتی ہے لیکن تہذیب کبھی مرتی نہیں بلکہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے یونانی تہذیب اب تک انسانوں کے ذہن میں زندہ ہے ہومر کی شاعری آج تک درخشندہ و تابندہ ہے۔ یونانی فلسفیوں' شاعروں اور سائنسدانوں کی کتابیں ہر لائبریری کی زینت ہیں۔ افلاطون کے فلسفہ و افکار کو ہزار ہا نقطہ نظر سے پیش کیا جارہا ہے۔ اس لیے تہذیب کے منتخب تخلیقی ذہن جو افکار تخلیق کرتے ہیں وہ ابدی اور لازوال ہوتے ہیں۔

قومیں مرجاتی ہیں مگر تہذیب زندہ رہتی ہے۔ تاریخ میں ایسی ہزار ہا مثالیں ہیں کہ جب کوئی سر زمین بنجر اور ویران ہوجاتی ہے لوگوں کو غذا اور زندگی کی بنیادی ضروریات

حاصل کرنے میں دشواری اور دقت پیش آتی ہے کام کرنے کے مواقع کم سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں تو اس وقت من چلے اور مہم جو افراد اپنا وطن اور ملک چھوڑ کر دوسری سرزمین آباد کرنے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی تہذیب و تمدن' ثقافت روایات و اقدار اور رسومات کو بھی لے جاتے ہیں اس طرح تہذیب ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے اور جہاں وہ آباد ہوتے ہیں وہاں وہ بھی اپنا اثر اور تسلط جماتی ہے ہے اس کے علاوہ تہذیب اپنے علاقہ کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں اور لوگوں کو بھی متاثر کرتی ہے جیسے روم نے یونانی تہذیب کو اختیار کرلیا۔ مغربی یورپ نے اسے روم سے میراث میں پایا' امریکہ نے اسے مغربی یورپ سے لیا اور اب امریکہ اسے کسی اور کے حوالے کردے گا۔ تہذیب و تمدن ایک جاری سلسلہ ہے جب ایک نسل کے بوجھ کی شدت سے تھک جاتی ہے تو یہ اپنا تہذیبی بوجھ آنے والی نسل کے سپرد کردیتی ہے۔ چاہے اس کے یہ وارث کسی علاقہ میں رہتے ہوں وہ اس میراث کے حقدار اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ہوتے ہیں اس لیے ہر تہذیب اپنی روح کو محفوظ رکھتی ہے اور ان تمام روایات کو بھی جو اسے مختلف نسلوں سے ملتی ہیں۔

زمانہ حال اور ماضی میں کون فوقیت رکھتا ہے؟ کیا ماضی نے اپنی شاندار روایات اور ترقی سے زمانہ حال کو شکست دے دی ہے؟ اس کے جواب میں ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ زمانہ حال نے انسانی تہذیب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ فنی و سائنس ترقی قحط کا خاتمہ' غذا کی بہتات' توہمات اور مذہبی عناد و نفرت کا زوال مشینوں کی ایجاد انسانی محنت و مشقت میں کمی اور سکون و آرام کے لمحات میسر آنا اور بہترین تعلیم' یہ سب حال کے کارنامے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ماضی بھی اپنے دامن میں گہر نایاب لیے ہوئے ہے۔ آگ کی ایجاد' پہیہ کی تخلیق' شکار اور کاشتکاری کے ہتھیار و آلات خاندان کے افراد کی تنظیم' اخلاق و شرافت اور سخاوت کی قدروں کا فروغ' تہذیبی تجربات کی منتقلی یہ ماضی کی میراث ہیں۔ جو زمانہ حال کو ملی ہیں۔

تہذیب ایک نسل سے دوسری نسل میں کس طرح منتقل ہوتی ہے؟ ول ڈیورانٹ اس کو تعلیم کا معجزہ قرار دیتا ہے تعلیم کے ذریعہ نئی نسل تہذیب کے ورثہ کو حاصل کرتی ہے یہ ورثہ حاصل کرنے کے لیے اسے سخت محنت کرنی پڑتی ہے لیکن اگر تہذیب کی منتقلی میں ایک صدی کی تاخیر ہوجائے تو اس صورت میں تہذیب فنا ہوجائے گی اور انسان پھر سے

وحشی اور غیر مہذب ہوجائے گا۔

موجودہ زمانہ کے انسان کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے تعلیم کے ذریعہ کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھایا ہے آج ایک معمولی پڑھا لکھا شخص اس کائنات کے بارے میں پوری پوری معلومات رکھتا ہے کیونکہ ہماری تہذیب ماضی کے ورثہ کو محفوظ کیے ہوئے ہے اور خود بھی اس میں اضافہ کیا ہے اس لیے موجودہ دور کے انسان کی ذمہ داریاں بہت مشکل ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ تہذیب میں یونانی تہذیب کی دانش مندی اور حکمت موجود ہے یہ لیونارڈو کے زمانہ سے برتر ہے کیونکہ اس میں اٹلی کی نشاۃ ثانیہ کی تمام قدریں ہیں۔ یہ والیٹر کے زمانہ سے زیادہ عظیم ہے کیونکہ اس میں انقلاب فرانس کے تمام اثرات ہیں۔ اس لیے اس تہذیب کو محفوظ رکھنا۔ اس میں اضافہ کرنا اور پھر اسے آنے والی نسل کے حوالے کرنا اس دور کے انسان کے اہم فرائض ہیں۔

برٹنڈرسل

(موجودہ دور میں عقل مند لوگ لیبارٹریز میں ہیں اور بے وقوف اقتدار میں)

(رسل)

برٹنڈرسل نے تاریخ پر تین اہم مضامین لکھے جن میں اس نے تاریخ کی اس اہمیت کی جانب اشارہ کیا ہے جو انسانی شعور اور ذہن کی پختگی کے لیے ضروری ہے۔ وہ موجودہ دور کی مایوس کن صورت حال میں جب کہ سائنس اور فنی ترقی انسان کو تباہی و بربادی کی جانب لے جارہی ہے اور ہتھیاروں کی دوڑ انسانی ہلاکت کی تیاریاں کر رہی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ تاریخ کا علم انسان کو اس تباہی سے بچا سکتا ہے اور ماضی سے آگاہی اسے ہلاکت و مکمل بربادی سے محفوظ کرسکتی ہے اس کے تین مضامین (ON HISTORY) اور فلسفہ تاریخ میں اہم اضافہ ہیں۔

رسل علم تاریخ کو انسانی ذہن کی وسعت' کشادگی اور پختگی کے لیے ضروری سمجھتا ہے کیونکہ تاریخ ہی کے ذریعہ ایک فرد کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کن کن مراحل سے گزر کر اس کے اپنے زمانہ کی ترقی تک پہنچا ہے۔ مذہبی عقائد کن کن تبدیلیوں کے عمل سے گزرے اور قدیم و جدید عقائد میں کیوں اختلاف ہے۔ قومیں عروج و زوال کے درجات سے کیوں کر گزریں اور تاریخ میں انہوں نے کیا چھوڑا؟ ان باتوں کے علم سے نہ صرف انسانی ذہن کھلتا ہے بلکہ اس میں غور و فکر کرنے اور سوچنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔
تاریخ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ تخیلات کو پھیلاتی ہے اور وسعت دیتی ہے یہ ماضی کے ان حصوں کو منتخب کرکے نمایاں کرتی ہے۔ جو ہمارے جذبات کو متحرک کرتے ہیں۔ اور ہم میں عظیم مقاصد کی خواہشات پیدا کرتے ہیں تاریخ قوموں کی ترقی اور ان کی عظمت کو اجاگر کرتی ہے اور ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم اپنی امیدوں کو اپنی زندگی کی مدت سے آگے دیکھنے لگتے ہیں۔ تاریخ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے ہمیں اور سیاست دانوں کو جن کا وژن صرف حال تک محدود ہوتا ہے اسے وسیع کرکے ان میں سوچ اور فکر کا جذبہ پیدا

کرتی ہے کہ جس کے زیر اثر وہ حال سے آگے دیکھنے لگتے ہیں۔

مورخ جب تاریخ کی تشکیل کے عمل میں مصروف ہوتا ہے تو اس کے سامنے ماضی کے "واقعات" کا انبار ہوتا ہے اور ان وقعات کی کانٹ چھانٹ ان کا انتخاب اس کے لیے اہم ہوتا ہے۔ اس لیے مورخین نے اس اہم سوال کو اٹھایا ہے کہ تاریخ کی تدوین کرتے ہوئے کن اصولوں اور قاعدوں کے تحت ان واقعات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ کون سا واقعہ اہم ہے اور کون سا غیر اہم؟ ظاہر ہے کہ اس انتخاب کا فیصلہ مورخ کو کرنا ہوتا ہے اس لیے کیا مورخ کے منتخب واقعات سے ترتیب شدہ تاریخ ہر شخص کے لیے مستند ہوگی؟ رسل نے بھی تاریخ کے اس اہم پہلو کی طرف نشان دہی کی ہے کہ اگرچہ مورخ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ تاریخ کی قدر وقیمت اور اہمیت سچائی پر ہے اس لیے واقعات کو سچائی کے ساتھ بیان کردینا چاہیے۔ اور اپنا فیصلہ یا رائے نہیں دینا چاہیے تاکہ واقعات اپنی سچائی کی شہادت خود دیں۔

لیکن اس میں کئی دقتیں ہیں کیونکہ تاریخ لکھنے کا کام ماخذوں (SOURCES) کی مدد سے کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان میں وہ درج ہے جو کہ ماضی میں وقوع پذیر ہوچکا ہے اس لیے ماضی کے یہ تمام واقعات حقیقی ہیں۔ اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان مسودات میں درج شدہ واقعات سچ ہیں تو پھر مورخ کو تاریخ کی تشکیل کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ مورخ اس کا یہ جواب دے گا کہ وہ ان مسودات میں واقعات کے انبار سے انتخاب کرکے ان کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملا کر ان میں ربط پیدا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر مورخ واقعات کو انتخاب کرتے ہوئے اپنی ناپسند و پسند کو دیکھتا ہے۔ واقعات کی سچائی اس کے لیے واحد معیار نہیں ہوتا ہے اس لیے ماضی کی تشکیل میں سچائی مورخ کا مقصد نہیں ہوتی کیونکہ تمام واقعات برابر اور مساوی طور پر سچے ہوتے ہیں اور وہ ان کا انتخاب سچائی کی بنیادوں سے ہٹ کر اپنی مرضی اور نظریہ کی بنیاد پر کرتا ہے۔

رسل اس کا قائل ہے کہ مورخ کو غیر جانبدار رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسی تمام تاریخ جن میں مورخ کی ذاتی رائے اور جذبات نہ ہوں' ایسی تاریخ ڈرامہ کے عنصر سے محروم ہوتی ہے اور بے انتہا خشک اور غیر دلچسپ ہوجاتی ہے۔ اس کی مثال اردو میں وہ تاریخیں ہیں جو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوتی ہیں اور جن میں صرف واقعات کو بیان کردیا گیا ہے۔ ان میں ڈرامہ کا عنصر مفقود ہے۔ رسل کے نزدیک تاریخ میں

دلچسپی اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب اس میں مورخ کی ذاتی رائے اور جذبات کو دخل ہو' مثلاً" انفارمیشن پر اسی تاریخ میں دلچسپی ہوگی جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہو۔

فلسفہ تاریخ میں ایک عرصہ سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ کیا تاریخ سائنس ہے یا آرٹ؟ دراصل عملی تجربات کے بعد جب سائنسی علوم میں قوانین دریافت ہوئے تو سماجی علوم کے ماہرین نے اس بات کی کوشش کی کہ ایسے ہی قوانین سماجی علوم میں دریافت کیے جائیں تاکہ ان کی دریافت کے بعد ان کے عمل سے واقفیت ہوجائے گی اور انسان اپنا مستقبل بہتر طریقہ سے خوشگوار بنا سکے گا۔ اسی جذبہ کے ساتھ تاریخ میں قوانین کی دریافت اور ان کی ترتیب کی کوششیں ہوئیں لیکن تاریخی عمل اس قدر پیچیدہ ثابت ہوا کہ ماضی کی آگہی کے باوجود مستقبل کے بارے میں کوئی بات قطعی طور پر نہیں کی گئی۔ رسل نے بھی اس بات کو کہا کہ تاریخ سائنس نہیں ہے کیونکہ سائنس میں "واقعات" (FACTS) کی جو اہمیت ہے اس کا اطلاق تاریخ پر نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ یہ فیکٹس استقرائی سائنس (INDUCTIVE) کے لئے اہم ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک نئی تھیوری فیکٹس کو اہمیت دیتی ہے' مثلاً" نیچرل سلکشن کی تھیوری نے انسانی ارتقاء میں عبوری اور درمیانی دور کے نوع حیوان کو اجاگر کیا اور ان کی اہمیت کو آشکار کیا۔ تاریخ اس حیثیت میں نہیں کہ وہ فیکٹس کے اطلاق کی اس منزل پر پہنچ جائے۔ اس سے اندازہ لگا کر ایک بات کہی جاسکتی ہے مگر اس کی بنیاد سائنسی قانون پر نہیں ہوتی۔ مثلاً" برک نے یہ دلیل دی کہ تمام انقلابات کی انتہا فوجی آمریت پر ہوتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب نے اس کی یہ تھیوری ثابت بھی کردی کہ نپولین کی آمریت اس انقلاب سے پیدا ہوئی برک نے یہ بات انگلستان میں کرام ویل کی مثال کو سامنے رکھ کر دی تھی۔ اور یہ محض اتفاق ہے کہ اس کا اندازہ صحیح ہوگیا مگر اس کو سائنسی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا ہے کیونکہ تاریخ میں واقعات اس انداز سے ملتے ہیں کہ ان کو بنیاد بنا کر ایک فارمولا تشکیل نہیں دیا جاسکتا۔

تاریخ میں بعض اوقات واقعات میں مماثلت پائی جاتی ہے لیکن یہ مماثلت سطحی اور معمولی قسم کی ہوتی ہے اور ان بنیادوں پر ہم اپنے دور کے واقعات' ادارے یا روایات کو تشبیہ نہیں دے سکتے۔ بعض اوقات تاریخ کے ذریعے موجودہ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جو گمراہ کن ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے رسل کہتا ہے کہ اٹھارویں صدی سے

لے کر موجودہ دور تک "آزادی اور جمہوریت" کی تعریف یونان اور روم کی تاریخ سے دی جاتی ہے حالانکہ اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ رومیوں کی تاریخ سے فرانسیسی انقلاب اس کے اسباب اور حالات کو بیان کیا جائے اور یونانی شہری ریاست کے ڈھانچہ کو جو غلامی کے ادارے پر کھڑا تھا جہاں کوئی نمائندہ ادارے نہ تھے اور جہاں اس وقت پرنٹنگ کا وجود نہ تھا۔ اس سے موجودہ دور کی جمہوریت کی مثال دی جائے۔ یہ ایک مکمل طور پر غیر حقیقی چیز ہے اسی طرح امپیریل ازم کی مثال دیتے ہوئے اس کی کامیابی اور ناکامی کی دلیل قدیم تاریخ سے دی جاتی ہے کیا ہم اس دلیل پر یقین کرلیں کہ رومیوں کا زوال اس لیے ہوا کہ ان کی سرحدیں پھیلتی چلی گئیں؟ یا ہم مومزن (MOMSEN) پر یقین کریں کہ جس نے زوال کی یہ وجہ بتائی کہ انہوں رائن اور ڈینوب کے درمیان جرمنوں کے علاقوں کو فتح کرکے غلطی کی ان دلائل کو ہم موجودہ دور کے حالات پر کسی طرح بھی اطلاق نہیں کرسکتے۔

رسل کے خیال میں تاریخ اس وقت اور بھی خطرناک ہوجاتی ہے جب اس کے ذریعہ کوئی فلسفیانہ بیان دیا جاتا ہے جیسے "حق میں ہمیشہ طاقت ہوتی ہے یا سچائی آخر میں کامیاب ہوتی ہے یا ترقی معاشرہ کا ایک بنیادی اصول ہے" ان تمام نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تاریخ میں جگہ اور وقت کو ڈھونڈنا پڑتا ہے اور اس عمل میں روایات و قدروں کو مسخ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال کارلائل کی ہے جس نے پیورٹن ازم کی حمایت میں کرام ویل کے ہر اقدام کی حمایت کی۔ جب کہ یہ ایک مشکل کام ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ حق کس طرف ہے لیکن اس کے مقابلے میں یہ دریافت کرنا مشکل نہیں کہ طاقت کس کی طرف ہے۔ اور اسی لیے حق طاقت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ تاریخ میں یہ اس طرح ہوجاتا ہے کہ "طاقت ہمیشہ حق پر ہوتی ہے" اسی وجہ سے کارلائل نے فریڈرک اور نپولین کی تعریفیں کیں اور نیگروز آئرش اور عوام کے لیے حقارت کے ساتھ لکھا اور "برتر کے لیے سب کچھ ہے" اسی کو تاریخی حقائق سے ثابت کرکے عوام کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

فلسفہ تاریخ میں یہ سوال کی انتہائی اہمیت کا ہے کہ ایک طویل اور شاندار ماضی قوموں پر کیا مثبت اثرات ڈالتا ہے یا منفی؟ وہ قومیں جو پرشکوہ ماضی کی وارث ہوتی ہیں ماضی کے بوجھ سے اس قدر تھک جاتی ہیں کہ ان کی عملی جدوجہد ختم ہوکر رہ جاتی ہے اور وہ

ہمیشہ ایک بوڑھے آدمی کی طرح اپنے حسین توانا اور خوشگوار جوانی کو یاد کرتی ہیں اور وہ قومیں جو ماضی کے بوجھ سے ہلکی ہوتی ہیں وہ توانائی کے ساتھ آگے کی جانب سفر کرتی ہیں لیکن رسل اس کا قائل نہیں۔ وہ ماضی کی افادیت اور اس کے مثبت اثرات کو اہمیت دیتا ہے۔

تاریخ میں ایسی نوجوان قومیں جن کے پاس ماضی کا ذخیرہ نہیں ہے وہ بڑی تیزی اور توانائی سے آگے بڑھتی ہیں۔ ان کے سامنے کامیابی اور حصول مقصد سب سے اہم چیز ہوتی ہے (یہاں امریکہ کی مثال دی جاتی ہے) لیکن جو اقوام کے تاریخ میں گھری ہوئی ہوتی ہیں اور جن کے ذہنوں میں پچھلی نسلوں کے کارنامے ہوتے ہیں وہ سوچ سمجھ کر اور آہستگی کے ساتھ قدم اٹھاتی ہیں۔ اس لیے ایک ایسے ماحول میں جہاں فرصت اور زندگی کی تمام سہولتیں اس لیے قربان کردی جائیں۔ دولت اور کامیابی کی دوڑ میں سب سے اول رہا جائے تو ایسی اقوام کے لیے تاریخ اور ماضی کے واقعات سبق فراہم کرتے ہیں اور بقول رسل موجودہ حالات میں ماضی کے ان اسباق کی شدید ضرورت ہے۔

ماضی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے رسل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب تاریخ انسان کے کارناموں کو محفوظ کرلیتی ہے تو یہی زمانہ کی سب سے بڑی شکست ہوتی ہے کیونکہ اس سے انسان کی قوت و طاقت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو نئی زندگی دیتی ہے جو کبھی کے مرکھپ گئے۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے اس پر غور و فکر کرنے سے اور اس میں محفوظ عظیم لوگوں کی زندگیوں سے اچھائی اور برائی کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

تاریخ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حال میں جو کچھ گزر چکا ہے اس کا بھی جائزہ لیا جائے اور اس میں ان عناصر کو محفوظ بھی کرلیا جائے کہ جن کی آگے چل کر اہمیت ہوگی تاکہ ہماری نسل کے ختم ہونے کے بعد وہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرسکیں۔ اس عمل میں تمام انسانی تجربات کی چھان بین کے بعد جو بے کار، ناکارہ اور گندا ہوگا وہ فراموش کردیا جائے گا اور جو باقی بچے گا وہ دانش مندی اور آگہی سے بھرپور ہوگا۔ اس سے ہم پر ماضی کے اسرار کھلتے جائیں گے اور ہم ان انسانوں سے محبت کریں گے کہ جن کی وجہ سے یہ تمام دولت ہمارے حصہ میں آئی۔ عظیم شخصیتوں کی زندگی پر غور و فکر کے بعد ان کے اور ہمارے درمیان ایک رشتہ قائم ہوجائے گا اور ماضی کے بعد ہیروز کی آوازیں ہمیشہ ہمیں پکارتی رہیں گی۔ یہ عظیم لوگ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ اس لیے ان میں شامل ہوکر تاریخ میں

لافانی لوگوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہئے۔

لیکن تاریخ انفرادی شخصیتوں کی زندگی اور ان کے کارناموں ہی کا ریکارڈ نہیں بلکہ اس سے زیادہ وسیع ہے یہ فرد کی نہیں بلکہ انسان کی بحیثیت مجموعی سوانح حیات ہے۔ اس میں قوموں کا عروج و زوال' مذہبوں کی زندگی اور موت' جنگ و جدل' قتل و غارت گری ہے۔ تاریخ کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا ثقافتی ورثہ ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے جب کہ جنگ اور لوٹ مار وقت کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔

دیکھا جائے تو ماضی ہی حقیقی ہے جب کہ حال تلخ اور دکھوں سے پر ہے۔ ماضی زندہ اور مجسم تصویر ہے۔ جب کہ حال نامکمل اور ادھورا ہے جو مرچکے ہیں ان کی زندگی مکمل ہے اور وہ زمانہ طاقت اور دست برس سے آزاد ہیں۔ ان کی کامیابی و ناکامی ان کی امید اور خوف' خوشی اور رنج سب لافانی ہوچکے ہیں اور زمانہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود ان کو تبدیل نہیں کرسکتا ہے وہ غم جو کہ قبروں میں دفن کردیئے گئے ہیں۔ وہ المیہ جس کی دھندلی یاد دماغوں میں باقی رہ گئی ہے۔ وہ محبت جس کو موت نے لافانی بنا دیا ہے۔ ان میں وہ طاقت سحر اور جادو ہے کہ اس تک حال اور موجودہ زمانہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔

ہر سال ساتھی مرتے ہیں امیدیں ناکام ہوتی ہیں۔ آئیڈیل دھندلا جاتے ہیں۔ نوجوانی کا زمانہ گزر جاتا ہے اسی کے ساتھ تاریخ کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے تھکی ہوئی اقوام کی رفتار مدھم ہوتی جاتی ہے اور اس کی توانائی وقت کے ساتھ دم توڑتی رہتی ہے۔ ہر وہ چیز جس سے ہم محبت کرتے ہیں روپوش ہوتی جاتی ہے اس کے نتیجہ میں ماضی حال کی ہر چیز کو نگل رہا ہے۔ یہ حال کی موت پر زندہ رہتا ہے اس کی فتح اور کامرانیوں میں برابر اضافہ ہوتا ہے ہر بڑا کارنامہ ہر عظیم زندگی اس کے خزانہ میں اضافہ کرتی ہے۔ وقت کے ساتھ ماضی برابر توانا طاقت ور اور ابدی ہورہا ہے۔

اس لیے رسل مورخوں سے یہ کہتا ہے کہ ماضی کے اس ذخیرہ سے جس میں اچھا بھی ہے اور برا بھی وہ ان واقعات کو منتخب کریں کہ جن میں محبت اور امید کا پیغام ہو۔ ان واقعات کو تلاش کریں کہ جو زندہ رہنے کا حوصلہ دیں۔ ان میں دوبارہ سے رنگ بھریں۔ انہیں نئی زندگی دیں ان کو پھر سے جاندار بنائیں تاکہ یہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کریں۔ عظیم لوگوں کی سوانح حیات اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالیں تاکہ لوگ ان سے متاثر ہوکر ان کی خوبیوں کو اپنے میں پیدا کریں۔ عوامی تاریخ اور انفرادی تاریخ میں توازن قائم کرنا بڑا

ضروری ہے۔ انفرادی شخصیتوں کو اس لیے بھی ابھارنا ضروری ہے کہ اس کی جگہ کہیں ریاست، قوم یا چرچ کو حاوی نہیں کردیا جائے جو انسانی آزادی اور حریت کو ختم کردیتی ہیں۔

رسل اس پر یقین رکھتا ہے کہ تاریخ میں وہ قوت اور جذبہ ہے کہ جو انسان کے مستقبل کو نہ صرف تابناک بنا سکتا ہے بلکہ اس سے حال کے بحرانوں میں بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

سوروئے کن

پی تی رم سوروئے کن 1889ء میں روس میں پیدا ہوا' اور وہاں کی مشہور یونیورسٹی سینٹ پیٹرز برگ میں قانون اور سوشیالوجی کا پروفیسر تھا۔ 1925ء میں یہ امریکہ چلا آیا اور یہاں منی سوٹا اور ہارورڈ میں بحیثیت پروفیسر کے کام کیا۔ اس کی مشہور کتاب
(SOCIAL AND CULTURAL DYNAMICS) ہے جس میں اس نے تاریخ کے بارے میں بنیادی نظریات کو پیش کیا ہے۔

تاریخ کے مفکرین کے لیے انسانی معاشرہ مطالعہ کے نئے نئے پہلو پیش کرتا ہے۔ ان کے لیے ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا مشکل رہا ہے کہ معاشرے کیوں تبدیلیوں کے عمل سے گزرتے ہیں؟ یہ کیوں عروج و زوال کے مرحلوں کو طے کرتے ہیں؟ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ معاشرے تبدیلیوں کو قبول کرلیتے ہیں اور کچھ اپنی جگہ منجمد رہتے ہیں؟

سوروئے کن نے ماہر عمرانیات اور مورخ کی حیثیت سے معاشروں میں تبدیلی کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اس مقصد کے لیے اس نے تبدیلی سے کچھ قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کے ذریعہ تاریخ کو سمجھا جاسکے۔ اگر ایک مرتبہ تبدیلی کے عمل کو سمجھ لیا گیا اور اسکے قوانین کو دریافت کرلیا گیا تو پھر یہ ممکن ہوسکے گا کہ زوال کے عمل کو روکا جاسکے اور جب معاشرے میں کسی خرابی کے آثار نظر آئیں تو اس کا علاج اس طرح سے کرایا جاسکے جیسے کہ ایک ڈاکٹر مرض کی تشخیص کے بعد بیماری کو دور کرکے مریض کو دوبارہ سے صحت مند بنا دیتا ہے۔ اس طرح سے مورخ کی حیثیت بھی معاشرہ میں ایک ڈاکٹر کی ہوجائے گی۔ جو معاشرہ کو مستقل طور پر صحت مند رکھ سکے گا۔

سوروئے کن نے اپنے نظریات کا اطلاق یورپی معاشرہ پر کیا ہے اس لحاظ سے اس کا دائرہ محدود ہے اور اس نے اشپنگلر و ٹائن بی کی طرح مشرق و مغرب کے تمدنوں کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ نہیں کیا ہے۔ مگر اس نے یورپی معاشرہ کا جو مطالعہ کیا ہے۔ اس کی روشنی میں مشرقی تہذیب کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

سوروئے کن اگرچہ سائیکل یا ایک دائرہ میں گردش کے نظریہ کا قائل ہے اور اس

لحاظ سے وہ ابن خلدون' ویکو' اشپنگلر اور ٹائن بی کا ہم خیال ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ ان کی طرح تمدنوں کے بیالوجیکل عمل کا قائل نہیں۔ معاشرہ اپنے زوال کو روک سکتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ کے تمدن میں وحدت اور اکائی ہو اور اس کے مختلف عناصر باہم پیوست اور ہم آہنگ ہوں۔ صرف اس صورت میں وہ ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو رد کرسکتا ہے۔ اگر اس میں یہ اکائی نہیں ہوگی تو وہ جاندار تمدن کی شکل اختیار نہیں کرسکے گا۔ تمدن بکھرے ہوئے عناصر کو جمع کرکے توانا اور طاقت ور ہوتا ہے۔ اور پھر اسے توڑنا مشکل ہوتا ہے لیکن اگر وہ بکھرا ہوا ہو اور اس کے کچھ حصے ترقی یافتہ ہوں اور کچھ پس ماندہ تو ایک ایسا تمدن ہمیشہ زوال کے عناصر کو اپنے اندر چھپائے ہوئے رکھتا ہے۔ سوردئے کن تین کلچروں کی نشان دہی کرتا ہے کہ جن کے دائرہ میں معاشرہ گردش کرتا رہتا ہے۔

1- (Ideation) ایڈیشن کلچر جسے عقائد کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔
2- (Idealsit) آئیڈلسٹ کلچر جو عقائد اور سائنس کا امتزاج ہوتا ہے۔
3- (Sensate) سین سیٹ کلچر یہ سائنس کا دور ہوتا ہے۔

پہلے کلچر یعنی عہد عقائد میں جو موضوعات معاشرہ کے لیے اہم ہوتے ہیں ان میں مابعدالطبیعات اور مافوق الفطرت قوتیں' خدا' شیطان' فرشتے' ارواح' روحانیت' نجات' گناہ' بخشش' دوبارہ زندگی' برزخ' جنت' جہنم شامل ہیں۔ اس دور میں الہیات کا مضمون سب سے اہم ہوتا ہے اور باقی تمام علوم اس کے مددگار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی چیز حواس اور تجرباتی طور پر حادثاتی شکل میں ظاہر ہوجائے تو اسے بھی اگلی دنیا کے سمجھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

• اس کلچر میں سچائی کو پانے کے لیے مقدس کتابوں اور صحیفوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور اگر سچائی کو ثابت کیا جائے تو اس کے لیے ان کا حوالہ دینا لازمی ہوتا ہے۔ نئی سچائی صرف خدا کی جانب سے وحی یا الہام کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ منطقی دلائل اور حواس کی بنیاد پر شہادتیں صرف اس حد تک قبول کی جاتی ہیں کہ جس حد تک وہ عقائد کی حمایت میں ہوں اگر وہ ان سے متضاد ہوتی ہیں تو اس صورت میں انہیں شیطانی وسوسہ سمجھ کر رد کردیا جاتا ہے اور ایسے خیالات کو ارتداد کفر اور جادو قرار دیا جاتا ہے۔

آئیڈلسٹ کلچر میں موضوعات جزوی طور پر مافوق الفطرت ہوتے ہیں اور جزوی طور پر تجرباتی' لیکن اس میں حواس کے ذریعہ جاننے والے عالم کو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا۔ اور

صرف اس حد تک اسے قبول کیا جاتا ہے کہ جس حد تک اس کی اجازت دے۔

اس کلچر میں سچائی کو جاننے کے لیے منطقی دلائل اور حواس کے ذریعہ جو تجربات ہوں انہیں دونوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے ذریعہ جو دلائل تشکیل ہوتے ہیں ان کی حمایت مقدس تحریروں اور وحی کے ذریعہ کی جاتی ہے تاکہ اس طرح دونوں کو ملا کر ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

سین سیٹ کلچر میں اشیاء کو حواس کے ذریعہ سمجھا اور پہچانا جاتا ہے۔ وہ تمام مواد ہے جسے حواس کے ذریعہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ جیسے کہ خیالات' احساسات' جذبات' اور اقدار تو ان کے ان پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے کہ جن کو حواس کے ذریعہ جانا جاسکے جیسے (Behaviorism) بی ہیوورازم۔ اس طرح ان کے غیرمادی پہلوؤں کو نظرانداز کردیا جاتا ہے اس سے ثبوتیت پسندی (Positivism) اور مذہب میں لا ادریت (Agnosticism) کے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں سائنس کے ذریعہ تمام مضامین کو سمجھا جاتا ہے۔

اس کلچر میں سچائی کو جاننے کے لیے حواس اور سائنس آلات کی مدد لی جاتی ہے جیسے مائکرو اسکوپ' ٹیلی اسکوپ' علم شماریات اور منطقی دلائل وغیرہ۔ اس میں تمام نتائج اس وقت تک مفروضے رہتے ہیں جب تک کہ تجرباتی طور پر انہیں ثابت نہیں کیا جائے۔ وہ تمام مفروضے جو حقائق سے متصادم ہوں انہیں رد کردیا جاتا ہے۔ اس کلچر میں مقدس تحریریں' وحی' الہام اور عقائد یہ سب توہمات ہوتے ہیں اور انہیں نظرانداز کردیا جاتا ہے۔

ان خصوصیات کے بعد سوروئے کن معاشرہ کے اقتصادی' سماجی' سیاسی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے اور آرٹ' ادب' اور تعمیر میں ان تینوں کلچروں کی خصوصیات کو تلاش کرتا ہے۔ مثلاً" ایڈیشن کلچر میں حکومتیں مذہبی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ حکمران مذہبی راہنما ہوں کیونکہ اس میں حکومت کا ڈھانچہ اور قوانین مذہبی ہوتے ہیں اور مذہبی عقائد کو حکومت کے ذریعہ نافذ کیا جاتا ہے۔ اور مذہب کے خلاف کچھ بھی برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔

آئیڈلسٹ کلچر میں حکومت کا ڈھانچہ جزوی طور پر مذہبی اور جزوی طور پر سیکولر ہوتا ہے لیکن اس میں مذہب کا غلبہ رہتا ہے جب کہ سین سیٹ کلچر میں حکومت پر تاجر' سائنسداں اور مافیا کا قبضہ ہوتا ہے۔

اسی طرح تینوں کلچروں میں علیحدہ علیحدہ طبقوں کا عروج ہوتا ہے اور ان کا زوال بھی

اس خاص کلچر کے ساتھ ہوتا ہے کہ جس کا یہ حصہ ہوتے ہیں۔ مثلاً سین سیٹ کلچر میں تاجر، بورژوا، بیورو کریسی، دانشور اور سائنس داں عروج پاتے ہیں۔ ایڈیشن کلچر میں معاشرہ معاشی طور پر پس ماندہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس دنیا سے زیادہ دوسری دنیا کی فکر ہوتی ہے جب آئیڈلسٹ کلچر آتا ہے تو اس میں اس دنیا سے دلچسپی بھی بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجہ میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے انسان جدوجہد کرتا ہے اور اس سے معاشرہ کی معاشی حالت بہتر ہوتی ہے۔ سین سیٹ کلچر میں تاجر اور بورژوا طبقے زیادہ دولت خود ہتھیا لیتے ہیں اور سماجی انصاف کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ مگر اس دور میں سائنس اور فنی ترقی کی وجہ سے معاشی ترقی بھی ہوتی ہے۔ اور اس کے زوال کے نتیجہ میں معاشی حالت خراب ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے مزدور اور غریب و مفلس ہوجاتا ہے۔

معاشرہ میں جس قسم کا کلچر ہوتا ہے اس قسم کا ذہن اور شخصیت کے کردار کی تشکیل ہوتی ہے، کیونکہ فرد کو اس کے علاوہ اور کچھ دیکھنے اور سوچنے کو نہیں ملتا۔ ایڈیشن کلچر میں ذہن مذہبی اور سخت متعصبانہ ہوتا ہے اور اس میں اس کی بھی اجازت ہوتی ہے کہ کافروں کو قتل کردیا جائے۔ سین سیٹ کلچر سیکولر اور سائنسی ذہن بناتا ہے۔ کیونکہ یہ ذہن معاشرہ کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

سوروکن اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کسان اور مزدور ان تینوں کلچروں میں باعمل نہیں ہوتے کیونکہ ان کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہوتی کہ وہ خود کو صاحب اقتدار طبقوں مین ضم کردیں اس لیے ان لوگوں کی معاشی حالت میں بھی زیادہ فرق نہیں آتا۔ اس وجہ سے کلچر صرف اقلیت پیدا کرتی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ اس سرزمین پر بلین کی تعداد میں لوگ رہتے ہیں مگر ان میں 22 لاکھ ایسے ہیں کہ جو تاریخ میں مشہور ہیں۔ غلام، قیدی اور غریب لوگ تاریخ نہیں بناتے بلکہ ان کے لیے تاریخ بنائی جاتی ہے۔ عوام یا مجمع تہذیب و تمدن کو ختم کردیتے ہیں جیسے انقلاب فرانس میں عوامی مجمع نے فرانسیسی تہذیب کو ختم کردیا اور اس پر ایڈ منڈ برک کرنے اس طرح سے نوحہ کنی کی کہ اس انقلاب کے بعد قدیم روایات اور طریقہ زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کی جگہ ان وحشیانہ نظریات نے لی جو سرد دلوں اور کیچڑ بھرے ذہنوں سے پیدا ہوئے تھے۔ دور شجاعت ختم ہوا۔ اور ان کی جگہ تاجر، بنئے، اور سوفسطائی پیدا ہوئے اس کے بعد یورپ کی عظمت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

سوروکن انسانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ان تین کلچروں کو ضروری سمجھتا ہے جس

کلچر کا معاشرہ پر تسلط ہوتا ہے اس کی خصوصیات لوگوں میں آجاتی ہیں۔ وہ اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ تمام معاشرے اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا اس کے پیمانے بالکل صحیح ہیں۔ ان کلچروں کی روشنی میں یورپی معاشرہ کے مطالعہ کے بعد وہ اس کے زوال کی پیشین گوئی کرتا ہے کیونکہ یورپی کلچر اپنی یک جہتی کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس لیے اس کی بقا کی قوت ختم ہوگئی اور جب کسی کلچر کی اندرونی قوتیں کمزور ہوجائیں تو اس کا زووال لازمی ہوجاتا ہے۔

تبدیلی کا عمل

تاریخ میں تبدیلی کا عمل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ تبدیلی خود بخود نہیں آتی بلکہ اسے لایا جاتا ہے کیونکہ ہر کلچر اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں تبدیلی کی ہر کوشش کو ناکام بناتا ہے۔ لیکن اندرونی اور بیرونی قوتیں تبدیلی کو لانے اور اسے تیز تر کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ تبدیلی اولین طور پر کسی کلچر کے اندر سے ہوتی ہے۔ پھر خارجی اثرات اس عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جو تبدیلی اندرونی طور پر ہوتی ہے وہ زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اور جب معاشرہ کا نیا ڈھانچہ تشکیل ہوتا ہے تو اس میں ان اندرونی قوتوں کا پوری طرح سے اظہار ہوتا ہے اگر کسی کلچر میں یک جہتی ہو تو اس میں تبدیلی بھی مکمل آتی ہے لیکن اگر اس کے پہلو مختلف اور بکھرے ہوئے ہوں تو اس صورت میں تبدیلی علیحدہ علیحدہ آتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تکمیل پذیر ہوتی ہے۔

تاریخ میں تبدیلی کے عمل کو کئی آہنگوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں دو لفظوں کا آہنگ دو تضادات کو ابھارتا ہے اور ان کو بیان کرتا ہے جیسے جنگ و امن' امن و بدامنی' تباہی و تخلیق' نفرت و محبت' مذہب و سیکولر ازم' انتشار و اتحاد' عروج و زوال' چیلنج و جواب' پیچھے ہٹنا اور واپس آنا۔ بکھرنا و متحد ہونا۔ اور باندھنا و کھولنا اس آہنگ سے تاریخی عمل کے کئی نکات واضح ہوتے ہیں اور معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کو اس آہنگ کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

دو لفظوں کے علاوہ تین لفظوں کا آہنگ بھی تبدیلی کے عنصر کی وضاحت کرتا ہے جیسے ایجاد' تقلید' مخالفت' پیدائش' شباب' ضعیفی' سماجی تحریکوں کو سمجھنے کے لیے ان کے تین درجے ہوتے ہیں جیسے نظریاتی' تنظیمی اور اقتدار' تہذیبوں کے زوال کو سمجھنے کے لیے ان کو ٹوٹنا' بکھرنا' اور ختم ہوجانا۔ آرٹ کے لیے تعمیراتی' پلاسٹک تصویری' ادب کے لیے غنائیہ'

دیومالائی' ڈرامائی' تاریخ کے لیے قدیم' عہد وسطی اور جدید۔ مختلف مفکرین نے تہذیبوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے جیسے ویچو کے ہاں دیوتاؤں کا عہد' ہیروز کا عہد' انسانوں کا عہد۔ یا ہیگل کے جدلیاتی عمل میں دعویٰ' ضد دعویٰ' امتزاج۔

چار لفظوں کے آہنگ کو انسان نے موسم اور انسانی زندگی سے لیا ہے جیسے بچپن' شباب' پختگی' ضعیفی' یا صبح' دوپہر' شام' رات۔ کچھ مفکرین نے معاشرہ میں نظاموں کی گردش کو لفظوں کے آہنگ میں بیان کیا ہے جیسے پولی بیس کہتا ہے کہ انسان معاشرہ' بادشاہت' آمریت' ارسٹوکریسی' چند سری' جمہوریت' عوامی حکومت کے درمیان گردش میں رہتا ہے۔ اسی طرح ہفتہ کے 7 دن' اور سال کے 12 مہینے اسی آہنگ کا حصہ ہیں۔ 3-7-9-12 کے ہندسوں کی جادوئی حقیقت کا تعلق بھی تبدیلی کے آہنگ سے ہے۔

اس لیے انسانی زندگی میں جو اتار چڑھاؤ' زیرو بم' اور نشیب و فراز آتے ہیں انہیں اور ان کے تضادات کو تاریخ کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔ چونکہ یہ آہنگ انسان کی زندگی میں ہے اس کے معاشرہ میں ہے اس لیے یہ تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ تاریخ معاشرے کے ان تضادات کی وضاحت کرکے تبدیلی کے عمل کی نشان دہی کرتی ہے۔

سوروئے کن اس سوال کا بھی جواب دیتا ہے کہ سماجی تبدیلی میں وقت کی اہمیت کیا ہے؟ اور تبدیلی کے لیے کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے سماجی تبدیلیاں بھی اسی قدر تیزی سے آرہی ہیں۔ مثلاً" پتھر کا زمانہ ایک طویل عرصہ تک رہا۔ لوہے اور کانسی کا زمانہ اس کے مقابلہ میں کم عرصہ رہا۔ تبدیلی کے عمل میں اس لیے تیزی آئی کہ اس زمانہ میں پتھر کے ساتھ لوہے اور کانسی دونوں کا استعمال بھی ہوا اور ان تینوں نے مل کر تبدیلی کی رفتار کو تیز کردیا۔ اب جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اس طرح سے تبدیلی کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔

سوروئے کن کے نزدیک سماجی و ثقافتی واقعات بار بار دہرائے نہیں جاتے اور نہ ہی ترقی کا عمل سیدھی لائن میں ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہر نظام کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اور اس میں لامتناہی جدتیں ہوتی ہیں۔ جب ایک نظام فرسودہ ہوجاتا ہے تو اسکی جگہ دوسرا نیا نظام آجاتا ہے۔ اس سے تاریخ میں رنگا رنگی اور بو قلمون پیدا ہوتی رہتی ہے۔ تاریخ اس لیے ایک جیسی نہیں رہتی ہے۔ اس میں اس قدر تخلیقی قوتیں ہیں کہ یہ کبھی تھکنے والی نہیں۔

معاشرہ اور آزادی

آزادی پر اظہار رائے کرتے ہوئے سوروئے کن کہتا ہے کہ کسی معاشرہ میں فرد کی آزادی کا تعلق اس کے سماجی تعلقات اور سیاسی نظام پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فرد کی اپنی فطرت اور کردار بھی اس کی آزادی کا تعین کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی بہت خواہشات' آرزوئیں اور مقاصد ہوں اور وہ انہیں پورا کرنے کے لیے ماحول کو ساز گار نہیں پائے اور معاشرہ قانون' اور رسم و رواج اس کے راستے میں حائل ہوں تو ایسا شخص خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور شخص کہ جس کی خواہشات زیادہ نہیں۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے معاشرہ اور اس کے ذرائع کا شاکی نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر خواہشات کو کم کردیا جائے تو اسی حساب سے آزادی بھی بڑھ جائے گی۔ اس لئے آزادی ایک اضافی چیز ہے۔

جب معاشرہ میں لوگوں کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ ان کے حصول کے لیے اول پرامن طور پر کوشش کرتے ہیں اس کے بعد پر تشدد ذرائع کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اور لڑائی جھگڑے' انقلاب اور ہنگاموں کے ذریعہ وہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اگر اس سے بھی ان کی ضروریات پوری نہ ہوں تو لوٹ مار' ہجرت' اور خود کشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

جنگ' انقلاب اور ہنگامہ

سوروئے کن نے یورپ کی تاریخ میں جنگ' انقلاب اور ہنگامہ کی اہمیت کا مطالعہ کیا۔ اس نے اس کی طرف نشان دہی کی کہ جب جنگوں کے بارے میں لکھا جاتا ہے تو صرف فوجیوں کی تعداد' مرنے والے اور زخمیوں کی تعداد اور جنگوں کے بارے میں لکھا جاتا ہے' اور جنگ کے دورانیہ کے بارے میں اطلاعات ہوتی ہیں۔ لیکن جنگ کے دوسرے اہم پہلوؤں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے جن میں جنگ کے اخراجات' بیماریاں' شہریوں کی اموات' اور اس کے معاشی و سماجی اثرات جب تک جنگ کی اذیت کا پوری طرح سے بیان نہیں ہوگا اس وقت تک لوگ جنگ سے نفرت نہیں کریں گے۔

اسی طرح جب انقلاب یا ہنگامہ کا مطالعہ کیا جائے تو ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا ضروری ہے کہ ہنگامہ کس علاقہ میں ہوا۔ اس سے کتنے شہر' گاؤں اور قصبے متاثر ہوئے؟

کتنے لوگوں نے اس میں حصہ لیا؟ اس کے حمایتی اور مخالف کتنے تھے؟ اس کا دورانیہ کیا تھا؟ اس میں تشدد کتنا تھا؟ ان سوالات کے جواب سے انقلاب و ہنگامہ کی اہمیت و اثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سیاسی ہنگاموں کا مطالعہ کرنے سے پہلے ان کی نوعیت کا تعین کرنا چاہئے کہ کیا سیاسی ہنگامہ کا مقصد حکومت کو بدلنا ہے؟ یا ہنگامہ سماجی و معاشی نوعیت کا ہے یا علیحدگی پسندوں کا پیدا کیا ہوا ہے؟ مذہبی ہے یا ذاتی نوعیت کا ہے۔ اس کا مقصد صرف ذاتی طور پر حکومت میں تبدیلی ہے یا کسی قانون اور ٹیکس کے خلاف ہے۔ ان ہنگاموں کی مثال بیماری کی طرح ہوتی ہے جو چند ہفتوں میں ختم ہوجاتی ہے۔ وہ ہنگامے کے جن کا دورانیہ سال بھر کا ہوتا ہے یا سال بھر سے زیادہ ہوں۔ ایسے ہنگاموں کی تعداد تاریخ میں بہت کم ہے۔

سوروئے کن نے کلچر کی جن تین اقسام کا ذکر کیا ہے تاریخ میں تبدیلی کے عمل' معاشرہ اور آزادی' جنگ' انقلاب و ہنگامہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی روشنی میں ہم اپنے معاشرہ میں اپنے سیاسی' معاشی' سماجی اور مذہبی رجحانات کو سمجھ سکتے ہیں اس کی نشان دہی کرسکتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ کس کلچر کے تسلط میں ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا تبدیلی کا کوئی عمل ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں ہنگاموں کی نوعیت کیا ہے؟ اور کس حد تک یہ ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہورہے ہیں۔ ان کا جواب تاریخ کے ذریعہ ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

اشپینگلر اور ٹائن بی

موجودہ صدی میں اشپینگلر اور ٹائن بی نے فلسفہ تاریخ کو وسعت اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا' کیونکہ ان کے زمانہ میں تاریخ کی معلومات محدود دائرے سے نکل کر وسیع حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔ ایشیا' افریقہ' آسٹریلیا اور امریکہ کی بہت سی اقوام جو اب تک تاریخی گمنامی تھیں ان کی ثقافت اور تہذیب و تمدن کے بارے میں نئے نئے انکشافات سامنے آچکے ہیں۔ آثار قدیمہ کی دریافتوں نے قدیم تہذیبوں کے بارے میں نئے نقطہ نظر کو پیدا کیا تھا۔ مہذب و غیر مہذب ترقی یافتہ و غیر ترقی یافتہ اصطلاحات کو اب نئے انداز سے دیکھا جانے لگا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ یورپی معاشرہ سرمایہ داری کے تضادات کے بعد ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گز رہا تھا۔ جمہوریت آہستہ آہستہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے چنگل سے نکل کر عوامی سطح پر آرہی تھی۔ تعلیم کے فروغ اور سائنسی ترقی نے اب ادب موسیقی اور آرٹ کو عوام کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا۔ جاگیردارانہ اقدار ٹوٹ چکی تھیں اور ان کی جگہ سرمایہ داری نے لے لی تھی۔

یکے بعد دیگرے دو جنگوں نے یورپ کے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ فتح مند اور شکست خوردہ دونوں جنگ کے نتائج سے متاثر ہوئے اور انسانی ترقی جس سبک رفتار سے جارہی تھی وہ اچانک رک گئی اور یورپی معاشرہ اندرونی اور بیرونی خلفشار سے دوچار ہوگیا۔

یورپی معاشرہ کے ان دو پہلوؤں پر دو مورخوں نے اپنے نظریات پیش کیے۔ اشپینگلر اس یورپی معاشرہ کی بات کرتا ہے جو جاگیردارانہ سماج سے صنعتی سماج میں تبدیل ہوا اور جس نے جاگیردارانہ روایات اقدار کو روند کر ان کی جگہ صنعتی و تجارتی اقدار کو فروغ دیا اس نے اس تبدیلی کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور وہ اس اجڑتی دنیا پر نوحہ کناں ہے جس کی جڑیں قدیم اور قرون وسطی کے عہد میں تھیں اسے عہد وسطی کی بلند و بالا محصور سرد خانقاہوں اور امراء و حکمرانوں کے قلعوں اور حویلیوں میں جو ٹھنڈک اور سکون ملتا تھا وہ صنعتی دور کی دھواں دیتی' شعلہ اگلتی اور انسانوں کو بھٹیوں میں تپاتی' بے رنگ و بدصورت فیکٹریوں میں نہ تھا اس لیے وہ شہر اس کے تاجروں اس کی منڈیوں اور فیکٹریوں سے نفرت کرتا ہے کہ جنہوں نے اس کی سہانی خوبصورت' پر امن اور رومانوی دنیا کو ختم کرکے اس کے عوض میں انسانوں کی آبادیوں سے پر یہ شہر دیئے' جہاں انسانی اقدار بالکل دم توڑ دیتی

ہیں۔

اس کے مقابلہ میں ٹائن بی دو جنگوں کے پیدا ہونے والی صورت حال کا دیکھنے والا تھا جب کہ یورپ تباہی و بربادی اور آگ و خون کے سیلاب سے نکلا تھا ان دو جنگوں نے اہل یورپ کی اس تمام محنت و مشقت کو برباد کردیا گیا جو انہوں نے صدیوں میں جاکر تعمیر کیں تھیں۔

اور اہل یورپ یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ ایسی محنت کا حاصل جو جنگوں کی نظر ہوجائے کیونکہ یہ جنگیں قدیم اور عہد وسطیٰ کے زمانوں کی جنگیں نہ تھیں جو میدانوں میں لڑی جاتی تھیں نئے سائنسی ہتھیاروں نے اب جنگوں کو مہلک بنا دیا تھا اور اسی نے انسان کا اعتماد ختم کردیا اسی کے ساتھ معاشرہ کی تمام اقدار بھی متاثر ہوئیں اور اہل یورپ کو یہ احساس ہوگیا کہ ان کی تہذیب کوئی اعلیٰ ارفع تہذیب نہیں اور دوسری تہذیبوں کی طرح اس میں بھی زوال لازمی ہے۔ ٹائن بی نے ان حالات میں اپنے نظریے کو تشکیل دیا۔

اشپینگلر اپنا تاریخ کا مطالعہ اس نکتے سے شروع کرتا ہے کہ ہر کلچر کی ابتدا انسان اور زمین کے رشتوں سے ہوتی ہے۔ انسان زمین کھود کر اور کاشتکاری کے عمل سے فطرت کو تبدیل کرتا ہے وہ زمین سے کچھ لیتا نہیں بلکہ اس میں پیدا کرتا ہے اور اس عمل سے خود انسان ایک درخت بن جاتا ہے یعنی کسان اور کاشت کار کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست ہوجاتی ہیں اور وہ خود فطرت کا ایک حصہ بن جاتا ہے اس طرح انسان کی روح فطرت میں پوشیدہ ہوتی ہے وہ فطرت جو اب تک انسان کی دشمن تھی اب وہ دوست بن کر اسے زندہ رہنے کا سہارا دیتی ہے زمین کی حیثیت اس کے لیے "دھرتی ماتا" کی جگہ ہوتی ہے۔ بیج بونا' فصل کا پیدا کرنا اور پھر اسے کاٹنا' یہ انسان کے لیے زندگی کی پیدائش' شباب اور موت کی علامتیں بن جاتی ہیں اور کسان فطرت میں رچ بس کر اس میں مل جاتا ہے۔ اس کا گھر اس کے استعمال کے برتن اور پالتو جانور یہ سب زمین کا حصہ ہوجاتے ہیں۔

انسان فطرت سے اس وقت علیحدہ ہوتا ہے جب شہر بسائے جاتے ہیں۔ اس وقت وہ فطرت سے رشتہ توڑ کر اور زمین سے اپنی جڑیں نکال کر ایک شکاری کی مانند ہوجاتا ہے جو شکار کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا ہے اور جس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا ہے۔

شہروں نے انسان کی تاریخ میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ

دراصل شہروں کی تاریخ ہے اور ان لوگوں کی تاریخ ہے جو شہروں میں رہتے تھے۔ ریاست' سیاست' مذہب' آرٹ اور سائنس ان سب کا تعلق شہروں سے ہے۔ بڑے بڑے مفکرین و دانشوروں کا تعلق بھی شہروں سے رہا ہے۔ چاہے وہ دیہات میں رہائش پذیر ہوں مگر ان کی ذہنی نشوونما شہروں میں ہوئی اور اس لیے وہ شہروں کے نمائندے رہے۔

جب شہر ترقی کرتا ہے تو اس وقت اس کی روح پیدا ہوتی ہے اور یہ روح اس شہر کے ماحول سے پیدا ہوتی ہے۔ شہر اور گاؤں کا فرق اس روح کی وجہ سے ہوتا ہے۔ شہر اپنی دنیا علیحدہ سے مکمل طور پر بنا لیتا ہے۔ جب کہ گاؤں کا تعلق فطرت اور اس کے مناظر سے رہتا ہے۔ اور وہ فطرت سے کٹ کر علیحدہ اور تنہا نہیں رہ سکتا ہے۔ شہر اور گاؤں کے اس فرق کی وجہ سے گاؤں کے جولاہے اور موچی کی فکر اور سوچ میں فرق آجاتا ہے۔ جرمنی کے ایک گاؤں کا کاشتکار برلن کے شہری سے زیادہ سسلی کے کسان کے قریب ہوتا ہے۔

فطرت کا' انسان کی سوچ' عمل اور کردار پر گہرا اثر ہوا' اسی لیے ابتدائی طرز تعمیر کا تعلق فطرت کے مظاہر سے تھا۔ جیسے ڈورک طرز کے ستون' اہرام مصر اور گوتھک' چرچ' یہ درختوں کی طرح زمین سے ابھرتے ہوئے پھیلے ہوئے اور سایہ دار تھے لیکن جیسے جیسے انسان شہر میں محدود ہوتا گیا اس کا فطرت سے تعلق کمزور ہوتا گیا' آرٹ مذہب اور سائنس فطرت سے کٹ گئے۔ اور انسان زمین سے اجنبی ہوگیا۔ شہر کی دنیا چونکہ بند اور اندرونی طور پر ابھرتی اور نشوونما پاتی ہے اس لیے یہاں تخلیق ہونے والی ہر چیز بند اور گھٹن کے ماحول میں پیدا ہوتی ہے۔ شہر کی زبان بھی اسی ماحول میں پیدا ہو کر دیہات والوں کی سمجھ سے باہر ہوجاتی ہے۔ شہر آباد ہوتے ہیں' بستے اور اجڑتے رہتے ہیں۔ مگر گاؤں اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو یونان کے گاؤں اب تک قدیم یونانی طرز (HELLENIC) پر ہیں' مصری گاؤں میں اب بھی وہی قدیم زمانہ کی خوشبو ہے (موہنجوڈرو کا شہر مٹ گیا مگر اس کے قریب گاؤں اب بھی اس عہد کی یاد دلاتے ہیں) بڑے بڑے واقعات صرف شہروں کو متاثر کرتے ہیں۔ جیسے نپولین نے پیرس کو اور بسمارک نے برلن کو نیا روپ دیا مگر دیہات ان تمام واقعات سے علیحدہ رہتے ہیں اور ان کا طرز زندگی اسی حالت میں رہتا ہے۔

شہر' فطرت سے محروم ہونے کے بعد اس کی نقل اتارتے ہیں۔ جیسے فوارے' باغات' درخت' آبشار' چراگاہیں' چڑیا گھر اور تیز روشنی' یہ سب مصنوعی طریقے ہیں جن کے ذریعہ وہ فطرت کے مناظر سے محروم ہونے کے بعد ان سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

شہروں میں سب سے زیادہ اہمیت دارالحکومت کی ہوا کرتی تھی۔ جو سیاست معیشت اور ثقافت کا مرکز بن جاتا تھا۔ حکمراں اور اس کے درباری یہاں رہائش گاہیں تعمیر کرتے اور عمارات و باغات بنا کر اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے۔ امراء کی زندگی کا مرکز دارالحکومت ہوجاتا تھا۔ اس لیے سترھویں اور اٹھارویں صدی میں جب بادشاہ کسی امیر سے ناراض ہوجاتا تھا تو سزا کے طور پر اسے دیہی جاگیر میں واپس بھیج دیتا تھا۔ (طلباء کو جامعات سے نکالنے کے لیے جو لفظ استعمال ہوتا ہے اس کا مطلب ہے دیہاتی بنا دیا "RUSTICATION")

شہر میں جو طبقے آباد ہوتے تھے مثلاً" امراء اور راہب ان کی تاریخ ہوتی ہے جبکہ کسان بغیر کسی تاریخ کے ہوتے ہیں۔ کسان نے اگرچہ تاریخ کی تشکیل میں اپنا خون دیا مگر اسے تاریخ میں باعزت مقام نہیں ملا۔ تاریخ میں انقلابات آتے ہیں۔ خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ وقت بدلتا ہے مگر کسان ان تمام تبدیلیوں کی وجہ سے اس کی خارجی زندگی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ اندرونی طور پر وہ اب بھی وہی ہے جو ابتدا میں تھا۔ اس کی مذہب سے عقیدت پہلے بھی تھی جب وہ دیوتاؤں کا قائل تھا اور آج وہ اپنے نئے مذہب کو اسی عقیدت سے مانتا ہے۔

شہر میں بورژوا طبقہ جو تبدیلی لاتا ہے وہ عوام کے نام پر ہوتی ہے مگر عوام سے مراد صرف شہر کے لوگ ہوتے ہیں اس میں کسانوں اور کاشت کاروں کو شریک نہیں کیا جاتا۔ شہر کی دو علامتیں طاقت ور بن کر ابھرتی ہیں۔ پیسہ اور عقلیت' شہر میں رہنے والا کوئی زمیندار' امیر' تاجر' مومن اور مشرک نہیں رہتا' بلکہ یہ سب (COSMOPOLITAN) ہوجاتے ہیں۔ صوبائی شہروں میں رہنے والے اپنے چھوٹے شہروں کی مناسبت سے صوبائی پکارے جاتے ہیں۔

شہر ابتدائی کلچر کی پیداوار ہوتے ہیں جہاں شروع شروع میں تبادلہ کا نظام رائج ہوتا ہے پھر یہ ترقی کرتے کرتے عالمی شہر بن جاتے ہیں اور اپنے شہریوں سے خون اور روح کی قربانی طلب کرتے ہیں تاکہ وہ عظمت و شوکت حاصل کر سکیں۔ آخر میں یہ کلچر کی روح پیدا کرتے ہیں اور پھر زوال پذیر ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ آخری دور میں پیسہ کی وقعت بڑھ جاتی ہے اور آبادی پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر سیاست اپنا دوسرا مرکز تلاش کرتی ہے جیسے مدینہ کے بعد کوفہ دمشق کے بعد بغداد' بروسہ کے بعد استنبول اور فتح پور سیکری کے

بعد آگرہ و دہلی۔

جب تاجر شہروں پر قبضہ کرکے امراء کے اقتدار کو ختم کردیتے ہیں تو اس کے ساتھ کلچر کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ جیسے جنوبی امریکہ کے امراء کو شمالی امریکہ کے تاجروں نے ختم کیا۔

اشپنگلر تہذیب و تمدن کے عروج و زوال پر بحث کرتے ہوئے اس کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تہذیب و تمدن خاص حالات ہیں۔ اور خاص علاقوں میں محدود رہتی ہے اور وہیں پر ختم ہوجاتی ہے۔ اور یہ خاص علاقے اس تہذیب کی وجہ سے تاریخ میں باقی رہ جاتے ہیں۔ تہذیب کے مرنے کے بعد' معاشرہ اور قوم پر ایک سا وقت آتا ہے۔ جس میں وہ کچھ تخلیق نہیں کرتی اور اقوام عالم میں اجنبی ہو کر اپنی وقعت و حیثیت کھو دیتی ہے۔ یہ دور اس کا تاریخی گمنامی کا دور ہوتا ہے۔

ہر تہذیب اپنے بعد آرٹ' شاعری' ادب' مصوری' فلسفہ' تعمیر اور فکر چھوڑ جاتی ہے جو اگر محفوظ رہیں تو آنے والی تہذیبیں ان سے اثر قبول کرتی ہیں۔ اشپنگلر تہذیب کے زوال کو یقینی مانتا ہے۔ جیسے تقدیر کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر تہذیب اپنے پیدا ہونے سے پہلے اپنی تقدیر متعین کرلیتی ہے۔ اس کے دھارے کو بدلنا نہ صرف بزدلی ہے بلکہ حماقت بھی ہے کیونکہ طاقت ور انسان اپنی تقدیر کو تسلیم کرلیتا ہے۔

اشپنگلر کی کتاب "زوال مغرب" میں تاریخ کے اور بہت سے موضوعات پر بحث کی گئی ہے جو اپنے اسلوب' جذباتی انداز اور زبان و بیان کی خوبصورتی کی وجہ سے ذہن کو متاثر کرتی ہے اس کی کتاب میں اشپنگلر کے دو روپ ہیں۔ ایک وہ جو آمرانہ ذہن رکھتا ہے۔ جنگ کا حامی ہے' طاقت کا پجاری ہے اور طبقاتی کش مکش کا منکر' وہ زمانہ جاگیرداری کی عظمت کا ماننے والا اور صنعتی و سائنسی ترقی سے نفرت کرنے والا ہے۔ دوسرا اشپنگلر وہ ہے جو ایک مفکر اور فلسفی کے روپ میں نظر آتا ہے اور جو تاریخی واقعات اور تاریخی عمل کو فکری نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔

پہلی حیثیت میں اشپنگلر غیر جمہوری طرز فکر کا حامی ہے اور تمام انسانوں کو برابر تسلیم نہیں کرتا۔ ہر زمانہ اور ہر تمدن میں صرف اقلیت نے حکمرانی کی ہے اور یہ اقلیت امراء کی تھی۔ چاہے طرز حکومت کوئی رہا ہو۔ آمرانہ یا بادشاہت کا یا چند سری (OLIGARCHY) در پردہ ایک اقلیت حکومتی اداروں پر قابض تھی۔ لہٰذا ہر دور میں معاشرہ حکمران رعیت میں تقسیم ہوتا ہے اور یہی تقسیم اس کے نزدیک منطقی ہے۔

وہ جمہوری طرز حکومت کو مستحکم نہیں مانتا۔ ہر تمدن میں جمہوری دور ایک گزرتے ہوئے لمحہ کی مانند ہوتا ہے کیونکہ جمہوریت جاگیردارانہ روایات کو تباہ کرنا چاہتی ہے اس لیے یہ تاریخ کے سنہری دور کی دشمن ہے۔

وہ تاریخ میں عوام کے کردار کا بے حد قائل ہے کہ وہ بہرحال آمرانہ طرز حکومت کے خلاف بغاوت یا شورش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر حکومت کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ انصاف قائم کرے تاکہ معاشرہ میں امن و امان رہے۔

دوسری جانب اشپینگلر حکمراں طبقوں پر تنقید کرتے ہوئے اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ پریس ان کے ہاتھوں میں ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے نظریات عوام کے ذہنوں پر ٹھونستے ہیں۔ اس طرح عوام کی آزادانہ سوچ اور فکر ختم ہوجاتی ہے اور وہی سوچتے اور کرتے ہیں جو حکمران طبقے چاہتے ہیں اس کے نزدیک پریس جدید دنیا میں عوام کی ذہنی آزادی کو ختم کرنے میں مصروف ہے۔ پریس جس بات کو سچ کہتا ہے وہی عوام میں سچی تسلیم کرلی جاتی ہے۔ تین ہفتوں تک اگر ایک ہی بات کہی جائے تو وہ حقیقت ہوجاتی ہے۔

اشپینگلر باعمل انسان کو تاریخ کی تشکیل کرنے والا سمجھتا ہے۔ ان میں کسان' سپاہی' سیاستدان' جنرل اور تاجر سب آجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کھیتی باڑی کرتے ہیں' جنگ لڑتے ہیں' حکومت چلاتے ہیں تجارت کرتے ہیں۔ یہ باعمل لوگ ہوتے ہیں اور کتابوں کی لکیروں سے نفرت کرتے ہیں جبکہ راہب دانشور اور مفکر صرف غور و فکر کرتے ہیں اور عملی طور پر کوئی کام نہیں کرتے۔

اشپینگلر کا طرز انداز اور اسلوب رومانوی ہے اس کا تعلق دلیل سے زیادہ جذبات سے ہے وہ اپنے جوش بیان اور خوبصورت زبان کے سہارے تاریخی مثالیں دے کر قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔

اشپینگلر کی یہ پیشین گوئی کہ مغربی تہذیب انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہورہی ہے۔ اس کو پہلی جنگ عظیم نے مزید تقویت دی۔ اس موقع پر ٹائن بی نے تاریخ کے مطالعہ کے بعد ایسی راہوں کو تلاش کرنا چاہا جو مغربی تہذیب کے اس زوال کو روک سکے۔ اس کے نزدیک زوال کو اسی وقت روکا جاسکتا ہے جب ہم تاریخ میں کوئی منصوبہ تلاش کریں اور پھر اس منصوبہ میں معنی ڈھونڈیں کیونکہ معنی سمجھنے کے بعد ہی کچھ

سیکھا جاسکتا ہے اور مستقبل کی راہیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

ٹائن بی کے نزدیک خدا تاریخ بنانے والا ہے۔ لیکن خدا نے تاریخ کو کس مقصد کے لیے بنایا ہے۔ اسے انسان عقل کے ذریعہ نہیں جان سکتا۔ اس کی آگہی صرف تصوف اور وجدان کے ذریعہ ممکن ہے چونکہ خدا نے تاریخ انسانوں کے ذریعہ بنائی ہے۔ اس لیے تاریخ کو سمجھنے کے لیے انسان کا سمجھنا ضروری ہے اس کے بعد دوسرے مرحلے میں خدا کو سمجھا جاسکتا ہے۔

ٹائن بی کے مطالعہ میں نہ تو تمام تہذیبیں نئے سرے سے پیدا ہوتی ہیں اور نہ مکمل طور پر فنا ہوتی ہیں۔ آرٹ' ادب' تعمیر' مصوری اور موسیقی زندہ رہتی ہیں۔ یونانی' رومی' عربی تہذیبیں مر گئیں اب وہ کوئی چیز تخلیق نہیں کررہی ہیں مگر ان کے اثرات باقی ہیں۔ تہذیبوں کا عروج و زوال ایک نمونہ پر نہیں ہوا۔ بلکہ ہر تہذیب ایک علیحدہ عمل سے گزرتی ہے اس لیے ہر تہذیب کے عروج و زوال کے علیحدہ علیحدہ قانون ہیں۔ ایک تہذیب ابتدائی دور میں مرجاتی ہے تو دوسری دور شباب میں تو تیسری پورا وقت گزار کر۔

ٹائن بی مغربی تہذیب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس آخری عہد میں جب کہ مغربی تہذیب باہمی جھگڑوں میں مبتلا ہے۔ تخلیقی اقلیت بااقتدار ہوگئی ہے مذہب کا زوال ہورہا ہے اور سماجی و معاشرتی یک جہتی کا خاتمہ ہورہا ہے۔ صنعتی ترقی اور جمہوریت وہ دو اہم عناصر ہیں جو مغربی تہذیب کو زوال کی جانب لے جارہے ہیں۔ صنعتی ترقی مزدوروں کو انسانیت سے دور لے جارہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں یا تو انسان مشین ہوجائے گا یا بیروزگار۔ صنعتی ترقی خدا پر ایمان ختم کرکے اس جگہ دولت کو دے رہی ہے یہی صورت جمہوریت کی ہے۔ جو روحانی زوال کی جانب جارہی ہے۔ ثقافت جب عوام تک پہنچ جاتی ہے تو وہ زوال پذیر ہوجاتی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سستی کتابیں' سنسنی خیز اخبارات' اور بے ہودہ ریڈیو پروگرام عوام کے پسندیدہ ہیں۔

ٹائن بی کے نزدیک مغربی تہذیب وہ آخری تہذیب ہے جس میں الہیانی نور اور روشنی ہے اس لیے اگر یہ زوال پذیر ہوئی تو یہ انسانیت کا زوال ہوگا اس زوال کو صرف اسی صورت میں روکا جاسکتا ہے جب تخلیقی شخصیت و تخلیقی اقلیت غلطی نہیں کرے۔ مغربی تہذیب کے زوال کے سبب اس کا مذہب سے دوری ہے۔ لہٰذا اس کا علاج مذہب کے احیاء میں ہے اور اگر ہم خدا سے صدق دل سے دعا کریں۔ تو وہ ہماری آواز سنے گا اور

ہمارا زوال رک سکے گا۔ ٹائن بی تاریخ میں صرف روحانی اور الہٰی قوتوں کا قائل ہے وہ معاشی عنصر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

اشپنگلر اور ٹائن بی کے ہاں چند اہم اور بنیادی فرق ہیں۔ اشپنگلر تاریخ میں طاقت کو فیصلہ کن عنصر مانتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ میں صرف طاقتور باقی رہے گا۔ جب کہ ٹائن بی کے نزدیک تاریخ کا اخلاقی مقصد بھی ہے جو انسان کو اعلیٰ مقام تک پہنچانے میں مدد کرتا ہے اشپنگلر جنگ کو وہ اہم ذریعہ مانتا ہے جو معاشرے میں تخلیقی عمل کو تیز کرتی ہے۔ وہ تاریخ اور سیاست کو اخلاق سے بالا سمجھتا ہے۔ اس کے تمدن کا مقدر زوال پذیر ہوتا ہے جسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ٹائن بی تاریخ اور سیاست کو خدا کے قوانین کے تابع سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں تہذیب و تمدن کئی طریقوں سے ختم ہوتے ہیں۔ ایک ہی نمونہ پر نہیں۔ اس لیے کسی بھی مرحلہ پر تہذیب اپنی تقدیر بدل سکتی ہے اور زوال کو روک سکتی ہے۔

اشپنگلر اور ٹائن بی دونوں کے ہاں تاریخ کی تشکیل میں انسان کا ہاتھ نہیں۔ بلکہ تاریخی عمل کی پراسرار قوت یا خدا کے ذریعہ پورا ہورہا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں شخصیتوں پر زیادہ زور ہے۔ جو اس عمل کو جاری و ساری رکھتی ہیں۔ عوام کی اکثریت اس عمل میں محض مقلد ہے۔ اسی لیے دونوں جمہوریت اور جمہوری اقدار و روایات کے خلاف ہیں۔ ان کے ہاں عوامی شعور کا کوئی تصور نہیں۔ نہ وہ تاریخ میں طبقاتی کش مکش کے قائل ہیں اور معاشی مفادات کو تاریخی عمل میں بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ صنعتی اور سائنسی ترقی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے تضادات کا بھی ان کے ہاں کوئی حل نہیں۔ اشپنگلر کے ہاں تن بہ تقدیر ہوکر موت کا انتظار کرنا چاہیے۔ تو ٹائن بی کے ہاں خدا سے گڑا گڑا کر نجات کے لیے دعا مانگنا۔ وہ انسان کی اس اجتماعی قوت کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ جس نے نہ صرف فطرت کو تسخیر کیا بلکہ سماجی و معاشی اور سیاسی عمل میں جبروظلم کے خلاف بغاوتیں کرکے انسان کو آزاد کرایا۔ دراصل اشپنگلر جاگیرداری زمانہ کا سنہری دور سمجھتا ہے تو ٹائن بی سرمایہ دار کو تحفظ فراہم کرنا چاہتا ہے۔ دونوں عوام کے شعور اور ان کی جدوجہد سے خوفزدہ ہیں اور عوامی اقتدار دونوں کے لیے زوال کا سبب ہے اور ان کے نقطہ نظر سے یہ درست بھی ہے کہ عوامی اقتدار میں نہ تو جاگیردارانہ اقدار رہیں گی اور نہ سرمایہ دارانہ استحصال۔ اگر ایسی تہذیب کا زوال ہوجائے تو اس پر ماتم کناں ہونے کے لیے اشپنگلر اور ٹائن بی ہوں گے ورنہ یہ زوال تو انسانیت کی ترقی کی علامت ہے۔